ادب اور کثیر الثقافت سماج: پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے مسائل کی عکاسی

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار:

نازمین اشرف

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ستمبر، ۲۰۲۳

ادب اور کثیر الثقافت سماج: پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے مسائل کی عکاسی

مقالہ نگار:

نازمین اشرف

یہ مقالہ

پی۔ ایچ۔ ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ستمبر، ۲۰۲۳

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: ادب اور کثیر الثقافت سماج: پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے مسائل کی عکاسی

پیش کار: نازمین اشرف رجسٹریشن نمبر: 16Phd/Urdu/F20

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر صائمہ نذیر ______________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ______________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

میجر جنرل شاہد محمود کیانی، ہلال امتیاز ملٹری (ر) ______________

ریکٹر

تاریخ: ______________

اقرار نامہ

میں، نازمین اشرف حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے پی ایچ ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر صائمہ نذیر کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

____

نازمین اشرف

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان | **صفحہ نمبر**

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرست ابواب	iv
ABSTRACT	vii
اظہار تشکر	ix
باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	۱
الف۔ تمہید	۱
i ۔ موضوع کا تعارف	۱
ii ۔ بیان مسئلہ	۲
iii ۔ موضوع پر ما قبل تحقیق	۳
iv ۔ تحقیق کی اہمیت	۴
v ۔ تحدید	۴
vi ۔ مقاصد تحقیق	۵
vii ۔ تحقیقی سوالات	۵
viii ۔ نظری دائرہ کار	۵
ix ۔ پس منظری مطالعہ	۷

x ۔ تحقیقی طریقہ کار ۹
ب۔ اقلیتوں کے مسائل (تعارف اور بنیادی مباحث) ۱۰
ج۔ اقلیتوں کے حقوق ۱۳
ا۔ اسلام میں اقلیتوں کے حقوق کا تصور ۱۳
۲۔ پاکستان کے آئین کی روشنی میں اقلیتوں کے حقوق کا تصور ۲۴
۳۔ اقوام متحدہ کے آئین کی روشنی میں اقلیتوں کے حقوق کا تصور ۳۳
د۔ اقلیتوں کے حقوق ول کیملیکا (Will Kymlicka) کے نظریات کی روشنی میں ۴۰
حوالہ جات ۶۲
باب دوم: پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے معاشی مسائل کی عکاسی ۶۵
الف۔ مفلسی و بے بسی اور غربت کی انتہا ۶۶
ب۔ املاک پر قبضہ ۹۳
ج۔ جبری مشقت ۱۰۳
د۔ سیاسی اجارہ دار طبقہ ۱۱۲
ہ۔ تعصب کا سامنا ۱۱۸
حوالہ جات ۱۲۹
باب سوم: پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے سماجی مسائل کی عکاسی ۱۳۲
الف۔ سماجی منفی رویے ۱۳۳
ب۔ ناروا سلوک ۱۳۷
ج۔ سماج کا خوف ۱۴۲

د۔ حب الوطنی کی سزا	۱۴۶
ہ۔ طاقت وروں کے ظلم و ستم	۱۵۵
و۔ سماجی جبر کے خلاف باغیانہ رویے	۱۶۲
ز۔ اقلیتی عورت کا جنسی استحصال	۱۶۶
ک۔ اقلیتوں کی حمایت پر حوصلہ شکنی	۱۷۲
حوالہ جات	۱۷۵
باب چہارم: پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے مذہبی مسائل کی عکاسی	۱۷۹
الف۔ توہم پرستی	۱۸۰
ب۔ شناخت کا مسئلہ	۱۸۷
ج۔ نفرت انگیز گفتگو	۱۹۵
د۔ مذہبی اجارہ دار طبقہ	۲۰۱
ہ۔ عبادت گاہوں پر حملے	۲۱۱
و۔ جبری تبدیلی مذہب	۲۱۹
حوالہ جات	۲۲۹
باب پنجم: ماحصل	۲۳۲
الف۔ تحقیقی نتائج	۲۳۹
ب۔ سفارشات	۲۴۲
کتابیات	۲۴۳
ضمیمہ	

ABSTRACT

Title:

Literature and multicultural society: Reflection of Issues of Minorities in Pakistani Novels

Abstract

Literature refreshes Human Emotions and feelings all the time, bestows spiritual peace, teaches the art of live and let live at the level of love, binds in the strings of civilization, peace and huminity and strigs together all those who have different views.Novelization has distinguished significant trends in its evoluationary proess. The universality of subject matter and style has made Novel a popular genre in the realm of Urdu Literature.A Novelist does not only write a story through Novels, he also look through the cracks to open the layers of different periods, situations and problems, unravels the comelexities of social, economic and religious codes and reveals the dimensions.A revelation that destroys your prejudices and reservations and transforms a person's personaly, thinking and ideology.The prominent Novelists of Pakistani society have reflected the problems of minorities through their Novels.This dissertation/paper is devided into five chapters.The first chapter is about rights of monorites in light of charter of Madina, Pakistani Constitution and Law, United Nation's Declaration on minorities and Will Kymlicka's views on minorities.The second chapter reflects economic problems of moniritics like possession of property, forced labour, political monoply, extreme poverty and prejudice etc.The third chapter cxplains social issues faced by minorities like negative social behavior, Maltreatment, fear of society, punishment for patriotism, oppression of powerful, rebellious attitude against social oppression, sexual abuse of minorities women etc.The fourth chapter describes the religious issues of

minorities like superstitions,issues of identity, hat speech, religious monoply class, attacks on woriship place,forced conversion etc.The Fifth chapter is the conclusion.All the rights for minorities ensurd by Constitutions and Law are mere paper work,when it comes to implementation. For the said resons minorities are facing above mentioned problems. The selection of this research paper has been made by keeping in view the reflections of problems or issues of minorities. No work has been earlier on this topic either at academic and literature level.

اظہار تشکر

رب ذوالجلال کا لاکھ لاکھ شکر ہے جن کے خاص فضل و کرم نے تحقیق کے تمام مراحل میرے لیے آسان بنائے اور مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی ہمت دی۔ میں اپنی مایہ ناز نگران ڈاکٹر صائمہ نذیر کی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہوں جن کی مہربان ہستی نے قدم قدم پر میری رہنمائی و حوصلہ افزائی کی۔ ان کے دست شفقت، دل نشیں اور خوب صورت مسکراہٹ نے ہمیشہ مجھے ایک نئی ہمت عطا کی۔ ہر مشکل میں میری ہمت بندھائی اور میری مایوسی کو امید میں بدلتی رہیں۔ میرے لیے قابل فخر ہے کہ تحقیق کا یہ عمل ڈاکٹر صائمہ نذیر کی زیر نگرانی میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ محترمہ میم اللہ پاک زندگی کے ہر مقام پر آپ کو کامیاب کریں اور صحت و تندرستی عطا کریں۔ (آمین)

میں شکریہ ادا کرتی ہوں واجب الاحترام استاد محترم ڈاکٹر عابد سیال کا جن کی مخلصانہ رہنمائی نے میری تحقیق کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ میں شکریہ ادا کرتی ہوں صدر شعبہ اردو ڈاکٹر فوزیہ اسلم اور دیگر پر خلوص اساتذہ کا جن میں ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان، ڈاکٹر صوفیہ لودھی، ڈاکٹر نازیہ یونس، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر شفیق انجم جو میرے لیے خضر راہ ثابت ہوئے۔ میں قابل احترام اساتذہ ڈاکٹر عبد الکریم، ڈاکٹر الطاف حسین یوسفزئی، ڈاکٹر یوسف میر اور ڈاکٹر عاصمہ کبیر کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جن کا میرا استاد ہونا کسی نعمت سے کم نہیں۔ اپنے تمام واجب التکریم اساتذہ جنھوں نے مجھے قلم پکڑنا اور حرف لکھنا سکھایا سے لے کر پی ایچ ڈی کی سطح تک کے لیے دعا گو ہوں اور ان کی سپاس گزار ہوں جن کی بدولت میں آج اس مقام تک پہنچی۔

میں انتہائی شکر گزار ہوں اپنے والد صاحب محمد اشرف تمنا (مرحوم) کی جن کی امیدیں مجھے ایک نیا حوصلہ اور ہمت عطا کرتی ہیں اور مجھے تھکنے نہیں دیتیں۔ یہ کرب ناک دکھ زندگی بھر میرے دامن کے ساتھ لپٹا رہے گا۔ کاش! آپ اس خوشی کے موقع پر میرے ساتھ ہوتے۔ آپ کی جدائی کا غم قلم کی گرفت میں نہیں آسکتا۔ آپ کی شدید خواہش تھی کہ میرے بچے اعلیٰ زیور تعلیم سے آراستہ ہوں۔ آج میرا سر فخر سے بلند ہے کہ میں نے آپ کی دلی خواہش کو پورا کیا۔ یقیناً آپ کی روح کو خوشی ہوئی ہو گی نا بابا۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو

کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں۔ آپ کی لحد روشن اور کشادہ ہو۔ آپ کی لحد جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہو۔) (آمین)اپنی تہی دامنی کا دکھ سانس کی ڈور ٹوٹنے تک تڑپاتا رہے گا۔ دنیا کے خوش قسمت ترین ہیں وہ لوگ جن کو یہ نعمت میسر ہے۔ میں اپنی والدہ صاحبہ کی بہت شکر گزار ہوں جن کی دعاؤں اور حوصلے نے مجھے ہمت دلائی۔ اس کٹھن سفر میں میرے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف رہیں۔ جس کی وجہ سے میری تحقیق کا سلسلہ رکنے نہیں پایا۔ مما جی اللہ رب العزت آپ کا سایہ تا قیامت ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھیں۔(آمین)

میں اپنے سسر صاحب اور ساس صاحبہ کی بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے میرا بے انتہا ساتھ دیا۔ ان کی بے لوث مدد اور ساتھ میرے لیے سرمایہ حیات ہے۔ میری کئی ذمہ داریوں کو اپنے سر لے لیا۔ اللہ پاک آپ دونوں کو صحت و سلامتی والی زندگی سے نوازیں۔(آمین) میری ساس صاحبہ نے اپنی پیشہ ورانہ تدریسی مصروفیات کے باوجود میرے بچوں کی دیکھ بھال کرنے کے ساتھ ساتھ ہر ممکن حد تک میری ضروریات کا خیال رکھا اور مجھے ذہنی حوالے سے یکسو ہو کر تحقیق کا موقع فراہم کیا۔ جس کے لیے میں ان کی انتہائی ممنون ہوں۔ آپ ایک عظیم ہستی ہیں۔ میں آپ کے احسانات کا بدلہ کبھی نہیں چکا سکتی۔ میں از کی خلیل اور ایمان خلیل کی بھی سپاس گزار ہوں جنھوں نے اپنی بے حد مصروفیات کے باوجود ہر موقع پر میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔

سب سے بے مثال شخصیت اور خصوصی شکریے کے مستحق میرے شریک سفر ہیں۔ جن کی بے انتہا قربانیوں، بھرپور ساتھ اور حوصلہ افزائی نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اپنے مقالے کو تین سال کے عرصے میں مکمل کر پائی۔ ان کے تعاون کے بغیر اس منزل تک پہنچنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میری دعا ہے کہ آپ کا سایہ میرے سر پر سلامت رہے تا قیامت۔(آمین)اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے بچوں محمد عبداللہ حبیب اور محمد ابراہیم حبیب کے لیے دل سے دعا گو ہوں کہ وہ ہمیشہ منتظر آنکھوں سے میری واپسی کا انتظار کرتے رہے ہیں۔

اللہ تعالی آپ کو صحت و سلامتی والی زندگی دیں اور نیک انسان بنائیں۔ آپ دونوں ہمیشہ ہنستے اور مسکراتے رہیں کیوں کہ آپ کی مسکراہٹ میری آنکھوں کی روشنی ہے۔

میں اپنے بہن بھائیوں فرخ ندیم تمنا، عدنان اشرف، طلعت جبین، بینش ناز، نبیلہ شہزادی، اور بھابھی ندا افتخار کی بھی بے حد مشکور ہوں جن کے تعاون نے میری تحقیق میں آسانیاں پیدا کیں۔ انھوں نے اپنے قیمتی وقت سے مجھے وقت دیا اور منزل تک پہنچنے کے لیے راستے فراہم کیے۔

میں اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے فیلوز اور ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے کسی بھی حوالے سے میرا ساتھ دیا۔ بالخصوص شیما سعدیہ کی بے غرض دوستی کو میں متاع حیات سمجھتے ہوئے ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے اس تمام مرحلے میں میرا ہر ممکن ساتھ دیا۔ میں اپنی سنیئر سعدیہ کنول کی بھی سپاس گزار ہوں جنھوں نے ہمیشہ مجھے مفید مشوروں سے نوازا اور رہنمائی کی۔ آخر میں ایک بار پھر میں اللہ رب العزت کا خصوصی شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے ہر طرح کی نعمت بخشی اور اپنا خصوصی فضل و کرم کیا۔ الحمدللہ۔

نازمین اشرف

باب اول

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

i۔ موضوع کا تعارف:

موضوع مقالہ میں پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے مسائل کی عکاسی" ول کیملیکا (Will Kymlicka)" کے نظریے "کثیر الثقافت سماج میں اقلیتوں کے حقوق" کے تحت دیکھا گیا ہے۔ یہ نظریہ دراصل سماج میں اقلیتوں کو درپیش مختلف مسائل سے متعلق ہے۔ جس کے تحت سماجی حقائق کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اقلیتوں کو درپیش اہم مسائل میں ، سماج میں نفرت انگیز رویے کا سامنا، اقلیتوں کے بارے میں توہمات، مفلسی و بے بسی، املاک پر قبضہ، سماج کا خوف ، نفرت انگیز گفتگو، وغیرہ شامل ہیں۔ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے قوانین اور آئین موجود ہیں تاہم سماج میں بعض اوقات اقلیتوں کو سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اقلیتوں کو آئین و قوانین تو دیے گئے ہیں مگر عملی صورت حال مختلف ہونے کی وجہ سے ان کے مسائل کا پاکستانی اردو ناول کی روشنی میں اس مقالے میں مفصل مطالعہ کیا گیا ہے۔

ادیب کی نظر اگرچہ پوری دنیا کے معاملات و مسائل پر ہوتی ہے لیکن جس سماج میں وہ زندگی گزارتا ہے اس کی تحریروں پر اس سماج کا عکس غالب آنا فطری عمل ہے۔ ادب کے ذریعے سے قاری اپنے اردگرد کے مسائل کو اس نظر سے دیکھ پاتا ہے جیسے ادیب نے دیکھا اور پیش کیا ہوتا ہے اور قوم اور ملک سے ماورا پوری انسانی وحدت اور جمعیت سے جوڑتا ہے۔ آج انسانی زندگی کو جو مسائل درپیش ہیں ان میں اقلیتوں کے مسائل بہت اہم ہیں۔ ان مسائل کی تفہیم کی کئی سطحیں ہیں۔ ہمارے بیشتر ادبا انسانی ہمدردی کے احساس کے تحت ان مسائل پر نہ صرف غور کرتے ہیں بل کہ اس حوالے سے سماج کی بیداری کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ اردو زبان و ادب میں انسانی حیات و کائنات کے بنیادی مسائل پر ماضی میں بھی گفتگو ہوتی رہی ہے اور حال میں بھی مکالمہ جاری ہے۔ اقلیتوں کے مسائل کے متعلق بہت سے ناول لکھے گئے ہیں اور اب بھی لکھے

جارہے ہیں۔ ناقدین بھی تلاش و جستجو کی راہ پر گامزن رہتے ہیں تاکہ ان فن پاروں کو منظر عام پر لایا جاسکے جن میں اقلیتوں کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہو۔ معاشرے میں اقلیتوں کے مسائل کو ایک سدا بہار اساس کے طور پر سامنے لانا پاکستانی اردو ناول کا اہم موضوع ہے کیوں کہ اقلیتوں کے حقوق سے مکمل آگاہی نہ ہونے کی وجہ سے سماج میں ہولناک واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اسلام میں بھی اقلیتوں کے لیے باقاعدہ حقوق موجود ہیں۔ بالخصوص اقوام متحدہ کے قیام کے بعد اقلیتوں کے لیے باقاعدہ قوانین مرتب کرکے ان پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے سنجیدہ اقدامات کیے گئے ہیں۔

اقلیت عربی زبان کے لفظ "قلیل" سے ماخوذ ہے اس کا مادہ ق ل ل ہے۔اس کے معنی "تھوڑا" یا "کم" ہونا ہیں۔

اقوام متحدہ نے بھی قومی، علاقائی اور، مذہبی اقلیتوں کے نام سے خصوصی ڈیکلریشن پاس کیا ہے۔ پاکستان کے دستور ۱۹۷۳ء کے آئین کے پہلے صفحے پر واشگاف الفاظ میں اقلیتوں کے لیے دو بار Minorities کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

"اردو لغت تاریخی اصول پر" میں ثقافت کے معنی:

"کسی گروہ کے مذہب، اخلاق، علم وادب اور فنون کے ہیں۔"

اقلیتوں کو جو حقوق حاصل ہیں وہ انھیں میسر نہیں جس کی وجہ سے وہ مسائل کا شکار ہیں اگر اقلیتوں کے مسائل حل کیے جائیں تو سماج ترقی کی راہ پر گامزن ہو گا۔

ii۔ بیان مسئلہ:

اقلیتوں کو عملی طور پر سماج میں مختلف مسائل درپیش ہیں۔ اقلیتی چاہے کسی بھی مذہب، قوم یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں چاہے وہ یورپ میں ہوں یا ایشیا میں ہر جگہ اقلیتوں کو ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے سماج میں عام خواتین کے لیے بھی بے شمار مسائل موجود ہیں۔ لیکن اقلیتی خواتین کو زیادہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عیسائی جتنی بھی تعلیم حاصل کرلیں انھیں صفائی ستھرائی کا کام ہی دیا جاتا ہے۔ اقلیتوں کی عبادت گاہوں پر حملے کیے جاتے ہیں۔ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے یورپ میں بہت سے نظریات پیش کیے گئے ہیں اور مذہبی حوالے سے اسلام نے بھی اقلیتوں کے حقوق و حدود طے کیے ہیں۔ ہمارا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ سب حقوق کے ہوتے ہوئے بھی اقلیتی آج بھی ناانصافی کا شکار ہیں۔ مقالے میں پاکستانی اردو

ناول میں اقلیتوں کو پیش آنے والے مسائل کا جائزہ "ول کیملیکا(Will Kymlicka)" کے نظریے "کثیر الثقافت سماج میں اقلیتوں کے حقوق" کے تحت لیا گیا ہے۔

iii۔ موضوع پر ما قبل تحقیق:

زیر نظر موضوع میں پاکستانی اردو ناول شامل ہیں۔ ناولوں میں اقلیتوں کے مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر رسمی اور غیر رسمی کسی بھی سطح کا کوئی بھی کام تا حال سامنے نہیں آیا۔ البتہ وہ معروف ناول نگار اور ان کے وہ ناول جو منتخب کیے گئے ہیں ان کا کسی خاص تناظر میں جیسے "محمد الیاس کے ناولوں میں سماجی شعور اور عصری مسائل"، "خالد فتح محمد کے ناولوں میں انسانی استحصال کا تجزیاتی مطالعہ"، طاؤس فقط رنگ کے کرداروں کا نفسیاتی، ثقافتی اور عائلی زندگی کے تناظر میں تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"، جانگلوس اور وارث کا تقابلی مطالعہ"، "مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں ثقافتی مظاہر کا تقابلی مطالعہ" وغیرہ جیسے موضوعات پر کام کیا گیا ہے۔ میرے پیش نظر تحقیقی کام کے تحت ایسا کوئی تحقیقی و تنقیدی کام نہیں کیا گیا جس کی فہرست ما قبل تحقیق میں شامل کی جائے۔ البتہ اقلیتوں کے حوالے سے اس سے قبل جو تحقیقی کام ہوا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔

ا۔ علی عمران، پاکستانی اقلیتوں کا اردو ادب میں حصہ، ایم فل، ایف سی کالج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۲۰ء

۲۔ معین الدین عقیل، اردو زبان و ادب میں ہندوستانی عیسائیوں کی خدمات ۱۹ویں صدی تک، پی۔ ایچ۔ ڈی، کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۲۰۰۷ء

۳۔ رخشندہ گل، اردو ادب میں عیسائیوں کی خدمات، پی۔ ایچ۔ ڈی پنجاب یونیورسٹی لاہور، س ن

۴۔ پال چیک، پاکستان کے مسیحی شعراء و شاعرات، ایم فل، اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، س ن

۵۔ مطیع احمد، مرزا مسیح فطرت مسولی: حیات و خدمات، پی۔ ایچ۔ ڈی، مظفر پور یونیورسٹی، پٹنہ، س ن

٦۔ حسن الدین، اردو زبان و ادب کی ترقی میں ہندوؤں کا حصہ، پی۔ ایچ۔ ڈی، ناگ پور یونیورسٹی، دہلی۔ س ن

۷۔ حنیہ رفیق، کثیر مذہبی سماج میں مذہبی تناظرات: اردو گیت میں مسیحی تصورات کا تقابلی جائزہ، ایم فل، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

iv۔ تحقیق کی اہمیت:

اقلیتوں کے مسائل کے حوالے سے پاکستانی اردو ناول پر کام ایک منفرد تحقیق ہے۔ پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے مسائل کی عکاسی اس تحقیق کا خاصہ ہے۔ تخلیق کار اظہار کے مختلف پہلوؤں سے انسانی رویوں اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کی عکاسی کرتے ہیں اور اقلیتوں کے مسائل کی عکاسی ہمیں پاکستانی اردو ناول میں نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ پاکستانی اردو ناول میں مختلف جہات پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سطح کا کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ مگر اقلیتوں کے مسائل کی عکاسی نہیں کی گئی۔ اقلیتیں عدم تحفظ اور غیر مساوی سلوک کا سامنا کرتی ہیں۔ مذہب اور نسل کی بنیاد پر اور تعداد میں کم ہونے کی بنا پر ان سے امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ اقلیتیں خواہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتی ہوں عدم تحفظ کا شکار رہتی ہیں۔ انھیں مذہب، طرز زندگی اور ثقافت کا تحفظ حاصل نہیں ہوتا۔ ان کا شمار ملک کے معزز شہریوں میں نہیں کیا جاتا۔ کہیں رنگ، کہیں نسل، کہیں علاقے یا مذہب کے اعتبار سے اقلیتیں اکثریتوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتی ہیں۔ مذہبی تعصب، عدم رواداری، امتیازی رویے، اور اس قسم کے دیگر مسائل جن کا تعلق اقلیتوں سے ہے۔ ان مسائل کی عکاسی کرنے سے اکثریتی طبقہ اقلیتوں کے مسائل سے آگاہ ہو سکے گا۔ تاکہ انھیں تحفظ فراہم کرتے ہوئے فراخ دلانہ رویہ اپنایا جائے۔ اقلیتوں کے ساتھ باقی شہریوں کی طرح یکساں سلوک کیا جائے۔ کسی بھی ملک کی اقلیت کو اس ملک کا باقاعدہ حصہ سمجھا جا سکے۔ انھیں بنیادی انسانی حقوق سے محروم نہ رکھتے ہوئے معاشی، سماجی اور مذہبی لحاظ سے آگے بڑھنے کے مواقع دیے جائیں۔

v۔ تحدید:

اقلیتوں کے مسائل کی عکاسی کا مطالعہ پاکستانی اردو ناول میں کیا گیا ہے۔ زیر نظر موضوع کے تحت ان اقلیتوں کو شامل کیا گیا ہے۔ جن کا بیان منتخب ناولوں میں موجود ہے۔ پاکستانی سماج کے نمائندہ ناولوں کے تناظر میں ہندو اور عیسائی اقلیت شامل ہیں جب کہ یورپی سماج کے حوالے سے مسلمانوں کو اقلیت کے طور پر مطالعے کا حصہ بنایا گیا ہے۔ دیگر اقلیتوں کا بیان مقالے میں شامل نہیں کیا گیا۔ ناولوں کے سلسلے میں معروف ناول نگاروں کو منتخب کیا گیا ہے اور ان کے وہ ناول شامل تحقیق ہیں جن کا بنیادی موضوع اقلیتوں کے مسائل ہیں۔ ان معروف ناول نگاروں کے ناولوں میں شوکت صدیقی کا "جانگلوس (جلد سوم)"، مستنصر حسین تارڑ کا "راکھ"، علی اکبر ناطق کا "نولکھی کوٹھی"، محمد الیاس کا "کہر"، نیلم احمد بشیر کا "طاؤس فقط رنگ"، صفدر زیدی کا

" بھاگ بھری" اور خالد فتح محمد کا "زینہ" شامل تحقیق ہیں۔ ان ناولوں کو اقلیتوں کے مسائل کی عکاسی کے حوالے سے جانچا گیا ہے اور ان کے مسائل کو اس تحقیق کے ذریعے سامنے لایا گیا ہے۔

vii۔ مقاصد تحقیق:

تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں:

۱۔ پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کو درپیش مسائل کا "ول کیملیکا (Will Kymlicka)" کے نظریات کی روشنی کے تحت مطالعہ کرنا۔

۲۔ پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے مسائل کا جائزہ لینا۔

۳۔ پاکستانی اردو ناول میں معاشی، سماجی اور مذہبی سطح پر اقلیتوں کے مسائل کی عکاسی کا مطالعہ کرنا۔

vii۔ تحقیقی سوالات:

۱۔ پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے مسائل کے پس پردہ عوامل کون سے ہیں؟

۲۔ پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے مسائل کی نوعیتیں کیا ہیں؟ اور ان کے مسائل کے کون کون سے پہلو اجاگر ہوئے ہیں؟

۳۔ زیر مطالعہ پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے مسائل ول کیملیکا (Will Kymlicka) کے نظریے کثیر الثقافت سماج میں اقلیتوں کے حقوق سے کس حد تک ہم آہنگ ہیں؟

viii۔ نظری دائرہ کار:

پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے مسائل کی عکاسی معاشی، سماجی اور مذہبی سطح پر پیدا ہونے والے مسائل سے متعلق ہے۔ ان مسائل کی پاکستانی اردو ناول میں کس طرح عکاسی کی گئی ہے اس تحقیقی منصوبے کے تحت مطالعہ کرنے کے لیے " ول کیملیکا (Will kymlicka)" کے نظریے "کثیر الثقافت سماج میں اقلیتوں کے حقوق" کو مد نظر رکھا گیا ہے۔

اس سلسلے میں "ول کیملیکا" کی کتاب " Multicultural Citizenship: A liberal theory of minority rights "جو ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آئی کو مد نظر رکھا گیا ہے۔

اس نظریے کے اہم نکات درج ذیل ہیں۔

۱۔ اقلیتوں کو امتیازی سلوک اور جبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۲۔ اقلیتوں کو بنیادی شہری اور سیاسی حقوق نہیں دیے جاتے۔

۳۔ اقلیتیں انفرادی مساوات کے سلوک سے لطف اندوز نہیں ہو پاتیں اور نہ ہی قانونی طور پر اپنی نسلی خصوصیت کی اہمیت کے لیے سہولیات کا مطالبہ کر سکتی ہیں۔

۴۔ اقلیتوں کو مذہبی آزادی دی جانی چاہیے۔

۵۔ اقلیتی حقوق کو انسانی حقوق کے زمرے میں شامل نہیں کیا جاتا۔ پارلیمنٹ، بیوروکریسی اور عدالتوں میں ان کے حقوق کو تسلیم کیا جانا چاہیے۔

۶۔ اقلیتوں کو معاشی، مذہبی، سیاسی اور دیگر شعبہ جات میں مقننہ میں نمائندگی دی جائے۔

۷۔ جب تک اقلیتوں کو حقوق نہیں دیے جائیں گے تب تک نہ امن بحال ہو گا اور نہ ہی مسائل حل ہوں گے۔

قوموں کی سربلندی کے لیے اخوت اور صبر جیسے جذبات درکار ہوتے ہیں۔ "ول کیملیکا(will kymlicka)" کا فلسفہ اس حقیت کی عکاسی کرتا ہے کہ اقلیتوں کے مسائل کا پائیدار حل ان کے تمام حقوق کی فراہمی میں ہے۔ "ول کیملیکا" کا کہنا ہے کہ جدید سماج کے بڑھتے ہوئے کثیر الثقافتی تانے بانے نے ان تمام مسائل کو جنم دیا ہے۔ نسلی، مذہبی اور قومی اقلیتیں اپنے حقوق کا مطالبہ کرتی ہیں۔

اس ضمن میں پاکستانی اردو ناول کے مطالعے سے دیکھا ہے کہ کس طرح اقلیتوں کو حقوق حاصل ہونے کے باوجود مختلف مسائل درپیش ہیں۔ ان نکات کے پیش نظر متن کا مطالعہ کرتے ہوئے تحقیقی مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچایا گیا ہے ۔

میں نے اپنے تجزیے کی بنیاد "ول کیملیکا (Will Kymlicka)" کے پیش کردہ نظریات پر رکھی ہے۔ لہٰذا ان کی پیش کی گئی اقلیتوں کے حوالے سے حقوق کی جدوجہد کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ اس مطالعے سے پاکستانی اردو ناول میں برتے گئے اس موضوع سے متعلق حقائق سامنے آئے ہیں۔

نظری دائرہ کار کے حوالے سے بنیادی رہنمائی، تحقیقی و تنقیدی کتب جن میں جنید قیصر کی کتاب "پاکستانی اقلیتوں کا نوحہ"، محمد متین خالد کی کتاب" آزادی اظہار کے نام پر"روبینہ سہگل کی کتاب "عورت اور مزاحمت"، ڈاکٹر مظفر حسن ملک کی کتاب "ثقافتی بشریات"، سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں" ادارہ تعلیم و تحقیق، ڈاکٹر مبارک علی کی کتابیں" تاریخ اور معاشرہ"، "پاکستانی معاشرہ"، احمد سلیم کی کتاب، "پاکستان اور اقلیتیں"، ڈاکٹر صفدر محمود کی کتاب "آئین پاکستان "وغیرہ کو مد نظر رکھتے ہوئے پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔

ix۔ پس منظری مطالعہ:

زیرِ نظر تحقیق کا بنیادی مسئلہ اقلیتوں کے مسائل کی عکاسی ہے۔ اس حوالے سے درج ذیل کتب پس منظری مطالعہ کے لیے اہمیت کی حامل ہیں۔

"میثاق مدینہ" جسے دنیا کا پہلا تحریری دستور کہا جاتا ہے۔ اس سے رسول پاک ﷺ کا مقصود یہ تھا کہ ساری انسانیت امن و سلامتی کی سعادتوں اور برکتوں سے بہرہ ور ہو جائے۔ آپ ﷺ نے یہود مدینہ کے تینوں قبائل بنو قینقاع، بنو نصیر، بنو قریظ کے ساتھ ایک معاہدہ امن طے کیا۔ جس میں انھیں دین و مذہب اور جان و مال کی مطلق آزادی دی گئی تھی اور جلاوطنی، جائیداد کی ضبطی یا جھگڑے کی سیاست کا کوئی رخ اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ اس معاہدے کو میثاق مدینہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس معاہدے کی دفعات میں یہودیوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو گی، تمدنی اور ثقافتی معاملات میں یہودیوں اور مسلمانوں کا برابر کا حق ہو گا، مظلوم کی مدد کی جائے گی، مدینہ میں ہنگامہ آرائی اور کشت و خون حرام ہو گا، ہر قاتل سزا کا مستحق ہو گا، فساد کا اندیشہ ہو تو اس کا فیصلہ اللہ عزوجل اور محمد ﷺ فرمائیں گے، یہ معاہدہ کسی ظالم یا مجرم کی آڑ نہ بنے گا وغیرہ ہیں۔ میثاق مدینہ ﷺ کی سیاسی بصیرت اور حسن و تدبر کا مثالی شاہکار ہونے کے ساتھ ساتھ رواداری، امن و سلامتی، آزادی اور عدل و انصاف کے ہر جوہر سے مزین ہے۔

اقلیتوں کے متعلق قانون سازی کے سلسلے میں اقوام متحدہ (United Nations) نے ۱۸ دسمبر ۱۹۹۲ء میں ایک ڈیکلریشن (Declaration) پاس کیا جسے علاقائی، قومی اور مذہبی اقلیتوں کے ڈیکلریشن (Declaration) کا نام دیا گیا۔ یہ ڈیکلریشن (Declaration) نو آرٹیکلز (Ariticles) پر مشتمل ہے۔ اس میں اقلیتوں کے وجود کا تحفظ، شناخت کے لیے ساز گار حالات، علاقائی رسم ورواج کا تحفظ، اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنا، پبلک مقامات پر اپنی زبان کا آزادانہ استعمال، زبان اور کلچر کا فروغ وغیرہ شامل ہیں۔ اقوام متحدہ چاہتا ہے کہ قومی سطح پر پالیساں اور پروگرام بناتے ہوئے اور ان کے نفاذ کے دوران اقلیتوں کے مفاد کو پیش نظر رکھا جائے قانون کی حدود وقیود میں رہتے ہوئے۔ مغرب میں بین الاقوامی اور علاقائی قوانین بالخصوص اقوام متحدہ کا ۱۹۹۲ء کا اقلیتوں کے متعلق ڈیکلریشن ایک مسلسل اور طویل جدوجہد کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر صفدر محمود کی کتاب "آئین پاکستان ۱۹۷۳ء" بھی اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں پاکستان کے آئین کی نہایت سادہ زبان میں نہ صرف تشریح بل کہ تجزیہ بھی کیا گیا ہے اور آئین میں مختلف جگہوں پر پھیلی اور بکھری ہوئی دفعات کو اپنے اپنے متعلقہ موضوعات کے تحت یکجا کر کے آئینی اداروں کی مکمل تفصیل دی گئی ہے۔ آئین پاکستان ۱۹۷۳ء میں بھی اقلیتوں کے جو حقوق ہیں ان میں حق مذہب، مذہبی ٹیکس سے تحفظ، تعلیمی اداروں میں مذہبی تحفظات، حق جائیداد، شہریوں میں مساوات، حق زبان اور کلچر وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی کی کتاب "تاریخ اور معاشرہ" میں اقلیتوں کے مختلف مسائل پر بحث ملتی ہے۔ جس میں پاکستان میں بسنے والے ہندو اور عیسائی طبقے کے مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کے نزدیک مختلف مسائل اقلیتوں کو پسماندہ بنا کر ان کی تخلیقی و ذہنی صلاحیتوں کو ختم کر دیتے ہیں اور سماج کو ویران و بنجر بنا کر افراد کی زندگیوں کو بے معنی بنا دیتے ہیں۔ مثلاً ان کی عورتیں سب سے زیادہ بربریت کا نشانہ بنتی ہیں۔ ان کی عصمت دری کے ذریعے پوری کمیونٹی کو بے عزت کیا جاتا ہے۔ اقلیت بظاہر نہ سیاسی اور نہ ہی سماجی طور پر کسی بھی طبقہ کے لیے خطرہ ہیں۔ وہ ملازمتوں یا دوسری مراعات کے لیے کوئی مطالبہ نہیں کرتے نہ ہی صنعتی و تجارتی طور پر یہ کمیونٹی آگے ہے اور نہ تعلیمی لحاظ سے۔ اس کے برعکس ان کی اکثریت کا تعلق غریب اور کچلے ہوئے طبقے سے ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے کہ ایک ایسے نظام کی تشکیل ضروری ہے کہ جس میں فرقہ

ورانہ تعلیم کے بجائے رواداری کی تعلیم، ذہن کو نفرت سے تنگ کرنے کے بجائے وسیع تر انسانیت کے سانچے میں ڈھالا جائے۔

احمد سلیم کی کتاب "پاکستان اور اقلیتیں" بھی اس حوالے سے اہم کتاب ہے۔

x۔ تحقیقی طریقہ کار:

مطالعہ کے سلسلے میں تاریخی و دستاویزی طریقہ تحقیق اپنایا گیا ہے۔ جو استقرائی طریقہ تحقیق کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔(Library Research) اس کے پیش نظر موجود مواد کی جمع آوری اور تجزیہ اور اس کی روشنی میں نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ اس میں مواد کے تجزیے کا طریقہ کار پیش نظر رکھا گیا ہے۔ مواد کو جمع کرنے کے بعد اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ تحقیق کا مواد تحدید میں شامل پاکستانی اردو ناول ہیں۔ یہ مواد اکھٹا کرنے کا کیفیتی طریقہ تحقیق ہے۔ موضوع کے تحت "اقلیتوں کے مسائل کی عکاسی" "ول کیملیکا" (Will Kymlicka) کے نظریات کے تحت کی گئی ہے۔ جو کہ اطلاقی ہے۔ تحقیق کی بنیاد موضوع سے متعلق مصادر وماخذات پر رکھی گئی ہے۔ ثانوی ماخذ جن میں تحقیقی و تنقیدی کتب، رسائل، تحقیقی پرچہ جات اور میثاق مدینہ کا معاہدہ، اقوام متحدہ (United Nations) کا اقلیتوں کے حوالے سے خصوصی ڈیکلریشن (Declaration)، پاکستان کے آئین میں اقلیتوں کے جو حقوق ہیں ان کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے۔ آئین پاکستان کی اکیس دفعات جو تمام پاکستانیوں کو بنیادی حقوق فراہم کرتی ہیں کو مفہوم کی صورت میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اقوام متحدہ کا اقلیتوں کے حوالے سے خصوصی ڈیکلریشن جو کہ نو آرٹیکلز پر مشتمل ہے اور ول کیملیکا کے نظریات کے اہم اقتباسات کا ترجمہ کر کے مقالے کا حصہ بنایا ہے۔ لائبریریوں کے علاوہ انٹرنیٹ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے مسائل کی عکاسی کو عملی صورتوں کے تحت جانچا اور پرکھا گیا ہے۔ تاکہ اقلیتوں کے حقوق کا جو استحصال ہو رہا ہے اس کا سدباب ممکن ہو سکے۔

ب۔ اقلیتوں کا تعارف اور بنیادی مباحث

لغوی و اصطلاحی تعریف

اقلیت عربی زبان کے لفظ قلیل سے ماخوذ ہے۔ اس کا مادہ ق ل ل ہے۔ اس کا معنی تھوڑا یا کم ہونا ہے۔ قلیل کی جمع قلل ہے۔ اصطلاح میں اقلیت سے مراد کسی ملک ، ریاست یا خطے میں بسنے والے افراد کا وہ چھوٹا گروہ یا طبقہ جو رنگ، نسل، زبان، لباس، عادات و اطوار ، رسم و رواج اور مذہب کے اعتبار سے اس خطے کے بڑے گروہ سے منفرد یا الگ تھلگ ہو۔

Francesco capotorti اپنی کتاب " Study on the rights of persons belonging to enthic religious and linguistic minorities" میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> "A group numerically Inferior to the rest of the population of state, in a non dominant position,whose members begin Nationals of the state possess enthnic, religious or linguistic characteristics differing from those of the rest of the population and show, if only implietly, maintain sense of traditions, religion or language."(1)
>
> ایسا گروہ جو تعداد میں ریاست کی باقی آبادی سے کم ہو اور اثر انداز نہ ہو اور ریاست کے شہری ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی مخصوص علاقائی، مذہبی اور زبانی خصوصیات کا مالک ہو جو ریاست کی باقی آبادی سے مختلف اور مکمل طور پر اپنی الگ روایات، مذہب اور زبان کا مالک ہو۔

ایسا طبقہ جو تعداد میں ریاست کی باقی آبادی سے کم ہو اور مذہبی اعتبار سے اکثریت سے مختلف ہو۔ جس کی اپنی روایات اور رسم و رواج ہوں۔ الگ مذہبی انداز ہوں۔ اور اپنی ایک الگ اور مخصوص شناخت رکھتا ہو تو وہ کسی بھی ملک کی اقلیتیں ہوتیں ہیں۔ اور سماج میں تمام اقلیتوں کو عقیدہ، مذہب، جان و مال اور عزت و آبرو کے

تحفظ کی ضمانت حاصل ہے۔ وہ انسانی بنیاد پر بنیادی حقوق میں برابر کی شریک ہیں۔ بحیثیت انسان ان کے ساتھ کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا۔ کسی بھی ملک اور ریاست میں اقلیتوں کا تحفظ اور ان کی ثقافت کی حفاظت کرنا ریاست اور ملک کی اہم ذمہ داری ہوتی ہے۔ خواہ وہ مذہبی اقلیتیں ہوں یا لسانی اقلیتیں۔ انھیں مکمل حقوق فراہم کرنا، ہر طرح کی آزادی مہیا کرنا، اس علاقے، ملک اور ریاست کے فرائض میں شامل ہے۔ "آکسفورڈ ایڈوانس ڈکشنری" میں لفظ اقلیت کی اصطلاحی تعریف یوں ہے:

> "A small group a community or nation, differing from others In, religion, language."(۲)
>
> کسی معاشرے یا قوم میں بسنے والے افراد کا وہ چھوٹا گروہ جو نسل، مذہب اور زبان وغیرہ میں بڑے گروہ سے مختلف ہو۔

The world book Encyclopedia " میں اقلیت کی تعریف یوں کی گئی ہے:

> "People of racial, religious or cultural groups sometimes preserve their own way of life while they are living in a that is controlled by large groups." (۳)
>
> کسی علاقے میں بسنے والے افراد کا ایسا چھوٹا گروہ جو نہ صرف مذہبی، لسانی اور نسلی اعتبار سے اکثریت سے مختلف ہو بل کہ اپنے مذہب، عقائد اور نسل کی حفاظت بھی کر سکے تاکہ اکثریت ان پر غالب نہ ہو۔

اقلیتوں کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب، زبان، لباس، عادات و اطوار اور ثقافت کی حفاظت کرتے ہوئے اپنے تمدن اور رسم و رواج کو برقرار رکھیں تاکہ ان کی انفرادیت ختم نہ ہو۔ آئین و قانون ان کو اپنی ثقافت اور تہذیب زندہ رکھنے کے لیے پورا اختیار دیتا ہے۔ مذہب کی آزادی انفرادی اور شخصی آزادی کا حصہ ہے۔ اقلیتیں اپنا ایک مذہب رکھتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ آزادی کے ساتھ اس پر کاربند رہیں۔ اور مذہبی شعائر کی ادائیگی میں کوئی چیز رکاوٹ نہ بنے۔ بنیادی حقوق کا تحفظ، اقلیتوں کی عافیت و سلامتی، ان کے وقار اور احترام

کے لیے نہایت ضروری ہے۔ سماج میں اقلیتیں امن و سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ ان کی ثقافت، اقدار اور سم و رواج کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور وہ اپنی الگ اور منفرد روایات و شناخت کو بر قرار رکھیں۔" فیروز اللغات "میں اقلیت کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"ا۔ کمی یا تھوڑا ہونا

۲۔ کم تعداد

۳۔ کسی ملک میں مذہب، قومیت یا تہذیب و تمدن کے لحاظ سے کوئی خاص گروہ جس کی تعداد دوسرے گروہ سے کم ہو۔"(۴)

"اردو انسائیکلوپیڈیا" کے مطابق اقلیت کی تعریف:

"اقلیتیں (Minorities) مذہب، قومیت یا تہذیب و تمدن کے اعتبار سے وہ چھوٹے چھوٹے گروہ یا طبقے جن کی تعداد ملک میں تھوڑی ہو، اقلیت کہلاتے ہیں۔ قانون کی نظر میں یوں تو تمام لوگ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن ملازمتوں اور قانون سازی میں اگر اقلیت موثر ہو تو اسے تناسب آبادی سے زیادہ اور اکثر حالات میں زائد از استحقاق حقوق دیے جاتے ہیں۔ تاکہ ان اقلیتوں کا تحفظ ہو سکے۔ نیز اچھی حکومت اقلیتوں کے حقوق کا خاص خیال رکھتی ہے ظالم حکومت میں اقلیتوں کو نظر انداز اور پریشان کیا جاتا ہے۔"(۵)

اقلیتوں کو سماجی، معاشی اور مذہبی تمام حقوق حاصل ہیں۔ عموماً رنگ، نسل، ذات، مذہب اور قومیت کی بنیاد پر کسی کو ان کے حقوق سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔ اقلیتیں اکثریت کے ساتھ تمام حقوق میں برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ اقلیتوں کے تمام افراد کو باہمی طور پر تعاون کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مثالی سماج کے لیے ضروری ہے کہ اقلیتی افراد کے حقوق کا نہ صرف تعین کیا جائے بل کہ اس کے عملی نفاذ کے لیے بھی کوشاں رہنا چاہیے۔ جہاں قانون کا یکساں نفاذ اور احترام ہو وہاں ترقی اور خوش حالی پوری آب و تاب سے جلوہ گر نظر آتی ہے۔ جہاں اس اصول کی پامالی ہوتی ہے وہاں غلامی لوگوں کا مقدر بن جاتی ہے۔ قانون کا نفاذ اور قانون کا

احترام اعلیٰ صفات ہیں۔ یہ آفاقی صداقتوں کی طرح ہمیشہ سے روشنی کے اعلیٰ مینار ہیں۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزی سے انسانوں کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ تمام افراد کے حقوق آزادی، انصاف اور امن کی بنیاد پر ہیں۔ اور تمام حقوق بغیر کسی فرق کے یعنی نسل، رنگ، زبان اور مذہب کے سب کے لیے یکساں ہیں۔

ج۔ اقلیتوں کے حقوق

ا۔ اسلام میں اقلیتوں کے حقوق کا تصور

انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ میں اسلام کو مرکزی اور محوری مقام حاصل ہے۔ اسلامی ریاست میں بسنے والے اقلیتوں کے ساتھ معاملات کا اساسی اصول یہ ہے کہ چند متعین امور کے علاوہ انھیں مسلمانوں کے سے مساوی حقوق حاصل ہیں اور چند مستثنیات کے علاوہ ان پر مسلمانوں کی سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اسلام میں اقلیت سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلامی ریاست میں دین اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب کے ماننے والے ہوں چاہے وہ تعداد میں زیادہ ہوں پھر بھی وہ اسلامی ریاست میں اقلیت ہوں گے ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نسلی و لسانی یا عددی اقلیت کی بنا پر کسی طبقے کو اس کے آئینی حقوق سے دستبردار نہیں کرتا۔ اسلامی ریاست چوں کہ ایک نظریاتی ریاست ہوتی ہے اس لیے تعداد کی قلت یا کثرت کو بنیاد بنا کر حقوق یا ذمہ داریوں کا تعین نہیں کیا جاتا۔

اسلام نے اقلیتوں کے مذہبی، سماجی، معاشی حقوق وغیرہ کا تحفظ کیا ہے اور ان کا عملی نفاذ بھی کیا ہے۔ اسلام میں انسان کو جو حقوق حاصل ہیں وہ اللہ قادر مطلق کی طرف سے ہیں۔ جو خالق کائنات ہے اس نے انسان کی طبعی ضروریات کے عین مطابق اس کے حقوق و فرائض اس انداز سے متعین کیے ہیں جن سے سماج حقیقی امن و سکون کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ اسلامی ریاست کا قانون قرآن و سنت ہے۔ لہذا کوئی انسان بھی قرآن و سنت میں متعین حقوق کو نہ چیلنج کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی قانون ساز ادارہ ان میں ترمیم یا تخفیف کر سکتا ہے۔

اسلام نے جو حقوق انسان کو عطا کیے ہیں صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بل کہ ان حقوق کے دائرہ کار میں مسلمان اور اقلیت سب برابر ہیں۔ اسلام نے بنیادی انسانی حقوق میں مسلمانوں اور اقلیتوں میں کوئی امتیاز نہیں برتا۔

اسلامی ریاست کی بنیاد اور اقلیتوں کے حقوق

رسول پاک ﷺ کی پوری حیات طیبہ عفو در گزر، رحمت اور بے مثال مذہبی رواداری سے بھرپور ہے۔ انسانیت کے محسن اعظم اور رحمت مجسم رسول پاک ﷺ نے اسلامی ریاست کی بنیاد مدینہ میں رکھی تو مدینہ میں آباد مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کے ساتھ رہنے والے لوگوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس سے میثاق مدینہ کہتے ہیں۔ اس میثاق مدینہ میں رسول پاک ﷺ نے نہ صرف ریاست کے مسلمان شہریوں کے حقوق و مفادات کا خیال رکھا بل کہ اقلیتوں کے حقوق کو بھی تحفظ فراہم کیا۔ اقلیتوں کے لیے باقاعدہ قانونی و آئینی اقدامات وضع کیے گئے۔ کفار مکہ کی ہٹ دھرمی اور اسلام دشمنی جب حد سے بڑھ گئی تو اللہ تعالی نے تیرہ(۱۳) نبوی میں رسول پاک ﷺ اور مسلمانوں کو مکہ سے مدینہ ہجرت کی اجازت دے دی۔ رسول پاک ﷺ صحابہ کے ساتھ مدینہ تشریف لائے اور مدینے میں پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ مدینہ میں صرف مسلمان ہی نہیں رہتے تھے بل کہ یہودی اور بتوں کو پوجنے والے بھی بستے تھے۔ حضور پاک ﷺ نے یہود مدینہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو اسلام کی تاریخ میں میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہے۔

میثاق مدینہ اور اقلیتوں کے حقوق

یہ تحریر ہے حضرت محمد ﷺ کی طرف سے جو اللہ رب العزت کے نبی اور رسول ہیں۔ میثاق مدینہ کو دنیا کے پہلے تحریری دستور کا نام دیا جاتا ہے۔ دستور مدینہ کی ایک امتیازی بات یہ نظر آتی ہے کہ اسلامی سماج ایک ذمہ دار سماج ہے جہاں ہر فرد دوسرے کی بہتری کا ضامن ہوتا ہے۔ دستور مدینہ میں آنے والے خطرات سے آئینی تحفظ کی جو جھلکیاں سامنے آتی ہیں وہ اس دستور کے عطا کرنے والے کی دور اندیشی اور دور رس نگاہ کے لیے بہت بڑا اخراج تحسین ہیں۔

یہ قانونی دستاویز پہلی اسلامی ریاست کے آئین کے طور پر تحریر کی گئی۔ اس میں ریاست کے اندر بسنے والے مختلف مذاہب، عقائد اور قومیتوں کے لوگوں کو ایک امت تسلیم کیا گیا۔ اس معاہدہ کی رو سے یہود بھی امت کی تعریف میں شامل تھے۔ جس میں ہر فرد کو بلا تفریق مذہب و ملت، عقیدہ و عمل کی مکمل آزادی حاصل تھی۔ ہر قوم کو مذہبی اور معاشی حقوق حاصل تھے۔ اس دستور سے اعلی انسانی اقدار کے تحفظ میں مکمل مدد ملی۔ اس معاہدے کی دفعات میں یہودیوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو گی، تمدنی اور ثقافتی معاملات میں

یہودیوں اور مسلمانوں کا برابر کا حق ہو گا، مظلوم کی مدد کی جائے گی، مدینہ میں ہنگامہ آرائی اور کشت و خون حرام ہو گا، ہر قاتل سزا کا مستحق ہو گا، فساد کا اندیشہ ہوا تو اس کا فیصلہ اللہ رب العزت اور محمد ﷺ فرمائیں گے۔ یہ معاہدہ کسی ظالم یا جابر کی آڑ نہ بنے گا وغیرہ ہیں۔" شمیم حسین قادری سابق چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ "میثاق مدینہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"تاریخ شاید ہے کہ نسلی اور مذہبی لحاظ سے گوناگوں متضاد عناصر کے باوجود وہ لوگ اس دستور پر متحد ہو گے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے مثال بصیرت، گفت و شنید کی مہارت، ماہرانہ حکمت جنگ اور اس کے معاہدات و معاملات پوری آگہی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔"(٦)

رسول پاک ﷺ نے پہلی کثیر الثقافت ریاست کے لیے ایسا اسلامی آئین وضع کیا کہ تمام مذاہب اور اقوام کے لوگ ایک سیاسی وحدت میں مکمل آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ جس قانون سازی اور ریاست کی آج کے جدید دور میں ضرورت محسوس کی جارہی ہے اسلام نے اس کا عملی نمونہ آج سے تقریباساڑھے چودہ سو سال پہلے پیش کیا۔ جس کا اعتراف مغربی مستشرقین بھی کرتے ہیں۔" ارم سٹرانگ کیرن" نے دستور مدینہ کے بارے میں لکھاہے: اسلامی ریاست کا یہ پہلا دستور خوب صورت نمونہ تھا۔ جس میں مہاجرین مکہ، مدینہ کے انصار، یہود مدینہ اور دیگر مشرکین مکمل آزادی اور سیاسی تحفظ کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔

دستور مدینہ کے چند مزید پہلو بھی قابل توجہ ہیں۔ ایک تو اس اولین اسلامی دستور میں کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کو سپریم لا یعنی اعلی قانون تسلیم کیا گیا اور اس کا اعلان خود محمد ﷺ نے فرمایا! جدید دور کی اسلامی ریاستوں کے نقطہ نظر سے یہ بات خصوصی اہتمام کی مستحق ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے ریاست مدینہ کے قیام میں برابر کے شریک کی حیثیت سے حصہ لینے والے اقلیتوں کو مفتوح ممالک کی اقلیتوں کی طرح ذمی قرار دینے کے بجائے برابر کے شہری قرار دیا۔

علاقائی اور صوبائی خود مختاری کے ضمن میں بھی یہ بات ہماری رہنمائی کا سامان فراہم کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے ہر گروہ اور قبیلے کے رسم و رواج تک کو برقرار رکھنے کی اجازت دی اور وحدت و یکسوئی کے خلاف تصور نہ کیا۔ حالاں کہ وادی یثرب کوئی اتنا وسیع خطہ نہ تھا۔ مگر اس کے موجود بھی قبائل کی داخلی خود مختاری اور روایات کا احترام کیا گیا۔ اس میں سب کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔

ریاست کی اکائیاں جس قدر مضبوط، مطمئن اور خوش حال ہوتی ہیں ریاست بھی اسی قدر مضبوط مطمئن اور خوش حال ہوتی ہے۔ بالکل جس طرح کہ افراد اور گھرانوں کی اکائیاں سماج کی مضبوطی، اطمینان اور خوش حالی میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ میثاق مدینہ کے معاہدے کے بارے میں "ڈاکٹر محمد ثانی" یوں لکھتے ہیں:

> "یہ معاہدہ مذہبی رواداری اور فراخ دلی کی ایک مثال ہے جس پر دنیا فخر کر سکتی ہے۔ موجودہ دور کی اقوام متحدہ بھی فریقین میں اس سے بہتر اور رواداری پر مبنی معاہدہ نہ کرا سکی۔"(۷)

میثاق مدینہ چودہ صدیاں قبل اس وقت ضبط تحریر میں آیا جب کاغذ و قلم تو کجا علم و دانش بھی کہیں مقید تھے۔ تاہم حضرت محمد ﷺ کی بات کی کچھ اور ہے اقراء (پڑھ) سے وحی ربانی کا آغاز ہوا اور تخلیق کے ساتھ ساتھ لوح و قلم اور تحریر و قرطاس کی عظمت کا بھی اعلان ہوا تھا۔ تاریخ انسانی میں پہلی بار اسیر ان جنگ کو غلام بنانے کے بجائے علم کی روشنی عام کر کے پروانہ آزادی مل گیا تھا۔ رسول پاک ﷺ کا ایسے دین اور ایسی امت کے لیے ایسے میثاق کی تیاری، پھر اس کا عملی نفاذ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ میثاق آج کے دور میں مرتب ہونے والے دستور آئین کی طرح دفعات پر مشتمل نہیں مگر آغاز سے اختتام تک بنظر غائر دیکھنے سے یہ کسی جدید عصری دستور سے کم نہیں لگتا۔ اس میں دیباچہ، دفعات اور خاتمہ سب کچھ موجود ہے۔ مشرق و مغرب میں مسلم و غیر مسلم، اہل علم نے اس میثاق مدینہ کو جدید عصری انداز میں مرتب کر کے ایک دستور کے ہم پلہ قرار بھی دیا ہے۔ محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادی نے میثاق مدینہ کے متعلق" دنیا کا اولین تحریری دستور" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے اور اس سے دفعات وار پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ ایک ماڈرن ریاست کا دستور ہے۔ میثاق مدینہ حضرت محمد ﷺ کو ایک آئین دہندہ کی حیثیت سے پیش کر کے ایک ایسا امتیاز عطا کرتا ہے جو اور کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ حضرت محمد ﷺ اولین دستور دہندہ بھی ہیں جو آج تک من و عن محفوظ ہے۔ میثاق مدینہ کئی لحاظ سے اہم دستاویز ہے۔ ایک تو اس لحاظ سے کہ یہ آج سے صدیوں پہلے قائم ہونے والی ایسی ریاست کا آئین ہے جس کے باشندے عقیدہ و مذہب کے اختلاف کے باوجود اور فکری و نظریاتی تضاد کے باوصف ایک ساتھ رہنے کا عہد کرتے ہیں۔

اسلام نے ذات، نسب، رنگ، جنس، قومیت، عقیدے، زبان علاقے اور وطن کا امتیاز کیے بغیر تمام انسانوں کو سماجی، معاشی اور مذہبی مساوات کا حق دیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اسلام ہی دنیا کا

وہ واحد دین ہے جس نے تمام تر بنیادی انسانی حقوق بلا تفریق، مذہب، رنگ و نسل، قوم، ملک اور حاکم و رعایا سبھی کو عطا کیے۔ اسلام نے یہ حقوق آج سے ۱۴۰۰ سو سال پہلے ہی انسانیت کو عطا کر دیے تھے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اقلیتوں کے حقوق کا تصور

اسلام شرف انسانیت کا علم بردار دین ہے۔ اسلام میں شریعت کے مطابق اقلیتوں کے لیے جو حقوق وضع کیے گئے ہیں وہ واضح ہیں۔ ہر فرد سے حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔ اسلام میں اقلیتوں کو بھی ان تمام حقوق کا مستحق قرار دیا گیا ہے جن کا ایک مثالی سماج میں تصور کیا جا سکتا ہے۔ اسلام میں اقلیتوں کے حقوق کو کتنی زیادہ اہمیت دی گئی ہے اس کا اندازہ "رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم " کے اس فرمان مبارک سے ہوتا ہے:

> "خبردار! جس کسی نے اقلیتی فرد پر ظلم کیا اس کا حق غصب کیا یا اس کو اس کی استطاعت سے زیادہ تکلیف دی یا اس کی رضا کے بغیر اس سے کوئی چیز لی تو بروز قیامت میں اس کی طرف سے (مسلمان کے خلاف) جھگڑوں گا۔"[۸]

اسلام نے ہر شہری کی جان و مال، عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے یکساں اصول و قوانین رائج کیے ہیں۔ جس طرح ایک مسلمان شہری کی عزت و آبرو کو تحفظ حاصل ہے اسی طرح ایک اقلیت کی عزت کو بھی تحفظ حاصل ہے۔ اسلام نے سماج میں عدل و انصاف کے قیام کا حکم دیا ہے۔ ہر قسم کی تفریق و امتیاز سے منع کیا ہے تاکہ سماج میں ہر انسان امن و سکون اور احترام کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اقلیتوں کے نمایاں حقوق مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ مذہب اور عقیدے کی آزادی

قرآن و سنت کی روشنی میں اقلیتوں کو جو نمایاں حقوق حاصل ہیں ان میں مذہب اور عقیدے کی آزادی سر فہرست ہے۔ چنانچہ اقلیت کسی رکاوٹ کے بغیر بے دھڑک اپنے دین کے شعائر پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں اور یہ آزادی قرآن مجید نے انھیں دی ہے۔ اللہ رب العزت قرآن کریم میں سورۃ "البقرہ" کی آیت نمبر ۲۵۶ میں ارشاد فرماتے ہیں:

ترجمہ: "دین میں کوئی زبردستی نہیں بے شک ہدایت گمراہی سے واضح طور پر ممتاز ہو چکی ہے۔"(۹)

"دیں میں اکراہ نہیں، اور نہیں جبر کوئی

ہو چکی واضح ہے گمراہی سے اب راہ بدی

پس جو شیطان کے پنجے سے رہائی پا کر!

مانگ لیتا ہے خدا اپنے سے ایمان کی راہ"(۱۰)

قاضی عطا اللہ عطا کا یہ منفرد اعزاز عطیہ خداوندی ہے کہ انھوں نے قرآن کریم کی منظوم ترجمانی کی ہے۔ قرآن مجید کا مندرجہ بالا منظوم ترجمہ بلاشبہ ایک ادبی شاہکار ہے۔ شریعت میں صاف طور پر واضح ہے کہ اقلیتوں کو ان کے مذہب و مسلک پر برقرار رہنے کی پوری آزادی ہوگی۔ اقلیتیں اپنی عبادت گاہوں کے اندر رہ کر اپنے تمام مذہبی امور بجالا سکتی ہیں۔ دین اسلام نے دوسرے مذاہب کے معبودوں کے احترام کا حکم دیا ہے اور مسلمانوں کو واضح طور پر ہدایت کی گئی ہے کہ اقلیتوں کی عبادت کا تصور، اسلامی عبادت سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو ان کے معبودوں کو کبھی بھی برا بھلا مت کہو۔ دین اسلام نے اقلیتوں کے لیے آزاد، مذہبی اور گھٹن سے پاک سماج کا تصور پیش کیا۔ قرآن کریم میں سورۃ "الکافرون" کی آیت نمبر ۶ میں واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے:

ترجمہ: "تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔"(۱۱)

"دین تمہارا ہے تمہارے لیے گر راہ نجات

دین میرا ہے مرے واسطے پیغام حیات"(۱۲)

اسلام میں اس سے بڑی مذہب اور عقیدے کی آزادی کا حق کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن پاک میں ایک جگہ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا دین میں کوئی زبردستی نہیں تو دوسری جگہ ارشاد فرمایا تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین یعنی بغیر کسی جبر کے اقلیت اپنے الگ مذہب پر قائم رہ سکتے ہیں۔

۲۔ مساوات کا حق

حضرت محمد ﷺ نے تمام انسانوں میں مساوات پیدا کر دی اور خاندانی و طبقاتی اور مادی امتیاز بالکل ختم کر دیا۔ اسلام وہ عالمی مذہب ہے جس میں فرد کی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق حل ملتا ہے۔ قرآن و سنت کی تعلیمات انتہائی جامع سماج کا تصور پیش کرتی ہے جس میں ہر انسان کا احترام ہے۔عدل و انصاف اور مساوات قائم ہے۔ اسلام نے ہر انسان کو بنیادی انسانی حقوق دیے ہیں۔ اسلام اور قرآن و سنت ایک ایسے سماج کا تصور پیش کرتے ہیں جس میں ہر ذات کے حقوق و فرائض متعین ہیں۔ حضور پاک ﷺ اقلیتوں کے بارے میں مسلمانوں کو ہمیشہ متنبہ فرماتے تھے۔ ایک دن "رسول پاک ﷺ" نے اقلیتوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

> "جس کسی نے کسی اقلیتی فرد کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔ حالاں کہ جنت کی خوشبو چالیس برس کی مسافت تک پھیلی ہوئی ہے۔"[۱۳]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جنت سے بہت دور رکھا جائے گا۔اور اقلیت کے ناحق قتل کی سزا دنیا کے علاوہ آخرت میں بھی شدید ہوگی۔ یہ آیت اقلیتوں کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ کسی بھی سماج کے امن و استحکام کے لیے ضروری ہے کہ اس میں مساوات کا بول بالا ہو۔ اسلام کا خاصہ ہے کہ سماج کے خاص لوگوں تک مساوات محدود نہ ہو بل کہ سماج کے ہر خاص و عام کو مساوات اور عدل و انصاف میسر ہو۔ سماج کے کمزور لوگوں کا اسلام میں خاص خیال رکھا گیا ہے اور رسول پاک ﷺ کے طرز عمل اور تعلیمات میں مساوات بہت واضح ہے۔ اس آیت قرآن کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی اقلیت کو اس بنیاد پر قتل کرے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔

۳۔ نجی زندگی کا حق

اسلام میں ہر فرد کو نجی زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ انسان کا گھر نجی معاملات کا مرکز اور اس کے بال بچوں کی پناہ گاہ ہوتا ہے اور کوئی شخص بغیر اجازت اور رضامندی کے اس کے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور اس حق کو کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔ گھروں میں بغیر اجازت داخل ہونے کی صریح ممانعت آئی ہے۔

اللہ رب العزت قرآن مجید کی سورۃ "النور" کی آیت نمبر ۲۷ اور ۲۸ میں فرماتے ہیں:

ترجمہ: "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، جب کے گھر والوں کی رضا نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو۔ یہ طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے، توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے۔ پھر اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک تمہیں اجازت نہ دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ خوب جانتا ہے۔" (۱۴)

قاضی عطا اللہ عطا نے اس آیت کا منظوم ترجمہ یوں کیا ہے:

" لوگو! ایمان جو لائے ہو نہیں جایا کرو

دوسرے لوگوں کے گھر چھوڑ کے گھر اپنے کو

جب تلک دوسرے گھر والوں کی لے لو نہ رضا

اور کر لو نہ سلام ان کے گھر والے ہیں جو

یہ بہت اچھا ہے بہتر بھی ہے تم سب کے لیے

تا کہ حاصل کرو تم لوگ نصیحت اس سے

پر اگر پاؤ نہ اس گھر میں کسی شخص کو تم

تو اجازت کے بغیر اس میں نہ داخل ہو کبھی

لوٹ جانے کو اگر کہہ دیا جائے تم کو

واپس ہو جاؤ بڑی اچھی ہے بس بات یہی

خوب اللہ تعالیٰ تمہیں پہچانتا ہے

جو عمل کرتے ہو تم اللہ سبھی جانتا ہے" (۱۵)

اسلام کی تعلیمات کے مطابق اقلیت اپنی نجی زندگی، عبادات، شادی بیاہ وغیرہ سے متعلق تمام معاملات اپنے دین کی تعلیمات کے مطابق آزادانہ طور پر کر سکتے ہیں۔

۴۔ روزگار کی آزادی کا حق

اسلام میں اقلیتوں سمیت ہر فرد کو حق حاصل ہے کہ تجارت، صنعت و زراعت غرض یہ کہ جو کام بھی وہ کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ صرف ان چیزوں کے قریب نہ جائے جنھیں شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ جیسے سودی معاملات اور جائز حدود میں بھی اخلاقی قدروں کا لحاظ رکھیں۔ اپنے کام کی وجہ سے کسی دوسرے کی تجارت یا صنعت کے درپے نہ ہوں۔ یہ اسلامی شریعت میں ناجائز ہے۔ جب فرد جائز کام کرے گا تو اس کا حاصل اور ثمر اس کا حق ہو گا اس لیے یہ اس کی محنت اور پسینہ کی کمائی ہے۔ قرآن پاک کی سورۃ ا"لنجم" کی آیت نمبر ۳۹ میں ارشاد ربانی ہے:

ترجمہ: "اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے۔"[۱۶]

"کوئی بھی بوجھ اٹھائے گا نہیں دوسرے کا
بس تو انسان نے دنیا میں کمایا جو بھی
ماسوا اس کے نہیں کوئی کمائی اس کی
دیکھی جائے گی بہت جلد جو کی اس نے سعی"[۱۷]

۵۔ جان کا تحفظ اور سلامتی کا حق

اسلام اقلیتوں کے تحفظ اور سلامتی کا درس دیتا ہے۔ جان کا تحفظ اور سلامتی کا حق سے مقصود یہ ہے کہ ان کے جسموں پر تشدد اور مار پیٹ کے طور پر زیادتی نہ کی جائے۔ دین اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ قرآن پاک کی سورۃ" بنی اسرائیل" کی آیت نمبر ۳۳ میں ارشاد ربانی ہے:

ترجمہ: "جس جان کا قتل اللہ تعالی نے حرام کیا ہے اسے حق کے سوا قتل مت کرو۔"[۱۸]

"اور جس جان کو ٹھہرایا ہے اللہ نے حرام

قتل اس جان کو کرنا نہیں ناحق ناحق

اور مظلوم کی صورت میں اگر قتل جو ہو

تو ولی اس کے کو ہے ہم نے دیا اس کا حق

لازم اس پر ہے کہ وہ حد سے نہ گزرے اس پر

اس کو انصاف کے بارے میں مدد ہو گی پھر "[۱۹]

اللہ رب العزت نے جس طرح انسان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ دوسرے افراد کی محبت، محنت اور ہمدردی و تعاون سے فائدہ اٹھائے اسی طرح اس پر یہ ذمہ داری بھی عائد کی ہے کہ وہ دیگر افراد کی جان ومال اور عزت و آبرو کا خیال رکھے۔ اور اسلام اس پر جو فرائض عائد کرتا ہے انھیں خوش اسلوبی سے نبھائے۔ ایک صالح سماج کی تکمیل کے لیے اسلام فرد کو اخلاقی تعلیم کی ہدایت دیتا ہے۔ جس میں اقلیتوں کی جان کا تحفظ اور سلامتی کا حق بھی شامل ہے۔ اسلام نے مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ اقلیتوں سے نیکی، انصاف اور حسن سلوک پر مبنی رویہ اختیار کریں۔ اللہ تعالی قرآن مجید کی سورۃ" الممتحنہ "کی آیت نمبر ۸ میں ارشاد فرماتے ہے:

ترجمہ: "(اے مسلمانوں) اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ اور انصاف کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہ لڑے اور نہ انہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نکالا (بل کہ) اللہ تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتاہے۔"[۲۰]

"منع کرتا نہیں ہے اللہ تعالی تم کو

ان سے انصاف کرو خیر و بھلائی پھر تو

بارے میں دین کے جنھوں نے لڑائی نہیں کی

اور نہیں دیس نکالا بھی دیا ہے تم کو

بالیقیں راہ پہ انصاف کی جو چلتا ہے

تو خدا عادلوں کو منصفوں کو چاہتا ہے"(۲۱)

مختصر یہ کہ قرآن و سنت کی روشنی میں اقلیتوں کے حقوق میں اقتصادی اور معاشی آزادی کا حق، عبادت گاہوں کی تعمیر کا حق، تمدنی اور معاشرتی آزادی کا حق، اجتماعی کفالت میں اقلیتوں کا حق، حق سکونت، تحریر و تقریر کی آزادی وغیرہ شامل ہیں۔

پوری کائنات میں اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو اقلیتوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق احکامات خداوندی دین اسلام میں موجود نہ ہوں۔ ہادی برحق نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے مجموعے کا نام اسلام ہے۔ یہ انسان کو تہذیب نفس سکھاتا ہے اور تدبیر و عمل کا ماہر بھی بناتا ہے۔ نیز روزمرہ کے معاملات، ریاضت و عبادت، غمی، خوشی اور دیگر کئی مسائل جن سے اس کا ہمہ وقت واسطہ پڑتا ہے۔ ان سب کا ذکر قرآن و سنت میں بدرجہ اتم موجود ہے اور ہر ایک پہلو کے بارے میں واضح ہدایات دی گئی ہیں۔ معروف مستشرق "ڈبلیو منٹگری واٹ" اس کا اعتراف یوں کرتے ہیں۔

> ترجمہ: مسلمانوں کے دور اقتدار میں عیسائی، عرب مسلم حکمرانوں کے اقتدار میں بطور ذمی اپنے آپ کو یونانی بازنطینی حکمرانوں کی رعیت میں رہنے سے زیادہ محفوظ اور بہتر سمجھتے تھے۔

خالق کائنات نے اپنے تمام بندوں پر بہت سی مہربانیاں اور عنایات کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور بخششوں کا شمار بہت ہی مشکل ہے۔ لہذا ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے نافذ کردہ قوانین کا احترام کرے۔ اسلام خود غرض اور اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھنے کی مذمت کرتے ہوئے مسلمانوں کو قانون کا پابند بناتا ہے۔ ایک طرف وہ انھیں خدا ترسی اور ایثار و سخاوت کا درس دیتا ہے اور دوسری طرف آخرت کی جواب دہی کا شعور بھی پیدا کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کے بارے میں اسلام میں ہدایات موجود نہ ہوں۔ انسانی معاشرہ کی اصلاح کی یہی صورت ہے کہ اسلامی نظریہ حیات پر عمل کیا جائے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم خود بھی احکام الٰہی پر عمل کریں اور دوسروں کو بھی ان پر عمل کرنے کی ترغیب دیں۔

۲۔ پاکستان کے آئین کی روشنی میں اقلیتوں کے حقوق کا تصور

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں بنیادی حقوق سے متعلق ایسی دفعات رکھی گئی ہیں جو عوام کی ان خواہشات کی ترجمان ہیں جو برسوں سے ان کے دلوں میں پرورش پا رہی تھیں۔ ان حقوق کے سبب ایسا سماج وجود میں آسکتا ہے جو مفاہمت، سچائی، جمہوریت، سماجی انصاف، اور باہمی تعاون و معاونت پر مشتمل ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے بنیادی حقوق کسی بھی ترقی پسند دستور کی روح ہوتے ہیں۔ ان حقوق میں مساوی درجے اور مواقع سماجی و اقتصادی اور سیاسی انصاف، عقیدے، اظہار رائے، مذہب و افکار، عبادت، اجتماع اور انجمن سازی کی آزادیاں شامل ہیں۔ ۱۹۷۳ کے آئین میں شہریوں کے بنیادی حقوق کی فہرست شامل ہے۔ یہ حقوق شہریوں کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کرتے ہیں اور وہ ہر قسم کے خدشات اور خطرات سے بے نیاز ان حقوق کو استعمال کرتے ہوئے ایک خوش گوار زندگی گزارتے ہیں۔ آئین کے مطابق قائم ہونے والی عدالتیں حقوق کے تحفظ کا ذمہ لیتی ہیں اگر کوئی حق تلفی ہو تو شہری عدلیہ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور جج اسے حق حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے۔ آئین میں حقوق کا اندراج عوام کے لیے بہت حوصلہ بخش ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو ہر ظلم اور زیادتی سے محفوظ سمجھنے لگتے ہیں۔ آئین چوں کہ تمام قانون سے بالاتر ہوتا ہے اور مقننہ یا انتظامیہ کے بس میں بھی نہیں ہوتا کہ وہ آئینی حدود کو پھلانگیں اس لیے آئین میں موجود حقوق بہر طور عوام کو ملتے رہتے ہیں۔ پاکستان کے آئین ۱۹۷۳ کو زیادہ جمہوری شکل دینے کے لیے دستور ساز اسمبلی نے زیادہ سے زیادہ حقوق شہریوں کے لیے مختص کر دیے ہیں۔ دستور کی ۲۱ دفعات صرف بنیادی حقوق سے بحث کرتی ہیں یہ دفعات آٹھ سے ۲۸ تک ہیں۔

اقلیتوں کے حقوق

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دیباچہ آئین اور پالیسی وضع کرنے کے اصولوں میں اقلیتوں کے حقوق کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ اس دستور میں اقلیتوں کو مذہبی، ثقافتی اور تمدنی آزادی ہو گی۔ انھیں اپنے اظہار خیال، اظہار یقین و عقیدہ، عبادات اور اجتماع کی آزادی دی گئی ہے۔ بمطابق آئین ہر شہری قانون اور امن عامہ کے دائرے اور اخلاقیات کی حدود میں رہ کر اپنے مذہب کی پیروی کرے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ضروری اقدامات کرنے کا مجاز ہو گا۔ ہر مذہبی گروہ اپنے مذہبی اداروں کو چلانے کا حق دار ہو گا۔ کسی اقلیت کو مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ اپنے مذہب کے بجائے کسی دوسرے مذہب کی اشاعت میں رقم خرچ

کرے۔ کسی تعلیمی ادارے میں ایسی مذہبی تعلیم، تقریب یا عبادت میں کسی شخص کی شرکت ضروری نہیں ہو گی جس کا اس کے مذہب سے تعلق نہ ہو۔ ہر فرقہ اپنے اپنے مخصوص تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کا حق دار ہو گا۔ اس کے علاوہ کسی بھی فرقے کے مذہبی اداروں کو ٹیکس سے مستثنٰی قرار دینے یا ٹیکس میں رعایت دینے کے سلسلے میں کوئی تعصب روا نہ رکھا جائے گا۔ سب لوگوں کو بلا امتیاز رنگ و جنس، نسل، خوراک، لباس، مکان، تعلیم اور طبی سہولتیں فراہم کرنے کی بھرپور سعی کی جائے گی۔ آئین پاکستان اقلیتوں کو جو حقوق عطا کرتا ہے ان کا مفہوم مندرجہ ذیل ہے:

قانون کی بالادستی کا حق

آئین کے آرٹیکل آٹھ (۸) کے تحت آئین کے مخالف کوئی قانون تشکیل نہیں دیا جا سکتا۔ قانون شہری کا محافظ ہے۔ اگر قانون کی بالادستی قائم ہے تو فرد بھی محفوظ ہے۔ اس لیے شہری کا یہ حق ہے کہ ملک میں قانون کی بالادستی ہو۔ کسی بھی پاکستانی شہری کو قانون کے بغیر سزا نہیں دی جا سکے گی۔ یہی نہیں بل کہ اس کی گرفتاری بھی صرف اور صرف قانون کے تحت ہو گی۔ کسی فرد کو ایک ہی جرم کرنے پر دوبارہ سزا نہیں دی جا سکتی ہے۔

فرد کی سلامتی

آئین کے آرٹیکل نو (۹) کے تحت ہر پاکستانی شہری کو زندگی اور آزادی کا پیدائشی حق حاصل ہے۔ جسے آئین بھی تسلیم کرتا ہے۔ اور حکومت پر ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ شہریوں کی زندگی کے لیے انتظامات کرے اس غرض سے پولیس اور دوسرے محکمے موجود ہوتے ہیں۔ جو شہریوں کی جانوں کی حفاظت کے لیے رات دن مصروف رہتے ہیں۔

گرفتاری اور نظر بندی سے تحفظ

آئین کے آرٹیکل دس (۱۰) میں امتناعی نظر بندی کا اصول صرف ان شہریوں کے لیے ہو گا جو ملکی اتحاد و سلامتی اور دفاع کو نقصان پہنچانے کے مرتکب ہوں گے۔ اس آئین میں شہریوں کو گرفتاری اور حبس بے جا سے تحفظ دیا گیا ہے۔ لیکن جب کسی شخص کو حراست میں لیا جائے گا تو اس کی وجوہ بھی بتائی جائے گی۔ اس صورت میں اسے پسند کے وکیل سے مشورہ کرنے اور قانونی دفاع کرنے کا پورا حق حاصل ہو گا۔ اس آئین میں احترام ذات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بشرط یہ کہ وہ غیر ملکی آلہ کار یا ملک دشمن نہ ہو۔ اس قانون کے تحت

گرفتار شدہ افراد کو ایک ماہ سے زیادہ نظر بند نہیں رکھا جاسکتا۔ جب تک انھیں ریویو بورڈ کے سامنے پیش نہ کیا جائے اور بورڈ اس فیصلے پر نہ پہنچے کہ انھیں ایک ماہ سے زیادہ زیر حراست رکھنے کا معقول جواز موجود ہے۔ بورڈ اگر چاہے گا تو تین ماہ کے لیے حراست میں رکھنے کا فیصلہ کر سکے گا۔ اگر اس مدت کے گزرنے کے بعد بھی حراست میں رکھے جانے کی ضرورت محسوس ہو گی تو مقدمہ دوبارہ بورڈ کے سامنے آئے گا۔ جائزہ ایک چیئرمین اور دو دوسرے ارکان پر مبنی ہے۔ یہ سپریم کورٹ کے جج ہوتے ہیں اور ان کا تقرر جسٹس آف پاکستان کرتا ہے۔ گرفتاری کے پندرہ دن کے اندر اندر گرفتاری کا حکم جاری کرنے والے حکام گرفتار شدہ افراد کو ان وجوہ سے آگاہ کریں گے جن کے سبب یہ اقدام اٹھایا گیا تھا۔ متعلقہ افراد کو اپنی صفائی پیش کرنے کا حق بھی حاصل ہو گا۔ نظر بندی کے پہلے دو سالوں میں ایسے افراد کو جن پر امن خراب کرنے کا الزام ہو آٹھ ماہ سے زیادہ نظر بند نہیں رکھا جاسکتا۔ دوسری صورتوں میں نظر بندی کی معیاد بارہ ماہ ہو گی لیکن اس شق کا اطلاق ایسے افراد پر نہیں ہو گا جو غیر ملکی دشمن ہوں۔

بیگار اور غلامی سے چھٹکارا

آئین کے آرٹیکل گیارہ (۱۱) کے تحت کسی بھی شہری (خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا بڑا) سے بیگار نہیں لی جاسکتی۔ اسے مجبور کر کے بغیر معاوضہ اس سے کام لینا منع ہے۔ کسی بھی پاکستانی شہری کو خریدا یا بیچا نہیں جاسکتا اور نہ اسے غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ چودہ سال سے کم عمر بچوں سے بھی کوئی سخت مشقت نہیں لی جاسکتی۔ اس آئین کے تحت ملک میں استحصال پسند عناصر بھولے بھالے مزدوروں اور معصوم نونہالوں کو غلامی سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور نہیں کر سکیں گے۔ اگر کسی شہری کو عدالت سزا دے تو قانون کے تحت اس سے بیگار لی جاسکتی ہے۔ جیل میں بامشقت سزا کاٹنے والے قیدیوں سے جو کام لیا جاتا ہے وہ قانوناً صحیح ہے۔

گزشتہ سزا سے بچاؤ

اس آئین سے ہر پاکستانی شہری کے دل سے یہ وہم دور ہو جائے گا کہ انتظامیہ کا کوئی فرد کسی گزشتہ فعل کو جرم بنا کر اسے پریشان نہ کر سکے گا اور ماضی کے فعل کی سزا حال میں نہیں دلوائے گا۔ بشرط یہ کہ فعل ماضی میں قانون جرم نہیں تھا۔ اور دفعہ (۱) ایک یا دفعہ ۲۷۰ کی کسی بات کا اطلاق اس قانون پر نہیں ہو گا جس

کے مطابق مارچ ۱۹۵۶ کے تئیسویں دن سے اب تک پاکستان میں نافذ رہنے والے کسی دستور کی تنسیخ یا تخریب کو جرم قرار دیا جائے۔

دوہری سزا کے خلاف تحفظ

کسی بھی پاکستانی شہری کو ایک ہی جرم کے سلسلے میں ایک بار سے زیادہ سزا نہیں دی جائے گی اور کسی جرم کے سلسلے میں اس فرد کو اپنے ہی خلاف گواہی دینے پر مجبور کرنے نہیں کیا جا سکتا۔

تحفظ وقار

اس آرٹیکل کے تحت پاکستان کے ہر شہری کو وقار کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔ مگر یہ تحفظ قانون کے دائرے میں حاصل ہو گا۔ اسی طرح شہریوں کو گھریلو اور ذاتی زندگی میں بھی تحفظ حاصل ہو گا۔ شہادت (گواہی) لینے کے لیے کسی بھی فرد پر تشدد نہیں کیا جائے گا۔

آزادی نقل و حرکت

آئین کے آرٹیکل ۱۵ کے تحت پاکستان کے ہر شہری کو اجازت ہے کہ ملک کے طول و عرض میں جس جگہ جانا چاہے اور جہاں رہنا چاہے رہ سکتا ہے۔ نقل مکانی کرنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی عام اجازت ہے۔ یہی نہیں بل کہ پاکستان کا ہر شہری دنیا میں کسی بھی دوسرے ملک میں جانا چاہے تو اس امر کی اجازت ہے۔ وہ پاسپورٹ حاصل کرنے کے بعد دنیا کے کسی بھی کونے میں جا سکتا ہے۔ نقل و حرکت اور سکونت کی اس آزادی پر قومی ضروریات اور تقاضوں کے تحت کسی حد تک پابندی بھی عائد ہو سکتی ہے۔ امن عامہ کے دشمن اور ملکی یک جہتی کے رقیب لوگوں کی نقل و حرکت پر پابندی عائد کی جا سکتی ہے تا کہ کسی نقصان کا اندیشہ نہ رہے۔ اسی طرح شہری کو قومی تحفظ کی خاطر کسی علاقے یا آبادی میں وقتی طور پر نظر بند کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام بغیر عدالتی اجازت کے ممکن نہیں ہوتا۔

آزادی اجتماع

آئین کے آرٹیکل ۱۶ کے تحت تمام پاکستانی شہریوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مذہبی، معاشرتی اور سیاسی مقاصد کے لیے اجتماعات منعقد کریں۔ لیکن اسلحہ ساتھ نہ ہو۔ ظاہر ہے اگر اسلحہ لے جانے کی کھلی

اجازت ہو تو پھر شر پسند عناصر اپنا کام دکھا سکتے ہیں۔ جلسے کرنے کی پوری آزادی آئین نے دی ہے۔ تاہم اگر حکومت محسوس کرے کہ کوئی اجتماع، تحفظ اور امن عامہ کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے ایسے اجتماع پر پابندی لگائی جاسکتی ہے۔ عدالت کے حکم کے تحت شہریوں کو اجتماع سے روکا جاسکتا ہے تاکہ نقص امن کا خطرہ باقی نہ رہے۔ آئین ایسے اجتماعات کی انعقاد کی پوری اجازت دیتا ہے جو مثبت نوعیت کے قومی مقاصد کے لیے منعقد کیے جائیں۔

انجمن سازی کا حق:

اس آرٹیکل کے تحت پاکستان کا ہر شہری اپنے مشترکہ مفادات کی خاطر جماعت سازی اور انجمن بنا سکتا ہے۔ ان کی نوعیت سیاسی و مذہبی، معاشرتی، تفریحی، فلاحی یا پیشہ ورانہ ہو سکتی ہے۔ خصوصا سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے جماعتیں بنانے کا حق شہریوں کو حاصل ہے اور وہ اپنی جماعتوں کو منظم کرنے اور موثر بنانے کے لیے چندہ بھی وصول کر سکتے ہیں۔ اس حق سے ہر شہری فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جن میں ملک دشمن لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر ملک دشمن، چور وغیرہ انجمن سازی شروع کر دیں تو سماج کے حصے میں سوائے نقصان کے کچھ اور نہیں آئے گا اس لیے انجمن سازی مشروط کر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جماعت سازی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں سرکاری ملازم شریک نہیں ہوں گے۔ سرکاری ملازم کسی فرد کے نہیں بل کہ ملک کے ملازم ہوتے ہیں۔ اگر سرکاری ملازم بھی جماعت سازی کے میدان میں کود پڑیں تو پھر دفاتر بھی سیاست کا اکھاڑا بن جائیں گے۔

حق معاش، تجارت اور کاروبار کی آزادی

آرٹیکل ۱۸ کے تحت ہر پاکستانی شہری کے معاشی حقوق کو تحفظ حاصل ہے۔ ہر شخص کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ آزادی سے جو پیشہ چاہے اختیار کرے لیکن یہ چیز مشروط ہے اور ہونی بھی چاہیے کہ ہر شخص ہر پیشہ اختیار کرنے کی خواہش تو رکھ لیتا ہے لیکن اس میں اس پیشہ کے لیے درکار صلاحیت بھی ہونی چاہیے۔

آزادی تحریر و تقریر

آرٹیکل ۱۹ کے تحت پاکستان کے ہر شہری کو حق تحریر و تقریر حاصل ہے۔ پاکستان میں رہنے والے ہر شہری کو اپنے خیالات کے اظہار کا جمہوری حق حاصل ہے۔ وہ تحریر و تقریر کا سہارا لے کر اپنے احساسات

دوسروں تک پہنچا سکتا ہے۔اس حق سے ہر پر امن شہری فائدہ حاصل کر سکتا ہے لیکن جائز اور معقول حد تک۔ اس آرٹیکل کے تحت ہر شہری اجلاس منعقد کر کے ، تقریر کر کے یا کتاب ،اخبار اور رسالے میں اپنی تحریر کے ذریعے اظہار کر سکتا ہے۔ ایسا کرنے کی اسے اجازت ہے۔ یہ جمہوری قدروں کو پروان چڑھانے کے لیے ضروری حق سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان میں ملکی سلامتی اور مذہبی احساسات کا دھیان رکھتے ہوئے کوئی فرد جو بات کہنا چاہے کہہ سکتا ہے۔ وہ کسی کی دل آزاری نہیں کر سکتا اور اس کا مقصد لوگوں کو جرم کرنے کے لیے بھڑکانا نہ ہو۔ اور نہ وطن کے مفاد کے منافی کوئی بات کہہ سکتا ہے۔ یہ آرٹیکل آزادی تحریر و تقریر کی اجازت دیتا ہے لیکن اس حق کو قانونی حدود میں رہ کر استعمال کرنا ہو گا تاکہ اسلام کی شان و شوکت اور اخلاقی اقدار بھی متاثر نہ ہوں۔

مذہب کی پیروی اور مذہبی اداروں کے انتظام کی آزادی

اس آئین کے تحت ہر پاکستانی شہری کو مذہبی حقوق حاصل ہیں۔ اس حق سے اقلیتوں کو خصوصی تحفظ ملے گا اور اکثریتی طبقہ اپنے مذہب کو زبردستی اقلیتوں پر مسلط نہیں کر سکے گا۔ پاکستان کا ہر شہری پوری مذہبی آزادی رکھتا ہے۔ جس سے مراد اپنے مذہب کی تبلیغ کی آزادی، مذہب کے مطابق عبادت کی آزادی اور اپنے مذہبی اداروں کی قیام کی آزادی ہے۔ مذہب کی تبلیغ کے لیے شہری تحریر و تقریر کا سہارا لے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کتابچوں، پمفلٹوں اور اشتہارات کے ذریعے بھی اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکتے ہیں لیکن امن عامہ اور اخلاقی اقدار کے دائرے میں رہ کر۔

کسی خاص مذہب کی اغراض کے لیے محصول لگانے سے تحفظ

آئین کے آرٹیکل ۲۱ کے تحت پاکستان اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی بھی شہری اپنے حقوق کو اس طرح استعمال کرئے جس سے دوسرے شہریوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی بھی شہری کو کسی ایسے مذہب کی تبلیغ کے لیے چندہ دینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا جو اس کا مذہب نہ ہو اور نہ ہی ملک میں کوئی ایسا ٹیکس نافذ کیا جا سکتا ہے جس سے حاصل شدہ رقم کسی مخصوص مذہب کی تبلیغ پر خرچ ہو۔

مذہب وغیرہ کے بارے میں تعلیمی اداروں سے متعلق تحفظات

کسی بھی پاکستانی شہری کو آرٹیکل ۲۲ کی رو سے کسی تعلیمی ادارے میں ایسی مذہبی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا جو اس کے اپنے مذہب کی نہ ہو۔ اسے ایسے مذہبی اصول اپنانے پر مجبور نہیں کی جاسکتا جس سے متعلق اسے یقین ہو کہ اس کا اپنا نہیں ہے۔ ٹیکسوں میں چھوٹ یا رعایت دینے کے معاملے میں کسی مذہب کے ماننے والوں کے مذہبی اداروں سے امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔ کسی مذہبی برادری کو مکمل طور پر اپنے فرقے کی طرف سے چلائے جانے والے تعلیمی اداروں میں اپنے طلبہ کو اپنی مذہبی تعلیم دینے کے حق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ کسی بھی شہری کو نسل، مذہب، ذات اور جائے پیدائش کی بنا پر ایسے تعلیمی ادارے میں داخلہ دینے سے انکار نہیں کیا جائے گا جو سرکاری خزانے سے مالی اعانت حاصل کر رہا ہو۔ لیکن یہ آرٹیکل سرکاری حکام کے ان اقدامات پر اثر انداز نہیں ہو گا جو پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لیے اٹھائے جائیں گے۔

حق جائیداد

آرٹیکل ۲۳ کی رو سے کسی بھی پاکستانی شہری کو اس کی قانونی جائیداد سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان کے ہر شہری کو پاکستان کے ہر حصے میں جائیداد فروخت کرنے یا اپنے پاس رکھنے کا پورا حق ہے۔

حق جائیداد کا تحفظ

آرٹیکل ۲۴ کے تحت کسی شخص کو اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی حکومت کسی فرد کی جائیداد پر قبضہ کرے گی سوائے اس کہ ایسا قانون کے مطابق ہو۔ جائیداد کا قانونی انداز میں حاصل کیا جانا ضروری ہے۔ جائیداد کے سلسلے میں ۱۹۷۳ کے آئین میں درج ہے کہ اگر حکومت کسی قومی ضرورت کے لیے چاہے تو کسی فرد کی جائیداد کو اس کی شخصی ملکیت سے نکال کر قومی ملکیت میں لے سکتی ہے۔ ضروری ہے کہ قومیائی گئی جائیداد کا مناسب معاوضہ شہری کو دیا جائے گا۔ قانون کی باقاعدہ اجازت کے بغیر کسی شہری کو اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے قوانین جن کا مقصد ایسی عمارتوں کو قبضے میں لینا ہو جن سے انسانی زندگی، جائیداد یا صحت عامہ کو خطرہ لاحق ہو، یا ایسی جائیداد جو غیر قانونی طریقے سے حاصل کی گئی ہو، یا ایسی جائیداد جو دشمن کی ملکیت یا متروکہ جائیداد ہو، یا ایسی جائیداد جسے حکومت مخصوص عرصے کے لیے عوامی مفاد

کے پیش نظر یا انتظام کو صحیح خطوط پر چلانے کے لیے حاصل کرے۔ ایسی جائید اد جسے تعلیمی یا طبی سہولیات کے لیے لیا جائے، یا ایسی جائید اد جسے عوام کو سڑکوں، آب رسانی، گندے پانی کے نکاس کے نظام، گیس اور بجلی جیسی عوامی سہولتوں کی فراہمی کے لیے حاصل کیا جائے۔ یا جسے بے روزگاری، بیماری، ناتوانی یا بڑھاپے کے باعث اپنی کفالت نہ کر سکنے والے فراد کے لیے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ قانون کے تحت کسی فرد کی جائید اد کے معاوضہ کے زیادہ یا کم ہونے کو کسی عدالت میں زیر بحث نہیں لایا جائے گا۔

شہریوں سے مساوات

آئین کے آرٹیکل ۲۵ کی رو سے پاکستان کے تمام شہری قانون کی نگاہ میں یکساں ہیں۔ پاکستان کا آئین تمام شہریوں کو مساوی سمجھتا ہے۔ کسی سے کسی بھی قسم کی تفریق یا امتیاز روا نہیں رکھے گا۔ سب کو یکساں قانونی تحفظ حاصل ہو گا۔ اس آرٹیکل میں جنسی امتیاز بھی ختم کر دیا ہے اور عورتوں، مردوں کو بحیثیت شہری یکساں درجہ دیا گیا ہے۔ تمام شہری ملک کے سیاسی اور شہری حقوق سے برابر مستفید ہو سکتے ہیں۔ مساوات کا تصور سیاسی، مذہبی، معاشی، اور معاشرتی غرض یہ کہ ہر پہلو میں موجود ہے۔ خواتین اور بچوں کے حقوق کا تحفظ بھی قابل قدر ہے۔ اس آرٹیکل کا اطلاق ایسے اقدامات پر نہیں ہو گا جو عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لیے اٹھائے جائیں گے۔ حکومت پانچ سے سولہ سال کی عمر کے تمام بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرے گی۔

عام مقامات میں داخلہ سے متعلق عدم امتیاز

آرٹیکل ۲۶ کے تحت ہر وہ شخص چاہے وہ اکثریت میں سے ہے یا اقلیت میں سے تفریحی مقامات تک اسے رسائی کا حق حاصل ہے۔ اس سلسلے میں نسل، مذہب جنس، سکونت کی بنا پر کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا۔ ہر پاکستانی شہری ذات پات سے بلا امتیاز تفریح کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بات ریاست کو خواتین اور بچوں کے لیے خصوصی انتظامات کرنے سے نہیں روک سکے گی۔

ملازمتوں میں امتیاز کے خلاف تحفظ

اس آرٹیکل کی رو سے پاکستان کے کسی بھی شہری کے ساتھ ملازمت کے سلسلے میں نسل، مذہب، ذات، جنس، رہائش اور جائے پیدائش کے حوالے سے امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا۔ تاہم آغاز کے دن سے لے کر زیادہ سے

زیادہ چالیس سال کے عرصے تک کے لیے سرکاری ملازمتوں میں مناسب نمائندگی کی غرض سے کسی طبقے کے علاقے کے لوگوں کے لیے آسامیاں مخصوص کی جاسکتی ہیں۔ یعنی کہ پسماندہ علاقوں کے لیے کچھ کوٹا مقرر کیا جائے گا تاکہ ان لوگوں کو بھی پاکستان کی ملازمت میں مناسب نمائندگی مل سکے۔ اسی طرح ملازمت کی نوعیت کے لحاظ سے بھی کسی صنف پر پابندی لگائی جاسکتی ہے۔ اگر خدشہ ہو کہ وہ فرائض احسن طریقے سے انجام نہیں دے سکتے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی رکھی گئی ہے کہ اگر پاکستان کی ملازمت میں کسی طبقے یا علاقے کی کم نمائندگی ہوئی تو اس کا بھی ازالہ کیا جائے گا۔ البتہ صوبائی حکومتوں یا لوکل اتھارٹی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی ماتحت آسامیوں کے لیے رہائش سے متعلق پابندی لگا سکتے ہیں لیکن وہ بھی صرف تین سالوں سے زیادہ نہیں ہوگی۔

حق زبان اور ثقافت

آرٹیکل ۲۸ کے تحت ہر پاکستانی شہری کو اپنی مخصوص زبان، رسم الخط اور ثقافت کی حفاظت اور ترویج کا مکمل حق حاصل ہے۔ تاکہ وہ اپنی تہذیب و ثقافت کے مطابق زندگی گزارے۔ انھیں ترقی دینے کے لیے کوشاں رہے اور اپنے علاقائی ادب اور ثقافت کو ترقی دے سکے۔ اس مقصد کے لیے قانون کے مطابق ادارے بھی قائم کیے جاسکتے ہیں۔ اس حق سے ہر صوبہ، ہر اقلیت اور ہر فرد کو اپنی ثقافت، زبان اور تحریر کے تحفظ کا حق مل گیا ہے۔ جس کی وجہ سے زبان، تحریر اور ثقافت کے امکانات روشن ہوگئے ہیں۔

مندرجہ بالا تمام حقوق پاکستان کے آئین میں نافذ ہیں۔ جس کی وجہ سے اقلیتوں کو بھی اطمینان نصیب ہو سکتا ہے اگر یہ تمام حقوق اقلیتوں کو عملی طور پر بھی حاصل ہوں۔ آئین اور قانون تو موجود ہیں مگر ان پر عمل نہیں کیا جاتا جس کی وجہ سے پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کو مسائل کا سامنا ہے۔ انھیں بنیادی حقوق اس لیے کہا جاتا ہے کہ ریاست کا کوئی بھی ادارہ یا فرد خواہ وہ انتظامی ہو یا قانون ساز ان کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ یہ رنگ، نسل، علاقے، زبان، مذہب اور دوسرے تمام امتیازات سے بالاتر ہیں اور انسان کو محض انسان ہونے کی بناپر حاصل ہیں۔

۳۔ اقوام متحدہ کے آئین کی روشنی میں اقلیتوں کے حقوق کا تصور

اقوام متحدہ: United Nation

دوسری جنگ عظیم کے دوران ہی جنگ روکنے اور امن قائم کرنے کے لیے صدائیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ بالآخر امریکی صدر فرینکلن ڈی روز ویلٹ اور برطانیہ کے وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے بحر اوقیانوس میں ایک جہاز پر ملاقات کی۔ بین الاقوامی اتحاد، امن اور حقوق انسانی کی خواہشات کا تبادلہ خیال ہوا۔ اس طرح عالم اقوام کو پائیدار امن فراہم کرنے، جنگ کو روکنے، آئندہ جنگ سے محفوظ رہنے، جنگ کی تباہیوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایک معاہدہ تشکیل پایا گیا۔ جسے منشور اوقیانوس (Atlantic charter) کہا گیا۔ اس کے بعد کئی کانفرنسیں ہوئیں اور پھر سان فرانسکو کانفرنس (San Francisco Conference) میں کافی سوچ بچار کے بعد اقوام متحدہ کا منشور منظور ہوا اور پھر ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اقوام متحدہ کی توثیق کر دی گئی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ نے باقاعدہ طور پر دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے کام کیا اور انسانی زندگی واملاک اور آزادی کے تحفظ کے لیے کام شروع کیا۔

اقوام متحدہ کے تحت کئی ادارے قائم ہوئے جو رکن ممالک میں سرگرم عمل ہیں۔

اقوام متحدہ کے مندرجہ ذیل ادارے ہیں:

جنرل اسمبلی General Assembly

حفاظتی کونسل Security Council

معاشی اور معاشرتی کونسل Social and economic Council

تولیتی کونسل Trusteeship council

بین الاقوامی عدالت انصاف International Court of trustee

سیکرٹریٹ Secretariat

مندرجہ بالا اداروں کے علاوہ اقوام متحدہ کے چند مخصوص ادارے بھی ہیں مثلاً

بین الاقوامی تنظیم محنت ILO

اقوام متحدہ کا ادارہ خوراک FAO

اقوام متحدہ کا سائنسی و ثقافتی اور تعلیمی ادارہ UNESCO

بین الاقوامی ادارہ فضائیہ ICA

بین الاقوامی بینک برائے تعمیر و ترقی IBRD

بین الاقوامی مالی فنڈ IMF

عالمی ادارہ صحت WHO

ڈاک کی عالمی انجمن UPU

بین الاقوامی ادارہ موصلات ITO

عالمی ادارہ موسمیات WMO

منشور انسانی حقوق: Universal Declaration of Human Rights

اقوام متحدہ نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ کو منشور انسانی حقوق جاری کیا جس میں تمام رکن ممالک کو پابند کیا گیا کہ وہ اپنے اپنے ملک میں اپنے اپنے دستور اور ملکی قوانین اس چارٹر کی روشنی میں مرتب کریں تاکہ انسانی حقوق کو تحفظ فراہم کیا جاسکے۔ منشور انسانی حقوق کے چند اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ تمام اقوام عالم کو جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کرنا۔

۲۔ بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ، انسانی عزت نفس کا تحفظ۔

۴۔ عورت و مرد کے مادی حقوق اور چھوٹی موٹی قوموں میں برابری۔

۵۔ ایسی صورت پیدا کرنا جس سے عدل قائم ہو سکے اور عالمی معاہدوں کا احترام ہو۔

۶۔ سماجی ترقی اور بہتر معیار زندگی کے حصول کے لیے کوشش۔

۶۔ رواداری پیدا کرنا اور ایک دوسرے کے ساتھ امن سے رہنا۔

۷۔ متحد طاقت و اتفاق سے پوری دنیا میں امن قائم رکھنا اور یک جہتی کے لیے تمام اقوام کا اکٹھا ہونا۔

۸۔ مندرجہ بالا اصولوں اور اداروں کے طریقہ کار پر عمل پیرا ہو کر عسکری طاقت کا استعمال نہ کرنا ماسوائے مشترکہ مفاد کے۔

۹۔ تمام اقوام عالم کی معاشی و معاشرتی ترقی کے لیے بین الاقوامی وسائل کا استعمال۔

۱۰۔ سماجی ترقی کا فروغ وغیرہ۔

قومی، علاقائی، مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے حقوق کا منشور

اقلیتوں کے متعلق قانون سازی کے سلسلے میں اقوام متحدہ نے ۱۸ دسمبر ۱۹۹۲ میں ایک منشور پاس کیا جسے قومی، علاقائی، مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے حقوق کے منشور کا نام دیا گیا۔ یہ منشور نو آرٹیکلز پر مشتمل ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

آرٹیکل ۱۔:

تمام ریاستیں اقلیتوں کے وجود کے تحفظ کو یقینی بنائیں گی اور ان کی اخلاقی، قومی، ثقافتی، مذہبی اور زبانی شناختوں کو ان کے متعلقہ علاقائی رسم و رواج کے مطابق تحفظ دیں گی اور ان کی شناخت کے لیے حالات کو سازگار بنائیں گی۔

ریاستیں اس انداز میں قانون سازی اور دیگر اقدامات کریں گی کہ یہ مقاصد حاصل ہو سکیں۔

اقوام متحدہ نے تمام رکن ممالک کو ایسی قانون سازی اور اقدامات کرنے کو کہا ہے کہ جس سے اقلیتوں کو جان و مال کا تحفظ حاصل ہو اور ان کو اخلاقی، قومی، ثقافتی، مذہبی اور زبانی شناخت مکمل طور پر مل سکے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کے علاقوں میں ان کی جو مخصوص رسوم ہیں ان کا بھی خیال رکھا جائے۔

یعنی کہ بحیثیت انسان سب محترم و برابر ہیں۔اور شناخت فطری ہے اور اسے الگ پہچان کا ذریعہ رہنے دینا چاہیے۔

آرٹیکل ۲۔:

ایسے افراد جو قومی و علاقائی، مذہبی اور زبانی اقلیتوں سے تعلق رکھتے ہیں ان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق عملی زندگی گزار سکتے ہیں اور آزادانہ طور پر ذاتی زندگی میں اور عوامی مقامات پر اپنی زبان کا استعمال کر سکتے ہیں بغیر کسی مداخلت اور امتیازی سلوک کے۔

اس آرٹیکل کے مطابق وہ تمام افراد جو قومی، علاقائی، مذہبی اور زبانی اقلیت ہیں ان کو مکمل طور پر حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کریں یعنی کہ وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنی عبادات کو عملی طور پر کر سکتے ہیں اور ان کی عبادت میں کوئی بھی شخص خلل یا رکاوٹ نہیں ڈال سکتا اور نہ ہی ان کو اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے سے روک سکتا ہے۔کیوں کہ ہر شخص کو ضمیر کی آزادی اور اپنے مذہب کے مطابق پرستش و عبادت کا حق حاصل ہے۔ہر شخص اپنے عقیدے کے مطابق آزادانہ زندگی گزار سکتا ہے۔اور اس کے ساتھ ساتھ ہر شہری عوامی مقامات پر اپنی زبان میں بات چیت کر سکتا ہے۔

آرٹیکل ۳۔:

اقلیتی طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے حقوق استعمال کر سکتے ہیں ان حقوق سمیت جو منشور میں ان کو دیے گئے ہیں ذاتی طور پر بھی اور کمیونٹی میں اپنے گروہ کے دوسرے افراد کے ساتھ بھی بغیر کسی امتیازی سلوک کے۔

۲۔ اقلیتی طبقے کے ساتھ تعلق رکھنے والے افراد کو اس منشور میں دیے جانے والے حقوق کے استعمال کرنے یا نہ کرنے پر کسی نقصان کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

اس منشور میں اقوام متحدہ کا کہنا ہے کہ وہ تمام لوگ جو اقلیتی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ تمام حقوق جو انھیں اس منشور میں دیے گئے ہیں وہ انفرادی طور پر بھی استعمال کر سکتے ہیں اور اجتماعی طور پر بھی۔اور ان حقوق کو استعمال کرنے سے ان کے ساتھ کوئی امتیازی یا ناروا سلوک نہیں کرے گا۔اور اقلیتوں کو دیے گئے

حقوق استعمال کرنے سے کسی بھی دوسرے شہری کو کوئی نقصان نہیں ہو گا۔لہٰذا اقلیتوں کو دیے گئے تمام حقوق کا وہ آزادانہ استعمال کر سکتے ہیں۔

آرٹیکل ۴۔:

۱۔ریاستیں جہاں ضروری ہو گا ایسے اقدامات کریں گی تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ اقلیتی گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے تمام انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں سے لطف اندوز ہو سکیں بغیر کسی امتیازی سلوک کے اور قانون کی نظر میں برابری کی سطح پر۔

۲۔ریاستیں تعلیم کے میدان میں بھی اہم اقدامات کریں گی تاکہ ان کے علاقے میں موجود اقلیتوں کی تاریخی روایات،زبان اور ثقافت کے علم کو فروغ ملے۔

۳۔ریاستوں کو چاہیے کہ مناسب اقدامات کریں تاکہ اقلیتی گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے ملک کی معاشی ترقی اور خوش حالی میں بھرپور حصہ لے سکیں۔

منشور نمبر چار میں اقوام متحدہ نے تین خاص حقوق پر زور دیا ہے۔ان میں سے ایک ہے تعلیم کا حق۔ اس منشور میں تمام رکن ریاستوں کو اس بات پر پابند کیا ہے کہ وہ تمام اقلیتی گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد کو بلا امتیاز تعلیم و تربیت کے مساوی مواقع فراہم کریں۔کیوں کہ اقلیتوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے کا مکمل حق حاصل ہے۔دوسرا معاشی حق ہے۔یعنی کہ معاش کے انتخاب میں انھیں مکمل آزادی کا حق حاصل ہے تاکہ وہ اپنی مرضی،دلچسپی اور صلاحیت کے مطابق ملک کی ترقی میں حصہ لے سکیں۔تیسری اس بات کی تاکید کی ہے کہ ریاستیں اس بات کو ہر صورت ممکن بنائیں کہ اقلیتی گروہ تمام قسم کے انسانی حقوق اور بنیادی آزادی سے لطف اٹھا سکیں۔اور اس معاملے میں ان سے کوئی بھی برا اور دل دکھانے والا سلوک روا نہ رکھا جائے۔

آرٹیکل ۵۔:

۱۔ قومی سطح پر پالیسیاں اور پروگرام بناتے ہوئے اور ان کے نفاذ کے دوران اقلیتوں کے مفاد کو پیش نظر رکھا جائے قانون کی حدود و قیود میں رہتے ہوئے۔

۲۔ ایسے پروگرامز کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے جن کا مقصد ریاستوں کے درمیان تعاون کو بڑھانا اور ایک دوسرے کی مدد کرنا ہو، ان کہ نفاذ کے دوران قانونی حدود و قیود میں رہتے ہوئے اقلیتوں کے مفادات کو پیش نظر رکھا جائے۔

اس منشور میں پھر اس بات کو واضح کیا ہے کہ ریاستیں ملکی سطح پر جب بھی کوئی پروگرام ترتیب دیں تو اقلیتی طبقے سے تعلق رکھنے والے گروہ کے مفادات کو مد نظر رکھیں۔ ایسا کوئی بھی پروگرام اور پالیسی نہ بنائی جائے جس سے اقلیتی طبقے کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اقوام متحدہ کا کہنا ہے کہ ریاست میں کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے جس کا مقصد ایک گروہ کو نوازنا جب کہ دوسرے گروہ کو محروم رکھنا ہو کیوں کہ قانون کی نظر میں بھی اکثریت واقلیت برابر کے حقوق رکھتے ہیں۔

آرٹیکل ۶۔:

ریاستوں کو چاہیے کہ اقلیتوں کے متعلق سوالات پر تعاون کریں جن کا مقصد معلومات اور تجربات کا تبادلہ ہو تاکہ ہم آہنگی اور اعتماد کو فروغ ملے۔

اس منشور کے مطابق معاشرتی زندگی میں تمام گروہوں کے درمیان ہم آہنگی کا ہونا ضروری ہے اور وہ ہم آہنگی اور اعتماد مذہب، رنگ، نسل کی بنیاد پر نہیں بل کہ بحیثیت انسان ہو۔ اور سوال نامے کا فارمولا اپنانے کا کہا ہے تاکہ اقلیتوں کے متعلق مزید تجربات اور معلومات میں اضافہ ہو۔

آرٹیکل ۷۔:

اس منشور میں اقلیتوں کو جو حقوق دیے گئے ہیں تاکہ انھیں مناسب مقام دیا جا سکے۔ اس کے لیے ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ تعاون کرے۔

اس منشور میں کہا گیا ہے کہ اقلیتی طبقے کو جو حقوق دیے گئے ہیں ان کے لیے ریاست کا فرض ہے کہ اقلیتوں کو وہ تمام حقوق عملی طور پر بھی دیے جائیں صرف کاغذی حد تک نہیں۔ تاکہ ایک مثالی سماج قائم ہو سکے۔ اقلیتوں کو سماج میں باعزت مقام دینے کے لیے ضروری ہے کہ تمام حقوق کا عملی نفاذ بھی ہو۔

آرٹیکل ۸۔:

۱۔اس منشور میں کوئی بھی چیز ریاستوں کی بین الاقوامی ذمہ داریاں جو اقلیتوں کے متعلق ہیں ان کی بجا آوری سے باز نہیں رکھے گی۔ ریاستیں خاص طور پر ان پابندیوں اور وعدوں کی تکمیل کریں گی جن کو انھوں نے بین الاقوامی اعلانات اور معاہدات میں قبول کیا ہے جس کی وہ شراکت دار ہیں۔

۲۔اس معاہدے میں طے شدہ حقوق کے ضمن میں ریاستوں کی طرف سے اٹھائے گئے اقدامات اور حقوق سے بہتر طور پر مستفید ہوا جائے۔ ان کو پہلے سے پاس کردہ انسانی حقوق کے بین الاقوامی منشور کے اصول مساوات کے برعکس خیال نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ موجودہ منشور سے کوئی بھی ایسا مفہوم نہیں نکالا جائے گا جو اسے کسی ایسی سرگرمی کی اجازت دے جو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے برعکس ہو بشمول حکومتی مساوات، ملکی سالمیت اور ریاستوں کی سیاسی آزادی۔

اس منشور کے مطابق کوئی بھی چیز اقلیتوں کے حقوق کو پورا کرنے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گی اور ریاستیں خصوصی طور پر ان وعدوں اور پابندیوں کو پورا کریں گی جو انھوں نے بین الاقوامی معاہدوں اور اعلانات کے دور پر بخوشی منظور کیے ہیں۔ اقلیتوں کے وہ تمام حقوق جو ریاست کی طرف سے انھیں دیے گئے ہیں ان پر سختی سے عمل بھی کیا جائے تاکہ اقلیت بھی بھرپور طریقے سے زندگی گزارنے کا لطف اٹھا سکیں۔ کیوں کہ آئین اور قانون کے مطابق انھیں تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں لیکن ان حقوق کا نفاذ صرف آئین و قانون کی حد تک ہی ہوتا ہے حقیقت میں بہت کم اس قانون پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس ناانصافی کی وجہ سے پھر اقلیت مختلف مسائل کا شکار ہوتے ہیں۔ اس منشور کے بارے میں کوئی بھی ایسا مقصد یا مفہوم نہیں سمجھا جائے گا جو اقوام متحدہ کے اصولوں اور مقصد کے منافی ہو۔ کیوں کہ قومیت، عقیدے اور علاقے کا امتیاز کیے بغیر تمام انسانوں کو معاشی، سماجی اور مذہبی مساوات کا حق حاصل ہے۔

آرٹیکل ۹۔:

اس منشور میں اقلیتوں کو جو حقوق دیے گئے ہیں ان کی تکمیل کے سلسلے میں ریاستوں پر جو بین الاقوامی ذمہ داری ہے اس کی راہ میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنے گی۔خاص طور پر ریاستیں اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہوئے تعمیل کریں گی اس ذمہ داری کی جو انھوں نے بین الاقوامی اعلانات اور معاہدوں میں قبول کی ہے اس کو وہ نبھائیں گی۔ جس کی وہ حصہ دار ہیں۔

اس منشور میں پھر سے تاکید کی گئی ہے کہ ریاستوں پر اقوام متحدہ کی طرف سے بین الاقوامی سطح پر جو پابندی عائد ہوتی ہے وہ اس کو پورا کریں گی اور اس سلسلے میں مقامی سطح پر کوئی چیز رکاوٹ نہیں بننے دیں گی۔ یعنی کہ اختلاف مذہب کے سبب اقلیتوں کے حقوق سلب نہیں کیے جائیں گے۔اقوام متحدہ نے جو بنیادی انسانی حقوق اقلیتوں کو دیے ہیں ان کو کوئی فرد یا ریاست کسی بھی بحرانی یہ ہنگامی حالت میں منسوخ نہیں کر سکتی۔

اقلیتوں کے حقوق ول کیملیکا(Will Kymlicka)کے نظریات کے روشنی میں

"ول کیملیکا(will kymlicka)" ۱۹۶۲ء میں کینیڈا میں پیدا ہوئے۔"ول کیملیکا" ایک سیاسی فلسفی ہیں جو کثیر الثقافت سماج میں اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے کام کے سلسلے میں مشہور ہیں اور کنگسٹن (Kingston)میں کوینز یونی ورسٹی(Queen,s university)میں سیاسی فلسفہ کے پروفیسر کے طور پر ۱۹۹۸ء سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں ان کی کتاب:

"Multicultral citizenship: A liberal theory of minority rights"

۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آئی جس میں اُنھوں نے سماج میں موجود کثیر الثقافت اقلیتوں کے حقوق کو زیر بحث لایا ہے۔یہ ایک بہت اہم کتاب ہے جو کثیر الثقافت سماج میں اقلیتوں کے حقوق کے لیے ناگزیر ہے"۔ول کیملیکا" کئی ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں لیکن خاص طور پر انھیں کثیر الثقافت شہریت پر کام کرنے کی وجہ سے کینیڈین پولیٹیکل سائنس ایسوسی ایشن نے میک فیرسن پرائز(MacPherson Prize)اور امریکی پولیٹیکل سائنس کی طرف سے رالف بینچ(Ralf bunch)سے نوازا گیا۔سوشل سائنس(سماجی علوم)اور ہیومینٹیز ریسرچ(انسانیت)کونسل کی جانب سے ۲۰۱۹ ء میں گولڈ میڈل دیا گیا۔

۲۰۰۴ءسے ۲۰۰۶ءتک وہ امریکن سوسائٹی آف سیاسی اور قانونی فلسفہ کے صدر رہے۔ ۲۰۱۳ءمیں یونی ورسٹی آف کوپن ہیگن (Copenhagen) نے اعزازی ڈگری سے نوازا۔ ۲۰۱۴ءمیں "ول کیملیکا" کو یونی ورسٹی آف لیوین (Leuven) نے فلسفہ انسٹی ٹیوٹ سے اعزازی ڈاکٹریٹ سے نوازا گیا۔ ۲۰۲۱ءمی "ول کیملیکا" نے Pierre chauveau میڈل حاصل کیا۔" ول کیملیکا" کی آٹھ (۸) کتابوں اور دو سو (۲۰۰) مضامین کا دنیا کی بتیس (۳۲) زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔"ول کیملیکا" کی تحقیقی دل چسپیاں خاص طور پر کثیر الثقافت سماج میں اقلیت اور سماجی انصاف کے حقوق پر ہیں۔ ان کا سب سے زیادہ کام کثیر الثقافت سماج میں اقلیتوں کے حقوق پر ہے۔

کثیر الثقافت

کثیر الثقافت متعدد ثقافتوں کا مجموعہ ہے۔ جو ایک ہی جسمانی، جغرافیائی یا معاشرتی خلا میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ اس میں مذہبی، لسانی، نسلی تمام ثقافتیں، ثقافت کے اندر شامل ہیں۔ کثیر الثقافت ایک اصول ہے جو تمام شعبوں میں موجود ثقافتی تنوع کو تسلیم کرتا ہے۔" پروفیسر انور جمال "اپنی کتاب" ادبی اصطلاحات "میں ثقافت کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> " ثقافت عمرانی اصطلاح کے طور پر ادب میں رائج ہے۔ کسی لسانی گروہ کے طور اطوار، مذہبی اور سماجی رسوم، رہن سہن اور پوشاک وخوراک کے انداز واقدار، عقائد اور افکار یہ سب چیزوں کے مجموعے سے جو مرکب تیار ہوتا ہے وہ ثقافت ہے۔"(۲۲)

کثیر الثقافت سماج ایک ایسا سماج ہوتا ہے جس میں مختلف ثقافتوں، متعدد نسلوں اور مختلف مذاہب کے لوگ باہمی احترام اور ہم آہنگی کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے نظریات اور عقائد کو کھلے دل سے قبول کرتے ہیں۔ مختلف ثقافتیں روادار سماج تشکیل دیتی ہیں۔ جب مختلف ثقافتوں کے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں تو ایک دوسرے کے مابین فرق کو سمجھتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے اختلافات کم ہوتے ہیں اور ان میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہم آہنگی ان کے درمیان پہلے سے موجود اختلافات کو دور کرتی ہے۔ ایک دوسرے کے تہواروں میں شرکت کرنے سے اور خصوصی موقع پر جشن منانے سے سماج میں امن کو فروغ ملتا ہے۔ جس کی

وجہ سے تمام لوگوں میں سماجی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔"ڈاکٹر مظفر حسن ملک "اپنی کتاب "ثقافتی بشریات" میں ثقافت کے متعلق اپنی رائے یوں دیتے ہیں:

> " ثقافت ایک معاشرے کی اکتسابی اہلیت ہے۔جو کہ افراد کو معاشرے کی طرف سے منتقل ہوتی ہے۔اس میں روایات، اسلوب، انداز فکر، احساس اور کردار سب متعین ہوتے ہیں۔اس میں علم، عقائد، آرٹ، قانون، رسم ورواج اور وہ عادات جو معاشرے کے زیر اثر افراد حاصل کرتے ہیں۔تمام شامل ہوتی ہیں۔"(۲۳)

ثقافت کسی سماج کے افراد کی طرز زندگی اور تمدن کا حسن ہے۔اس میں وہ تمام امور شامل ہیں جن سے اس معاشرے کے افراد کے جمالیاتی ذوق اور فنی مہارت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔یوں ثقافت میں کسی قوم کے وہ علوم وفنون اور نظریات شامل ہیں جو اسے دوسری قوموں سے منفرد اور ممتاز کرتے ہیں۔ایسے عناصر جنھیں سماج زندگی کا حصہ بنالے اور وہ سماج کی شناخت کی حیثیت اختیار کر جائیں مجموعی طور پر اس سماج کی ثقافت کہلاتے ہیں۔ثقافت کسی سماج کا صدیوں سے حاصل شدہ ذہنی کاوشوں اور عملی کارگزاریوں کا خزانہ ہے۔اس بے بہا میراث کو کوئی بھی سماج ضائع کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔اس میں سماج اپنی زندگی محسوس کرتا ہے۔ اور اسے اپنی آئندہ نسلوں کو منتقل کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے تاکہ اس کی حفاظت ہو سکے۔اس میں کوتاہی سماج کو اپنے قیمتی ورثے سے محروم کر کے ذہنی، فکری اور سیاسی طور پر دوسروں کا غلام بنادیتی ہے۔

کثیر الثقافت کو سلاد باول تھیوری بھی کہتے ہیں۔جس میں مختلف مذاہب کے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں۔اور اپنی انفرادی ثقافت کی کچھ منفرد خصوصیات رکھتے ہیں۔یہ نظریہ سلاد کے پیالے کے استعارے پر مبنی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سلاد میں مختلف اجزاء ہوتے ہیں جو آپس میں مل جاتے ہیں۔لیکن اپنے الگ ذائقوں کو برقرار رکھتے ہیں۔اسی طرح مختلف ثقافتوں کو ایک ہی یکساں سماج میں اکٹھا کیا جاسکتا ہے اور اپنی منفرد نسلی اور ثقافتی خصوصیات کو برقرار رکھا جاسکتا ہے۔سلاد باول تھیوری ثقافتی رواداری کی اجازت دیتا ہے۔کیوں کہ ہر ثقافت میں ایک اکثریت اور بہت سی اقلیتیں ہوتی ہیں۔

اقلیتوں کے حقوق ول کیملیکا کے نظریات کی روشنی میں

"ول کیملیکا" کا کہنا ہے کہ یہ نظریہ (تھیوری) اقلیتی ثقافتوں کے حقوق اور ان کی حیثیت کا ایک نیا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کا استدلال ہے کہ اقلیتی ثقافتوں کے اجتماعی حقوق لبرل جمہوری اصولوں کے مطابق ہوں۔ کیوں کہ لبرل نظریہ اور گروہی امتیازی حقوق کے درمیان مطابقت ایک طاقتور دلیل ہے۔ ول کیملیکا کی کتاب
“Multicultural citizenship: A liberal theory of minority rights”
سے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔ "ول کیملیکا" اپنی کتاب میں اقلیتوں کے متعلق لکھتے ہیں:

"Most countries today are culturally diverse .According to recent estimates, the world's 184 independent states contain over 600 living language groups, and 5,000 ethnic groups .In very few countries can the citizens be said to share the same language, or belong to the same ethnonational group.

This diversity gives rise to a series of important and potentially divisive questions. Minorities and majorities increasingly clash over such issues as language rights, regional autonomy, political representation, curriculum, land claims, immigration and naturalization policy, even national symbols, such as the choice of national anthem or public holidays.Finding morally defensible and politically viable answers to these issues is the greatest

challenge facing democracies today .In Eastern Europe and the Third World, attempts to create liberal demonocratic institutions are being undermined by violent nationalist conflict. In the West, volatile disputes over the rights of emmigrants, indigenous peoples, and other cultural minorities are throwing into question many of the assumptions which have governed political life for decades. Since the end of the Cold War, ethnocultural conflicts have become the most common source of political violence in the world, and they show no sign of abating. This book outlines a new approach to these problems."[۲۴]

آج کل زیادہ تر ممالک ثقافتی طور پر متنوع ہیں۔ حالیہ تخمینوں کے مطابق دنیا کی ۱۸۴ آزاد ریاستوں میں ۶۰۰ سے زیادہ زندہ زبانوں کے گروہ اور ۵۰۰۰ نسلی گروہ ہیں۔ بہت کم ممالک میں شہریوں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ہی زبان بولتے ہیں یا ایک ہی نسلی، قومی گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تنوع اہم اور ممکنہ طور پر تفرقہ انگیز سوالات کے سلسلے کو جنم دیتا ہے۔ اقلیتیں اور اکثریتیں زبان کے حقوق، علاقائی خود مختاری ،سیاسی نمائندگی، تعلیمی نصاب ،زمین کے دعوے،امیگریشن اور نیچرلائزیشن پالیسی، یہاں تک کہ قومی نشانات جیسے قومی ترانے کا انتخاب یا عوامی تعطیلات جیسے مسائل پر تصادم کا شکار ہیں۔ ان مسائل کے اخلاقی طور پر قابل دفاع اور سیاسی طور پر قابل عمل جواب تلاش کرنا آج جمہوریتوں کے سامنے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ مشرقی یورپ اور تیسری دنیا میں پر تشدد قوم پرست تنازعات کے ذریعے

لبرل جمہوری ادارے بنانے کی کوششوں کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ مغرب میں تارکین وطن، مقامی لوگوں اور دیگر ثقافتی اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے غیر مستحکم تنازعات کئی دہائیوں سے سیاسی زندگی پر حکومت کرنے والے بہت سے مفروضوں پر سوالیہ نشان لگا رہے ہیں۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے نسلی، ثقافتی تنازعات دنیا میں سیاسی تشدد کا سب سے عام ذریعہ بن چکے ہیں۔ اور ان کے ختم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ یہ کتاب ان مسائل کے حل کے لیے ایک نئے انداز کا خاکہ پیش کرتی ہے۔

"ول کیملیکا" کے مطابق انسان پیدائشی طور پر آزاد ہے۔ حقوق و فرائض کے لحاظ سے یکساں حیثیت کا حامل ہے۔ اور اسے فطری طور پر یہ شعور دیا گیا ہے کہ بھائی چارے کی فضا قائم رکھے۔ تمام بنیادی حقوق اور آزادی تمام شہریوں کے لیے یکساں ہے۔ ہر شخص کو آزادی کے ساتھ رہنے کا حق ہے۔ قانون کی نگاہ میں تمام انسان برابر ہیں۔ اور بلا تفریق یکساں حفاظت کے حق دار ہیں۔ ہر شخص کو اپنے ملک میں آزادی سے نقل و حرکت کی آزادی ہے۔ ہر انسان کا بنیادی حق ہے کہ اسے سماجی تحفظ دیا جائے۔ سماج کے تمام افراد کے لیے کسی امتیاز یا تفریق کے بغیر تمام بنیادی سہولیات زندگی برابر کے اصول پر مہیا ہوں۔ "ول کیملیکا" کسی بھی صورت اقلیتوں کی ثقافتی اور تہذیبی غلامی نہیں دیکھنا چاہتے۔ وہ ان کے ساتھ ناانصافی کی ہر شکل کے خلاف ہیں۔ چاہے اس کی صورت کوئی بھی ہو۔ انھوں نے اقلیتوں کے حقوق کے متعلق تفصیل سے اپنی کتاب میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے "ول کیملیکا" نے جو طرز اختیار کیا ہے اور زبان و بیان کے جوہر دکھائے ہیں ان کی بنیاد پر ان کے اقلیتوں سے متعلق کام کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ "ول کیملیکا" کے نزدیک:

"Protecting national minorities does provide benefits to the majority, and these are worth pointing out .But these diffuse benefits are better seen as a desirable by product of national rights, rather than their primary justification

.To date, most majority cultures have not seen it in their enlightened self- interest to maintain minority cultures .No doubt this is due in part to ethnocentric prejudice ,but we must recognize the powerful interests that majority nations often have in rejecting self- government rights for national minorities-e.g increased access to the minorities land and resources, increased individual mobility, political stability, etc. It is unlikely that majorities well accept national rights solely on the basic of self- interest, without some belief that they have an obligation of justice to accept them. Conversely, it is unlikely that majorities will accept their obligations of justice towards national minorities without a belief that they gain something in the process. The diversity argument works best, therefore, when it is combined with arguments of Justice."[۲۵]

قومی اقلیتوں کا تحفظ اکثریت کو فوائد فراہم کرتا ہے۔ اور یہ بات قابل توجہ ہے۔ لیکن ان پھیلے ہوئے فوائد کو ان کے بنیادی جواز کے بجائے قومی حقوق کی مطلوبہ ضمنی پیداوار کے طور پر بہتر دیکھا جاتا ہے۔ آج تک اکثریتی ثقافتوں نے اقلیتی ثقافتوں کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے روشن خیال مفاد میں نہیں دیکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نسلی تعصب کی وجہ سے ہے۔ لیکن ہمیں ان طاقتور مفادات کو تسلیم کرنا چاہیے جو اکثریتی قومیں اکثر قومی اقلیتوں کے لیے خود مختاری کے حقوق مسترد کرنے میں رکھتی

ہیں۔ جیسے اقلیتوں کی زمین اور وسائل کی رسائی میں اضافہ ،انفرادی نقل و حرکت میں اضافہ، سیاسی استحکام وغیرہ۔ اس بات کا امکان نہیں ہے کہ اکثریت قومی حقوق کو صرف اور صرف ذاتی مفاد کی بنیاد پر قبول کرے گی۔ اس یقین کی بغیر کے ان پر انصاف کی ذمہ داری ہے۔ انھیں اس کے برعکس اس بات کا امکان نہیں ہے کہ اکثریت قومی اقلیتوں کے ساتھ انصاف کی اپنی ذمہ داری کو اس یقین کے بغیر قبول کرے گی کہ اس عمل میں انھیں کچھ حاصل ہو گا۔ تنوع کی دلیل بہترین کام کرتی ہے۔لہذا جب اسے انصاف کے دلائل کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔

"ول کیملیکا" نے نہایت سلیقے سے اقلیتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو لفظوں میں پرو دیا ہے۔وہ اقلیتوں کے لیے محفوظ اور خوب صورت سماج کی تخلیق کے خواب دیکھتے ہیں۔وہ انسانیت کو سربلند اور انسانی اقدار کو جاری و ساری دیکھنا چاہتے ہیں۔وہ سماج میں امن و سکون اور اقلیتوں کی خوش حالی کے آرزو مند ہیں۔وہ دنیا میں محبت کے پیغام کو عام کرنا چاہتے ہیں۔ان کے نظریات میں انسانیت کا حسن اور ایک صحت مند اور امن پسند سماج کی جھلک ملتی ہے۔ ان کے نزدیک سماج میں اقلیتوں سے اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ انھیں بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے جو کہ ایک ناقابل برداشت عمل ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ہر سیاسی ادارے پر لازم ہے کہ وہ اپنے دائرہ کار میں رہنے والے اقلیتوں کی جان ومال اور آبرو کی حفاظت کرے اور امن وامان اور خوش حالی کے علاوہ اقلیتوں کی بھلائی اور بہبود کے لیے بھی کام کرے۔"ول کیملیکا "نے اپنی نظریات میں سلطنت عثمانیہ کے نظام حکومت کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ کیسے ان کے دور حکومت میں مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں سب کو خود مختار اکائیوں کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔اور ان کو تمام بنیادی حقوق حاصل تھے۔اقتباس دیکھیے:

" In the millet system of the Ottoman Empire, for example, Muslims, Christians ,and jews were all

recognized as self- governing units and allowed to impose restrictive religious laws on their own members.

The Ottoman Turks were Muslims who conquered much of the Middle East, North Africa, Greece, and Eastern Europe during the fourteenth and fifteenth centuries, thereby acquiring many jewish and Christian subjects .For various theological and strategic reasons, the ottomans allowed these minorities not only the freedom to practice there religion, but a more general freedom to govern themselves in purely internal matters, with their own legal codes and courts.For about five centuries, between 1456 and the collapse of the Empire in World War I, three non-Muslim minorities had official recognition as self- governing communities __the Greek Orthodox, the Armenian Orthodox ,and the Jews ---The legal traditions and practices of each religious group, particularly in matters of family status, were respected and enforced through the Empire. However, while the Christian and Jewish millets were free to run their internal affairs, their relations with the ruling Muslims were tightly regulated.They were to enjoy complete self-government, obeying their own laws and Customs. Their

collective freedom of worship was guaranteed, together.
"(۲۶)

"سلطنت عثمانیہ کے جوار کے نظام میں ،مثال کے طور پر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں سب کو خود مختار اکائیوں کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا اور انھیں اپنے اراکین پر پابندی والے مذہبی قوانین نافذ کرنے کی اجازت تھی۔ عثمانی ترک مسلمان تھے۔ جنھوں نے چودھویں اور پندرویں صدی کے دوران مشرق وسطیٰ ،شمالی افریقہ، یونان اور مشرقی یورپ کا بیشتر حصہ فتح کیا۔ اس طرح بہت سے یہودی اور عیسائی رعایا بھی شامل ہوئی۔ مختلف مذہبی اور تزویراتی وجوہات کی بنا پر عثمانیوں نے ان اقلیتوں کو نہ صرف اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دی بل کہ ان کے اپنے قانونی ضابطوں اور عدالتوں کے ساتھ خالصتاً اندرونی معاملات میں خود پر حکومت کرنے کی عام آزادی دی۔ تقریباً پانچ صدیوں تک ۱۴۵۶ ءاور پہلی جنگ عظیم میں سلطنت کے خاتمے کے درمیان تین غیر مسلم اقلیتوں کو سرکاری طور پر خود حکومت کرنے والی برادریوں کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ یونانی آرتھوڈوکس، آرمینیائی آرتھوڈکس اور یہودیوں کو۔۔۔۔ سلطنت کے ذریعے ہر مذہبی گروہ کی قانونی روایات اور طور طریقوں کا خاص طور پر خاندانی حیثیت کے معاملات میں احترام کے علاوہ نافذ بھی کیا جاتا تھا۔ جب کہ عیسائی اور یہودی جوار اپنے اندرونی معاملات چلانے کے لیے آزاد تھے۔ حکمران مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات سختی سے منظم تھے۔۔۔ انھیں اپنے قوانین اور رسم ورواج کی پابندی کرتے ہوئے مکمل خود مختاری سے لطف اندوز ہونے کی آزادی تھی۔ ان کو عبادت کی اجتماعی آزادی کی ضمانت دی گئی تھی۔

" ول کیملیکا" سلطنت عثمانیہ کے عدل وانصاف اور اقلیتوں کو تمام بنیادی حقوق دینے اور ان تمام حقوق پر عمل کرنے کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

"With their possession of churches and monasteries, and they could run their own schools.

This system was generally humane, tolerant of group differences, and remarkably stable.For nearly half a millennium, the Ottomans ruled an Empire as diverse as any in history .Remarkable, this polyethnic and multi religious society worked . Muslins, Christians, and Jews worshipped and studied side by side, enriching their distinct cultures."(۲۷)

گرجاگھر اور خانقاہیں ان کی تحویل میں ہونے کے علاوہ وہ اپنے سکول بھی چلا سکتے تھے۔ یہ نظام عام طور پر انسانی، گروہی اختلافات کو برداشت کرنے والا اور نمایاں طور پر مستحکم تھا۔ تقریباً نصف ہزار سال تک عثمانیوں نے اپنی تاریخ میں اتنی متنوع سلطنت پر حکومت کی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کثیر الثقافتی اور کثیر مذہبی سماج نے کام کیا۔ مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں نے شانہ بشانہ عبادت کی اور مطالعہ کیا اور اپنی الگ الگ ثقافتوں کو تقویت بخشی۔

"ول کیملیکا" کا کام نئے چراغ روشن کرنا، اندھیروں اور ظلمتوں کو مٹانا ہے۔ انھوں نے سلطنت عثمانیہ کی خوب صورت مثالیں پیش کی ہیں کہ کس طرح انھوں نے اپنے دور حکومت میں اقلیتوں کو نہ صرف تمام حق دیے بل کہ ان پر عملی طور پر بھی عمل کیا۔ جب کہ دور حاضر میں اقلیتوں کو حقوق تو دیے گئے ہیں لیکن صرف آئین کی حد تک ان پر عمل ہوتا ہوا کہیں بھی نظر نہیں آرہا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقلیت تمام عمر تنگ دستی کے عالم

میں بسر کرتے ہیں۔ اور سماج سے کوئی سہولت اور آسودگی کی توقع نہیں رکھتے۔ وہ ایک بے چین روح کی طرح اپنے سکون اور آسودگی کے لیے پریشان نظروں سے کسی معجزے کے منتظر رہتے ہیں۔ اور اپنی ناکام آرزوں اور حسرتوں کو اپنے سینے میں دبائے رکھتے ہیں اور اپنی بدحالی پر آنسو بہاتے ہیں۔ اس حوالے سے "ول کیملیکا" کی کتاب سے اقتباس دیکھیے:

"Clarify the basic building blocks for a liberal approach to minorities rights. The Western political tradition has been surprisingly silent on these issues...

Some minorities were physically eliminated, either by mass expulsion or by genocide. Other minorities were coercively assimilated, forced to adopt the language, religion, and Customs of the majority. In yet other cases, minorities were treated as resident aliens, subjected to physical segregation and economic discrimination, and denied political rights."[۲۸]

اقلیتوں کے حقوق کے لیے لبرل نقطہ نظر کے لیے بنیادی تعمیراتی بلاکس کو واضح کرنا چاہیے۔ مغربی سیاسی روایت حیرت انگیز طور پر ان پر خاموش ہے۔۔۔ کچھ اقلیتوں کو جسمانی طور پر یا اجتماعی بے دخلی یا نسل کشی کے ذریعے ختم کر دیا گیا تھا۔ دیگر اقلیتوں کو زبردستی ضم کیا گیا۔ انھیں اکثریت کی زبان، مذہب اور رسم و رواج کو اپنانے پر مجبور کیا گیا۔ دیگر معاملات میں اقلیتوں کے ساتھ رہائشی اجنبی جیسا سلوک کیا گیا۔ یعنی جسمانی علیحدگی اور معاشی امتیاز کا نشانہ بنایا گیا اور سیاسی حقوق سے انکار کیا گیا۔

فرقہ وارانہ اختلافات نے انسان کو انسان سے دور کر دیا ہے۔ نفرت نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔ جس سے چاروں طرف نفرت کی تاریکی پھیل رہی ہے۔ "ول کیملیکا" چاہتے ہیں سب لوگ اقلیتوں کے لیے محبت کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دیں۔ کیوں کہ نفرت تو ایک بیماری ہے اور اس بیماری کا علاج صرف محبت میں پوشیدہ ہے۔ اقلیتوں کے لیے اپنے دل میں بے زاری اور نفرت کو جگہ دینے کے بجائے ان کے تمام حقوق کو کھلے دل سے تسلیم کرنا چاہیے۔ کیوں کہ امید کی شمع روشن رکھنے اور اپنے حوصلوں کے بل بوتے پر محبت اور انسانیت کے دشمنوں کو شکست دی جا سکتی ہے۔ آپس میں محبت، اتفاق اور اتحاد وہ طاقت ہے کہ جس کی مدد سے انسان اپنے دشمنوں کو بھی اپنا دوست بنا سکتا ہے۔

ول کیملیکا" اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں:

> "I have argued that any theory which does not accord substantial civil rights to the members of minority cultures is seriously deficient from a liberal point of view."[٢٩]

> میں نے استدلال کیا ہے کہ کوئی بھی نظریہ جو اقلیتی تقاضوں کے ارکان کو خاطر خواہ شہری حقوق فراہم نہیں کرتا وہ لبرل نقطہ نظر سے شدید طور پر ناقص ہے۔

ایک اور جگہ اس حوالے سے یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> "Basic human Rights such as freedom of speech, association, and conscience . Where these individual rights are firmly protected, liberals assumed no further rights needed to be attributed to the members of specific enthnic or national minorities."[٣٠]

ترجمہ : بنیادی انسانی حقوق جیسے کہ آزادی اظہار، انجمن سازی اور شعور جب ان انفرادی حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے تو لبرل فرض کرتے ہیں کہ مخصوص نسلی یا قومی اقلیتوں کے ارکان سے مزید حقوق منسوب کرنے کی ضرورت نہیں۔

" ول کیملیکا" کے خیال میں کوشش اور ہمت وہ قوت محرکہ ہیں جو انسان کو مضبوطی سے اپنے قدم جمانے اور نظام کہن کو بدلنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اقلیتوں کی زندگی کے ایک رخ پر اصرار کرنے کے بجائے اس کی مختلف صورتوں اور امتیازی سلوک کو سامنے لاتے ہیں۔ اور اس کے ہر ہر پہلو سے کوئی نہ کوئی مثبت انداز نکالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر انسان کی زندگی ایک قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح اندھیرے کے بغیر روشنی کا تصور محال ہے اسی طرح اقلیتوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانی بھی انتہائی ضروری ہے۔ جیسا کہ "ول کیملیکا" لکھتے ہیں:

"In short, they must be resolved politically, by good- faith negotiations and the give and take of democratic politics. This means that we need to think about the fairness, not only of specific group- differentiated rights, but also of the decision- making procedure by which these rights are defined and interpreted.

Fairness in a decision- making procedure implies, amongst other things, that the interests and perspectives of the minority be listened to and taken into count."(۳۱)

مختصراً انھیں سیاسی طور پر نیک نیتی کے ساتھ گفت و شنید اور جمہوری سیاست کے کچھ دو اور کچھ لو کے ذریعے حل کیا جانا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں انصاف پسندی کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہے۔ نہ صرف مخصوص گروہ کے امتیازی حقوق کے

بارے میں بل کہ فیصلہ سازی کے طریقہ کار کے بارے میں بھی جس کے ذریعے ان حقوق کی تعریف اور تشریح کی گئی ہے۔ فیصلہ سازی کے طریقہ کار میں منصفانہ پن کا مطلب ہے کہ دوسری چیزوں کے علاوہ اقلیتوں کے مفادات اور نقطہ نظر کو سنا جائے اور ان کو مد نظر رکھا جائے۔

"ول کیملیکا" ستائش کی تمنا اور صلے سے بے نیاز ہو کر اپنے لفظوں اور نظریات سے اقلیتوں کے حق میں ہر ممکن دلائل دے رہے ہیں۔ ان کے نظریات کا بنیادی موضوع ہی یہی ہے کہ سارا جہاں اگر اقلیتوں کے حقوق کے معاملے میں شر انگیزی کے راستے پر چل نکلا ہے تو کیا ہوا۔ ہمارا کام تو ان کے حقوق کے لیے سد ابلند کرنا ہے۔ ہم اپنے حصے کا کام ضرور کریں گے۔ ان کے نزدیک اقلیتوں اور اکثریتوں کے درمیان فاصلوں کو مٹانے کے لیے اپنی تمام تر کوششیں بروئے کار لانی چاہئیں۔ وہ نفرتوں کو ختم کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اور اقلیتوں کے لیے اکثریت کے دلوں میں محبت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ "ول کیملیکا" مستقل مزاجی کے ساتھ کثیر الثقافت سماج میں اقلیتوں کے حقوق کے لیے مسلسل کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے کینیڈین سماج کی ایک اعلیٰ مثال پیش کی ہے۔ جس میں کینیڈا کی حکومت نے اقلیتوں کے لیے سات اقدار کی فہرست تیار کی ہے اقتباس دیکھیے:

"For example: One government commission in Canada developed a list of seven such values which Canadians shared:

1) A belief in equality and fairness

2) A belief in consultation and dialogue

3) The importance of accommodation and tolerance

4) Support for diversity

5) Compassion and generosity

6) Attachment to the natural environment

7) A commitment to freedom, peace, and non- violent change.

The hope is that focusing on these shared values will provide grounds for social unity in Canada."(۳۲)

مثال کے طور پر کینیڈا میں حکومتی کمیشن نے سات ایسی اقدار کی فہرست تیار کی ہے جو کینیڈین نے شیئر کی ہے۔

۱۔ مساوات اور انصاف پر یقین۔

۲۔ مشاورت اور مکالمے پر یقین۔

۳۔ رہائش اور رواداری کی اہمیت۔

۴۔ تنوع کی حمایت۔

۵۔ ہمدردی اور سخاوت۔

۶۔ قدرتی ماحول سے لگاؤ۔

۷۔ آزادی امن اور عدم تشدد کی تبدیلی کا عزم۔

امید ہے کہ ان مشترکہ اقدار پر توجہ مرکوز کرنے سے کینیڈا میں سماجی اتحاد کی بنیادیں ملیں گی۔

مزید لکھتے ہیں:

"A Iiberal democracy,s most basic commitment is to the freedom and equality of its individual citizens. This is reflected in constitutional bills of rights which guarantee basic civil and political rights to all individuals, regardless of their group membership."(۳۳)

ایک لبرل جمہوریت کی سب سے بنیادی وابستگی اس کے انفرادی شہریوں کی آزادی اور مساوات ہے۔ اس کی عکاسی حقوق کے آئینی بلوں میں ہوتی ہے۔ جو تمام افراد کو بنیادی شہری اور سیاسی حقوق کی ضمانت دیتے ہیں چاہے ان کے گروپ کی رکنیت کچھ بھی ہو۔

"ول کیملیکا" کا کہنا ہے کہ سماج میں اقلیتوں کے ساتھ منافرت اور کشیدگی بہت زیادہ ہے۔ جس نے صورت حال کو اور زیادہ خراب کر دیا ہے۔ وہ انسان دوستی کے خواہش مند ہیں۔ کیوں کہ وہ اقلیتوں کی سماجی، معاشی اور مذہبی کش مکش اور ان کے بنیادی مسائل سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ وہ اقلیتوں کو نظام کی خرابیوں طبقاتی تقسیم اور بنیادی حقوق نہ ملنے سے پیدا ہونے والی ناہمواریوں اور بے انصافیوں سے پاک ایک ایسے خطہ امن میں دیکھنا چاہتے ہیں جہاں مساوات، معاشی و سماجی انصاف، رواداری اور یکجہتی کا دور دورہ ہو۔ اور اکثریت، حکومت اور رہائشی ادارے اپنے دلوں کو محبت کے اس جذبے سے آباد کر لیں جو انسان کی پہچان ہے۔ مغرب میں اقلیتوں کے حوالے سے "ول کیملیکا" کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے:

" It is important to recognize that religious tolerance in the West has taken a very specific form-namely, the idea of individual freedom of conscience .it is now a basic individual right to worship freely ,to propagate one,s

religio to change one,s religion or ineeded to renounce religion altogether. To restrict an individual's exercise of these liberties is seen as a violation of a fundamental human right.

There are other forms of religious toleration which are not liberal.They are based on the idea that each religious group should be free to organize its community as it see fits, including along no- liberal lines."[۳۴]

یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ مغرب میں مذہبی رواداری نے ایک خاص شکل اختیار کر لی ہے۔یعنی ضمیر کی انفرادی آزادی کا نظریہ، آزادی کے ساتھ عبادت کرنا۔اپنے مذہب کی تبلیغ کرنا۔کسی کا مذہب تبدیل کرنا یا حقیقتاً مذہب کو یکسر ترک کرنا بنیادی انفرادی حق ہے۔کسی فرد کی ان آزادیوں پر پابندی لگانا ایک بنیادی انسانی حق کی خلاف ورزی کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔مذہبی رواداری کی اور بھی شکلیں ہیں جو لبرل نہیں ہیں وہ اس خیال پر مبنی ہیں کہ ہر مذہبی گروہ کو اپنی کمیونٹی کو منظم کرنے کے لیے آزاد ہونا چاہیے جیسا کہ وہ مناسب سمجھتا ہے بے شمول غیر لبرل خطوط پر۔

"ول کیملیکا" اقلیتوں کے حقوق کی پامالی کو ان کی ترقی کے لیے سخت نقصان دہ سمجھتے ہیں۔انھوں نے اقلیتوں کے مسائل کو بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے۔ان کا نظریہ ہے کہ اخلاق کا تقاضہ ہے کہ سماج کو جنت کا نمونہ بنایا جائے اور ایک دوسرے کے احساسات کی قدر کی جائے۔اقلیتوں سے گفتگو کے دوران نرمی اختیار کی جائے۔کیوں کہ اقلیتوں نے اپنے حقوق کی پامالی کی وجہ سے ساری زندگی چراغ کی طرح محرومیوں کی آگ میں سلگتے ہوئے گزاری ہے۔ "ول کیملیکا" اپنی کتاب

"Multicultural citizenship: A liberal theory of minority rights"

کے متعلق اور اقلیتوں کے حقوق کے متعلق لکھتے ہیں:

"I have presented a more optimistic ,view in this book .I have tried to show that many of the demands of ethnic and national groups are consistent with liberal principles of individual freedom and Social Justice. I would not say that these issues can be resolved in any final sense.The issues are too complicated for that.But they can be managed, peacefully and fairly, assuming there is some level of goodwill."[۳۵]

میں نے اس کتاب میں بہت پر امید نظریہ پیش کیا ہے۔ میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ نسلی اور قومی گروہوں کے بہت سے مطالبات انفرادی آزادی اور سماجی انصاف کے لبرل اصولوں سے ہم آہنگ ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ یہ مسائل کسی بھی حتمی معنی میں حل ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ معاملات بہت پیچیدہ ہیں۔ لیکن ان کو پر امن اور منصفانہ طور پر فرض کرتے ہوئے کہ خیر سگالی کی کوئی سطح موجود ہے منظم کیا جا سکتا ہے۔

"ول کیملیکا" آج کے مادی دور میں بھی اخلاق اور انسانی قدروں کے پرستار ہیں۔ وہ انسانوں کو ان کے مال و دولت عہدے اور مرتبے کے ترازو میں نہیں تولتے بل کہ انسانیت کا احترام کرتے ہیں۔ تمام لوگوں کو حقوق کے معاملے میں برابر سمجھتے ہیں اور خاص کر اقلیتوں کے لیے اپنے دل میں درد اور احساس کے جذبات رکھتے ہیں۔ انھوں نے اقلیتوں کو حقوق نہ دینے کے متعلق جو کچھ محسوس کیا ہے اسے بلا خوف و جھجک بیان کر دیا ہے۔ وہ سچی اور کھری باتوں کو دل میں چھپانے کے قائل نہیں۔ ایسے زندہ اور روشن ضمیر لوگ ہر سماج کے ماتھے کا جھومر ہوتے ہیں۔ "ول کیملیکا" کا شمار ایسے مثالی انسانوں میں ہوتا ہے جو اپنی زندگی کو انسانیت کی فلاح و بہبود

کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ انسانوں میں سچ اور جھوٹ، غلط اور صحیح کی تمیز پیدا کرنا یا اس کی طرف ان کی توجہ دلانا حقیقت میں انسانوں کا ایک فلاحی سماج قائم کرتا ہے۔ "ول کیملیکا" کے نظریات کے مزید اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اقلیتوں کو امتیازی سلوک اور جبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۲۔ اقلیتوں کو بنیادی شہری اور سیاسی حقوق نہیں دیے جاتے۔

۳۔ اقلیتیں انفرادی مساوات کے سلوک سے لطف اندوز نہیں ہو پاتی اور نہ ہی قانونی طور پر اپنی نسلی خصوصیت کے لیے سہولیات کا مطالبہ کر سکتی ہیں۔

۴۔ اقلیتیں اپنے نسلی ورثے کے کسی بھی حصے کو برقرار رکھنے کی کوشش کرنے کے لیے آزاد ہیں۔

۵۔ اقلیتوں کو ان کی زبان آزادانہ استعمال کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے اور ان کی زبان کے حقوق کا احترام کرنا چاہیے۔

۶۔ اقلیتوں کو مذہبی آزادی دی جانی چاہیے۔

۷۔ اقلیتی گروہ کو اپنی نمائندگی کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

۸۔ اقلیتوں پر عائد کردہ داخلی پابندیاں ناانصافی پر مبنی ہیں یہ نہیں ہونی چاہیے۔

۹۔ اقلیتی حقوق کو انسانی حقوق کے زمرے میں شامل نہیں کیا جاتا پارلیمنٹ، بیوروکریسی اور عدالتوں میں ان کے حقوق کو تسلیم کیا جانا چاہیے۔

۱۰۔ اقلیتوں کے مقامی گروہوں کو اپنے لوگوں کی شناخت کے لحاظ سے تحفظ کی ضرورت کی ہوتی ہے تاکہ اس گروہ کی کمزوری کو بیرونی گروہوں یا سماج کے فیصلوں تک محدود نہ کیا جائے۔

۱۱۔ اقلیتوں کو معاشی، مذہبی، سیاسی اور دیگر شعبہ جات میں مقننہ میں نمائندگی دی جائے۔

۱۲۔ اقلیتوں کو اپنے ٹیکس، صحت کی دیکھ بھال اور تعلیم کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

۱۳۔ اقلیتوں کی آواز کو یقینی بنانے پر غور کرنا چاہیے۔

۱۴۔ ہر نسلی یا قومی اقلیتوں کو اپنی مادری زبان میں تعلیم کے لیے فنڈ دیا جانا چاہیے۔

۱۵۔ عالم گیریت نے اکثر اقلیتوں کے لیے الگ شناخت اور گروہی زبان کو بر قرار رکھنے کے لیے مزید گنجائش پیدا کی ہے۔

۱۶۔ لبرل تھیوری کے اندر رواداری کی اقدار اور انفرادی خود مختاری کے مابین تعلقات پر تبادلہ خیال کا قائل ہوں۔

۱۷۔ اقلیت عام طور پر خود کو اکثریتی ثقافت کے ساتھ الگ معاشرے کے طور پر بر قرار رکھنا چاہتے ہیں اور خود مختاری کا مطالبہ کرتے ہیں۔

۱۸۔ انفرادی حقوق سماجی تعلقات کی ایک وسیع رینج کو بر قرار رکھنے کے لیے عام طور پر استعمال ہونے چاہئیں۔

۱۹۔ اقلیتوں کو خود مختاری یا علاقائی دائرہ اختیار دیا جائے تاکہ ان کی ثقافتوں کو مکمل اور آزادانہ ترقی کے لیے بہترین مفادات کو یقینی بنایا جاسکے۔

۲۰۔ اقلیتی گروہ کو مذہب کے حوالے سے اپنے رسم و رواج کو بر قرار رکھنے کے لیے اور مذہب سے آزادانہ وابستہ ہونے کے لیے مکمل طور پر آزاد ہونا چاہیے۔

۲۱۔ اقلیتوں کی وفاداری کے جذبات جو مشترکہ حب الوطنی کی عکاسی کرتے ہیں ان کی حب الوطنی کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔

۲۲۔ اقلیتی گروہ کو بنیادی معاشی حقوق، سماجی حقوق اور مذہبی حقوق کی ضمانت دے کر محفوظ کیا جانا چاہیے۔

۲۳۔ اقلیتوں کو تحریر و تقریر کی آزادی کا مکمل حق حاصل ہونا چاہیے جو عام طور پر سماج کے دوسرے شہریوں کو حاصل ہے۔

۲۴۔ مذہب کی طرح نسلی شناخت ایک ایسی چیز ہے جس کے بارے میں اقلیتوں کو اپنی نجی زندگی میں اظہار خیال کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔

۲۵۔ نسلی اور قومی اقلیتی گروہوں کے ارکان امتیازی سلوک اور تعصب سے محفوظ ہونے چاہیے۔

"ول کیملیکا" کا کہنا ہے جب تک اقلیتوں کو مندرجہ بالا تمام حقوق نہیں دیے جائیں گے تب تک ان کے مسائل حل نہیں ہوں گے۔

حوالہ جات

۱۔ Francesco capotorti, study on the rights of persons belonging to ethni religious and linguistic minorities, Newyork, USA, 1991ء p.98

۲۔ Jonanth Crownth, Oxford advanced learner dictionary, Oxford University Press England, 1999ء, p.772

۳۔ James, J. Morris, the world book encyclopedia, field Enterprises educational Corporation, Chicago, USA, 1958ء, vol.11, p.5110

۴۔ الحاج مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات اردو (مرتبہ) فیروز سنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۱

۵۔ اردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۸

۶۔ سید شمیم حسین قادری، اسلامی ریاست قرآن و سنت کی روشنی میں، علماء اکیڈمی محکمہ اوقاف پنجاب، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۱۱

۷۔ محمد ثانی، ڈاکٹر رسول اکرم اور رواداری، فضلی سنز، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۷۵

۸۔ امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی، سنن ابو داؤد شریف، (مترجم) مولانا خورشید حسن قاسمی، مکتبہ العلم، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۳۱۲

۹۔ القرآن الکریم ، محمود الحسن (مترجم)، سورۃ البقرہ، آیت ۲۵۶، شاہ فہد قرآن شریف پرنٹنگ کمپلکس ، مدینہ منورہ، ۱۹۸۹ء، ص ۵۴

۱۰۔ عمر عطااللہ قاضی، منظوم اردو مفہوم القرآن، جلد اول، ادبی سبھا پسرور، سیالکوٹ، ۲۰۰۳ء، ص ۱۸۶

۱۱۔ القرآن الکریم، محمود الحسن (مترجم)، سورۃ الکافرون، آیت ۶، ص ۸۰۵

۱۲۔ عمر عطااللہ قاضی، منظوم اردو مفہوم القرآن، جلد سوم، ادبی سبھا پسرور، سیالکوٹ، ۲۰۰۴ء، ص ۱۸۶

۱۳۔ ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ، بخاری الصحیح، بیروت،، دارالقلم، ۱۹۸۱ء، ص ۸۱

۱۴۔ القرآن الکریم، محمود الحسن (مترجم)، سورۃ النور، آیت ۲۸،۲۷، ص ۴۷۱

۱۵۔ عمر عطااللہ قاضی، منظوم اردو مفہوم القرآن، جلد دوم، سبھا پسرور، سیالکوٹ، ۲۰۰۴ء، ص۶۱۷،۶۱۶،

۱۶۔ القرآن الکریم، محمود الحسن (مترجم)، سورۃ النجم آیت ۳۹، ص ۷۰۰

۱۷۔ عمر عطااللہ قاضی، منظوم اردو مفہوم القرآن جلد سوم ص ۳۷۴

۱۸۔ القرآن الکریم، محمود الحسن (مترجم)، سورۃ بنی اسرائیل، آیت ۳۳، ص ۳۷۸

۱۹۔ عمر عطااللہ قاضی، منظوم اردو مفہوم القرآن، جلد دوم، ص ۳۲

۲۰۔ القرآن الکریم، محمود الحسن (مترجم)، سورۃ الممتحنہ، آیت ۸، ص ۷۲۹

۲۱۔ عمر عطااللہ قاضی، منظوم اردو مفہوم القرآن، جلد سوم، ص ۴۶

۲۲۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۷۹

۲۳۔ مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۳۵

۲۴۔ Will kymlicka ,Multicultural citizenship :A liberal theory of minority rights ,Oxford University Press ,Oxford New York,ء 2003, P.1

۲۵۔ Ibid p.123

۲۶۔ Ibid p.156

۲۷۔ Ibid p.157

۲۸۔ Ibid p.2

۲۹۔ Ibid p.164

۳۰۔ Ibid p.3

۳۱۔ Ibid p.131

۳۲۔ Ibid p.187

٣٣- Ibid p.34

٣٤- Ibid p.156

٣٥- Ibid p.139

باب دوم

پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے معاشی مسائل کی عکاسی

کائنات کی ہر قوم کچھ خصوصیات کی وجہ سے دوسری اقوام سے مختلف اور ممتاز ہوتی ہے۔انسان کی حیثیت سے تو ہر کسی کا مقام برابر ہے۔ لیکن زبان، نسل، مذہب، رہن سہن، لباس، خوراک اور رسوم ورواج سے قوموں کی اجتماعی زندگی کی شناخت اور طرز حیات کی نمائندگی ہوتی ہے۔پاکستان کی مخصوص اور منفرد تہذیب وثقافت ہے۔پاکستان کے چاروں صوبوں اور شمالی علاقہ جات میں مختلف مذاہب کے ثقافتی رنگ دکھائی دیتے ہیں اور ان سب رنگوں کی آمیزش سے ایک خوب صورت ثقافت کا رنگ ابھرتا ہے۔ گویا مختلف ثقافتیں ایک رنگین پھولوں کا خوب صورت گل دستہ ہیں۔ جن کی خوشبو اور رنگ اپنی مثال آپ ہیں۔ ثقافت بحیثیت مجموعی سماج کی ساری سرگرمیوں کا نام ہے۔ جو طرز حیات کی عکاسی کرتی ہے۔ پاکستان کے تمام علاقوں میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ کوئی بھی انسان تنہا زندگی نہیں گزار سکتا وہ یقیناً اپنی ضرورتوں کے لیے دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ ہر دور میں انسان دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرتا رہا ہے۔جب انسان مل کر رہتے ہیں ان کے درمیان باہمی تعلق پیدا ہوتا ہے۔اس قسم کی آبادی میں نئے نئے مسائل بھی جنم لیتے ہیں۔جہاں ایک مسئلہ حل ہوتا ہے وہاں کئی دوسرے مسائل سر اٹھا لیتے ہیں۔

مثلاً پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کی املاک پر قبضہ، جبری مشقت، سیاسی اجارہ دار طبقہ، مفلسی وبے بسی اور غربت وغیرہ۔ امریکہ میں پاکستانی مسلمان اقلیت کو مذہبی تعصب کا سامنا، جھوٹے دہشت گردی کے الزام وغیرہ اور ان کے معاشی مسائل ایسے حالات پیدا کرتے ہیں جن سے ان کی بڑی تعداد متاثر ہوتی ہے۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ چوں کہ معاشی مسائل قدرتی طور پر وجود میں آتے ہیں اس لیے ان کا حل انسان کے قابو سے باہر ہوتا ہے۔ لیکن سماج کا باشعور طبقہ ان گمراہ کن خیالات کی پرواہ نہیں کرتا بل کہ وہ اپنے فہم وادراک سے ان مسائل کو حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں اور امریکہ میں پاکستانی مسلمان اقلیتوں کے معاشی مسائل بڑھتے جا رہے ہیں۔ کسی ایک معاشی مسئلے کے ابھرنے کا کوئی ایک سبب نہیں ہوتا بل کہ کئی اسباب مل کر سماج میں مسائل کو ابھارتے ہیں۔ ایک غربت کی وجہ سے

انسان کا گھر مسائل کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ جب اقلیتوں کی بنیادی ضروریات پوری نہیں ہو پاتیں تو سماج میں مختلف نوعیت کے مسائل جنم لیتے ہیں جن کو ہم معاشی مسائل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور یہ معاشی مسائل تب جنم لیتے ہیں جب سماج کے رائج کردہ قوانین سے انحراف کیا جاتا ہے۔ اس لیے ان کا بروقت سدباب ضروری ہے۔ ہمیں پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں اور امریکہ میں مسلمان اقلیتوں کے معاملے میں اعلی ظرفی، عقائد میں وسعت و پختگی، اخلاقی رواداری اور بے تعصبی جیسے اعلیٰ اوصاف پیدا کرنے چاہیئں ۔ بے جا مذہبی عصبیت کے احساسات ختم کرنے چاہیئں۔ ان کے لیے برداشت اور عمل کے جذبات پیدا کرنے چاہیئں۔ کیوں کہ یہ تمام وہ بیج ہیں جن سے سماج میں یکجہتی کے پرامن شجر کو تقویت ملتی ہے۔

مفلسی و بے بسی اور غربت کی انتہا

عصر حاضر میں زندگی کے ہر شعبے میں سرعت کے ساتھ ترقی ہوئی ہے۔ اور اسی تناسب سے زندگی کے مسائل بڑھے ہیں۔ ضروریات زندگی کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت بھی وسائل کی کمی کا شکار ہیں۔ وہ پس ماندگی، مفلسی و بے بسی اور زبوں حالی میں مبتلا ہیں۔ ان کے پاس وسائل کی کمی اور مسائل کی زیادتی ہے ۔ انھیں ناخواندگی، غربت و افلاس، معاشی عدم استحکام اور وسائل کا فقدان جیسے مسائل کا سامنا ہے۔ ان کی اکثریت ناخواندہ اور غربت و افلاس کی ماری ہے۔ جس کی وجہ سے انھیں مشکلات کا سامنا ہے۔ مفلسی و بے بسی اپنے سامنے کوئی بھی چراغ جلنے نہیں دیتی۔ اگر انسان کا دل ناخوش ہو تو کوئی بھی خوب صورت رنگ اور دل فریب منظر اسے نہیں بھاتا۔ اسے اپنی زندگی میں کوئی تندرستی اور کوئی توانائی محسوس نہیں ہوتی۔ مفلسی و بے بسی کی جڑیں جہاں پیوست ہو جائیں تو مشکل سے جان چھوڑتی ہیں۔ تمام خوشیاں مفلسی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ روشنی کی ننھی سی کرن بھی دکھائی نہیں دیتی۔ امید کا دامن خالی رہ جاتا ہے۔ جینے کی امنگ ختم ہو جاتی ہے۔ مایوسی اور نامرادی ڈیرے جما لیتی ہیں۔ بدترین حالات میں بھی جینا پڑتا ہے۔ اداسی قدم قدم پر ساتھ رہتی ہے۔ بہتر روزگار حاصل کرنے کے لیے کوئی ایسی کھڑکی نظر نہیں آتی جس سے مفلسی دور ہونے کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا آئے بل کہ ہمہ وقت وحشت زدہ آندھی آنے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ مفلسی مسکراتے چہروں پر گرد کی تہ جما دیتی ہے۔ پھول سے دمکتے چہرے مرجھا جاتے ہیں۔ دکھ، محرومیاں، ناکامیاں اور بدنصیبی جیسے مسائل جان سے چپک جاتے ہیں۔ جب پادری جی یسوع کی تان لگاتے تھے تو کچی آبادی والے غریب عیسائی اقلیت جنھیں پادری جی خصوصی طور پر کیک کھلانے کے لیے بلاتے تھے۔ تو وہ کیک دیکھ کر

عقیدت سے اور جھکتے جاتے تھے لیکن اس کرسمس کیک پر بھی مسلسل نظر رکھتے تھے جو ان کے درمیان رکھا ہوتا تھا۔ اور اس کی مٹھاس اور کریم کی خوشبو ان کی سانسوں کے ذریعے حلق سے اترتی جاتی تھی۔ اور وہ شدید خواہش رکھتے تھے کہ پادری جی کرسمس کا گیت جلدی جلدی ختم کریں تاکہ وہ کیک کھا سکیں۔" مستنصر حسین تارڑ" کا ناول "راکھ" سنگ میل پبلی کیشنز نے ۱۹۹۷ء میں لاہور سے شائع کیا۔ ناول کا نام قران پاک کی "سورہ ابراہیم" کی آیت نمبر ۱۸ سے مستعار لیا ہے۔ یہ سورت پارہ نمبر ۱۳ میں ہے۔ ناول کے پہلے صفحے پر آیت نمبر ۱۸ معہ اردو ترجمہ درج ہے۔ اس کے بعد لاہور شہر کی مناسبت سے مجید امجد کی نظم "لاہور" کا پہلا بند بھی لکھا ہوا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے ناول "راکھ" سے اقتباس دیکھیے:

> "کیک کو احتیاط سے کاٹا۔ ایک مختصر دعا کی اور ہاتھ لہرا کر منتظر آنکھوں سے پلیز کہا۔ اس پلیز کہنے پر نزدیکی کچی آبادی کے غریب غربا عیسائی مکین جنھیں عام غریب غربا پاکستانی بھی پاس نہیں بیٹھنے دیتا تھا کیوں کہ اس کے نزدیک وہ پاک صاف تھا اور وہ چوڑے تھے۔۔۔ کرسمس کیک پر باقاعدہ پل پڑے۔ ایک خاکروب، ایک چوڑا جس کے نزدیک سے گزرتے ہوئے پارسا ذرا لچک کر گزرتے تھے کہ اس کے لباس کا کوئی حصہ انھیں چھو نہ جائے اور تادیر دیکھتے نہ تھے کہ نظریں پلید نہ ہو جائیں۔ اتنی عزت اور اتنے احترام والا شخص اگر کسی صاف ستھرے ڈرائنگ روم میں مدعو ہو اور اسے وہ کیک کھانے کا چانس بھی نصیب ہو جسے وہ جھاڑو دیتا ہوا راحت بیکری کے شوکیس میں دیکھ سکتا تھا اور اگر بالفرض محال اس کی جیب میں اتنی رقم جمع ہو جاوے کہ وہ کیک کھاوے تو کس طرح کھاوے۔ اسے تو بیکری میں کوئی گھسنے نہ دیوے۔"[1]

مفلسی انسان کی زندگی کا رخ ایسے تبدیل کرتی ہے کہ وہ خود اپنی زندگی کا تماشائی بن جاتا ہے۔ جو اس کی سب سے بڑی مجبوری اور بے بسی ہوتی ہے۔ عیسائی اقلیت جو کچی آبادی میں رہتے ہیں ان کی حالت زار دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ وہ بمشکل ایک وقت کی روٹی پوری کرتے ہیں۔ اس طرح کی شاہ خرچیاں، کیک کھانا وغیرہ وہ تو افورڈ نہیں کر سکتے۔ وہ جو ان کا پادری تھا راڈنی۔ اسے ان کا بہت احساس تھا لہذا جب بھی کوئی تقریب ہوتی جس میں کھانے پینے کی کوئی چیز رکھی جاتی تو وہ کچی آبادی کے لوگوں کو ضرور بلاتا تاکہ وہ کھائیں۔ اور اسے سکون اور خوشی محسوس ہوتی تھی۔

دوسرے لوگ غریبوں کی مجبوری اور بے بسی کو جانے بغیر ان کی زندگی کے اندھیروں کو محسوس کیے بغیر ان سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں کیوں کہ غریب کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ سب اسے حقیر مخلوق سمجھتے ہیں۔ مفلسی انسان کی زندگی کا سارا سکھ اور ہنسنا کھیلنا ختم کر دیتی ہے۔ اس کی روح تک بھی بے حس اور پریشان ہو جاتی ہے۔ مفلسی اس کی زندگی کے خوشیوں بھرے لمحوں کو بھی خزاں کے موسم میں تبدیل کر دیتی ہے۔ مفلس آدمی کو رنگین اور روشن نظاروں سے وحشت محسوس ہوتی ہے۔ مفلسی اپنی آگ میں اسے جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ انسانی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ تہذیب کے ہر دور میں انسان طبقات میں بٹا رہا ہے۔ جس میں مفلسی و بدحالی، لاقانونیت کرنے والے لوگ اپنے اپنے طبقوں میں الگ الگ رہتے ہیں۔ یہ طبقاتی تقسیم ایک شکنجہ ہے جس کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے۔ ان دائروں سے نکل کر دوسرے دائروں میں شامل ہونا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لہذا امیر، امیر تر اور مفلس، مفلس تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ طبقاتی تقسیم نسل در نسل چلتی رہتی ہے۔ پاکستانی عیسائی اقلیت مفلسی میں زندگی جی رہے ہیں اور ان کی تعداد میں کمی ہونے کے بجائے دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اقلیتی نوجوانوں کی ایک واضح اکثریت بے روزگار ہے ۔ بہتر روزگار حاصل کرنے اور معاشی وسائل کو بڑھانے کی خواہش ہونے کے باوجود وہ مفلسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ "ڈاکٹر مبارک علی" لکھتے ہیں:

> "اگر افراد معاشی طور پر آزاد ہوں، خود کفیل ہوں، اور کسی کے محتاج نہ ہوں، تو اس صورت میں وہ ضرورت کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے۔ لیکن اگر وہ غربت اور مفلسی کے عالم میں ہوں، تو اس صورت میں زندہ رہنے کے لیے حمیت و غیرت ختم ہو جاتی ہے۔ اور لوگ مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ امیروں کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔"(۲)

مفلس آدمی معاشی طور پر برباد ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی مفلسی کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ قرض لینے اور گھر کی ضرور ی اشیاء بیچنے کی نوبت آ جاتی ہے۔ ایسے لوگ معاشی طور پر مفلوک الحال ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی و معاشی سطح پر بھی اپنی اہمیت کھو بیٹھتے ہیں۔ مفلسی جیسے زہریلے مرض کی وجہ سے خاندان، سماج اور تہذیب سے انھیں دور کا واسطہ بھی نہیں رہتا اور ان کی ساری زندگی اور شخصیت کھوکھلی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ان پاکستانی اقلیتوں کے لیے ملازمتوں کی گنجائش بھی بہت محدود ہے۔ کمر توڑ

مہنگائی کی وجہ سے بے روزگار آدمی کا دو وقت کی روٹی حاصل کرنا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی نے ان لوگوں کی زندگی اجیرن اور نیندیں حرام کر دی ہیں۔ مفلس آدمی بہت حساس طبیعت کا مالک بن جاتا ہے۔ غمگین اور دکھ بھری صورت حال اسے چڑچڑے پن کا شکار کر دیتی ہے۔ دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانپنے کے لباس کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں دل کی ساری رعنائی اور رنگینی پس پشت چلی جاتی ہے۔ لہٰذا مفلسی ایک فوری غور و فکر اور مؤثر حل کا متقاضی مسئلہ ہے۔ کمزور معاشی حالات پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کے بچوں کو بھی تعلیم اور دیگر بنیادی ضروریات زندگی سے دور کم سنی میں مشقت کی راہ پر گامزن کر دیتے ہیں۔ کم عمری میں محنت و مزدوری کی بڑی وجہ کنبے کی معاشی حالت سدھارنا ہے۔ دنیا کے بیشتر مسائل کی جڑ مفلسی ہے۔ جس کا نشانہ بچے بھی ہیں۔ دائمی مفلسی والدین کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے بچوں سے بھی محنت مزدوری کروائیں تاکہ گھریلو آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔ مفلسی، قرض کی ادائیگی، معاشی تنگ دستی ایسے مسائل ہیں جو اقلیتی بچوں کو بدترین مشقت کی صورت حال میں کام کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ ایک تہائی مشقت کرنے والے بچے ناخواندہ ہیں۔ بچوں سے نسبتاً کم یومیہ مزدوری پر منافع حاصل کیا جاتا ہے۔ کچھ اقلیت اپنے قرض کی ادائیگی وقت پر نہ کر سکنے کی وجہ سے اپنے بچے بھی گروی رکھوا دیتے ہیں اور وہ بچہ تب تک مالک کے پاس کام کرتا رہتا ہے جب تک والدین قرض نہ چکا دیں۔ اور کچھ اپنے بچوں کو صرف چند ہزار کی خاطر اس لیے بیچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کچھ دن راحت کے گزر جائیں۔ اس حوالے سے ناول "راکھ" سے اقتباس دیکھیے۔:

> "پہلے تو صاحب جی بڑی تنگی تھی تو ان دنوں میرے بڑے نے۔۔۔ مجبوری تھی جی۔ اسے قالینوں والوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ تو یہ ادھر کام کرنے لگا۔ پھر قانون آ گیا کہ زبردستی کی مجوری جائز نہیں تو یہ آزاد ہو گیا۔ آپ اگر اجازت دیں تو میں کچھ کہوں پھوپھا۔۔۔ میں وہاں صبح آٹھ بجے سے رات کے دس بجے تک ناٹس باندھتا تھا اور وہ مجھے کھانے میں صرف دال روٹی دیتے تھے۔"(۳)

انسانی خرید و فروخت کی بڑی وجہ مفلسی ہے۔ انسانی خرید و فروخت میں بچوں کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ جن کو مختلف مقاصد کے لیے دنیا کے مختلف حصوں میں بھیجا جاتا ہے۔ انسان کی معاشی ضروریات پوری نہیں ہو پاتیں تو وہ بعض اوقات اپنے جگر کے ٹکڑوں کو بھی فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مفلسی ہر طرح کے جرائم کا ارتکاب کرواتی ہے۔ بچے جو کسی بھی ملک کا سرمایہ ہوتے ہیں جب حالات سے مجبور ہو کر محنت

مشقت کرنے لگتے ہیں تو یقیناً یہ سماج کے لیے ایک المیہ ہوتا ہے۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ سماج کو نامساعد حالات سے دوچار کرتا ہے۔ پاکستان میں معاشی بدحالی، سہولیات سے محرومی، غربت و بے روزگاری جیسے مسائل نے بچوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اس کے خاتمے کے لیے اقدامات ہی اس صورت حال سے نکلنے کا واحد ذریعہ ہیں۔ لہذا ایسے قوانین وضع کیے جائیں اور ایسی پالیسیاں بنائی جائیں جن کے تحت ایک خاص عمر سے کم عمر بچوں سے کام نہ کروایا جائے اور ان کے گھر والوں کو کچھ رقم دے دی جائے۔ اور جو بچے کام کر رہے ہیں ان کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے۔ ایسی مشقت جس میں بچوں کی زندگی کو خطرہ ہو یا ان کی ذہنی و جسمانی نشو نما کے لیے نقصان دہ ہو ان پر مکمل پابندی ہونی چاہیے۔ ایسے معاشی منصوبے بنانے کی ضرورت ہے جو کہ ان کے خاندانوں کے ذرائع روزگار میں معاون ثابت ہوں اور پاکستانی اقلیتی بچوں سے ایسے کام نہ کروائیں۔ ایسے تمام قوانین کو ذرائع ابلاغ کے ذریعے اجاگر کرنا چاہیے۔ تمام پاکستانی ان قوانین سے واقف ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان بچوں کو ایسا ماحول مہیا ہونا چاہیے جہاں ان کے بنیادی حقوق کو یقینی بنایا جائے اور مزید یہ کہ وہ تعلیم کی سہولت سے بھی مستفید ہو سکیں۔

تعلیمی نظام ایسا ہو جو رائج تعلیم سے ہٹ کر ان بچوں کی ضروریات اور ماحول کو مد نظر رکھتے ہوئے ترتیب دیا جائے تا کہ یہ بچے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں اور مستقبل کے مفید اور کار آمد شہری بن سکیں۔ جنید قیصر "پاکستانی اقلیتوں کا نوحہ" میں یوں رقم طراز ہیں:

> "عملی اعتبار سے پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کی صورتحال، گزشتہ چھ عشروں سے تمام شعبوں میں انتہائی تشویشناک رہی ہے اور قانونی آئینی حقوق کی فراہمی اور سماجی انصاف کے حوالے سے ہماری حکومتوں کا ٹریک ریکارڈ انتہائی خراب رہا ہے۔ حکومتوں نے مذہبی اقلیتوں کا تحفظ کرنے کے بجائے ایسے قوانین متعارف کروائے جو تعصبات اور امتیازات پر مبنی تھے۔"(۴)

مفلسی کی وجہ سے انسان کا دل دنیا کی ہر چیز سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے وہ جتنی بھی کوشش کرے نتائج خوش گوار نہیں نکلیں گے۔ مفلسی کا یہ چکر نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ یہ اسی طرح نسلی و لسانی اور مذہبی انتہا پسندی کا شکار ہو رہے ہیں۔ مفلسی کی وجہ سے اقلیتوں کو شہروں میں رہائشی سہولیات کا حصول انتہائی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اس وقت مختلف شہروں میں رہنے والے عیسائی اقلیت کی اکثریت کچی

آبادیوں میں زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ سندھ اور پنجاب کے دیہاتوں میں بہت سے عیسائی اقلیت کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ مویشیوں کی دیکھ بھال کر کے پیٹ کا دوزخ بھرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ جب کہ شہروں میں یہ لوگ اینٹیں بنانے والے بھٹوں اور لوگوں کے گھروں میں کام کاج کر کے خاندان کا نظام چلاتے ہیں۔ پھر بھی دو وقت کی روٹی بڑی مشکل سے میسر آتی ہے۔ نامناسب غذائی صورت حال اور معاشی زندگی کی سہولیات کی کمی کا شکار ہیں۔ بل کہ ہر طرح کی سہولیات کا فقدان ہے۔ مثلاً رہائش کا مسئلہ، صحت کی سہولیات، صاف پینے کا پانی، خوراک، بے روزگاری، گھروں کی تنگی و تاریکی اور مفلسی وغیرہ۔ مفلسی ایک ایسی حالت کا نام ہے جس میں افراد معاشی انحطاط کا شکار ہوتے ہیں اور اپنی بنیادی ضروریات زندگی کو مشکل سے پورا کرتے ہیں۔ مفلسی کی وجہ سے انسان کی زندگی تلخیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ گھریلو ماحول میں کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور ہمدردی کی فضا ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسے ہر طرف گمبھیر اندھیرے نظر آتے ہیں۔ وہ سوجھ بوجھ سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور بر وقت کوئی بھی فیصلہ کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی زندگی ہر پہلو سے متاثر ہوتی ہے۔ شوکت صدیقی کا دوسرا مقبول ناول " جانگلوس "ہے۔" جانگلوس" شوکت صدیقی کی لفظی اختراع ہے۔ لفظ جانگلو کے آگے شوکت صدیقی نے "س" لگا کر "جانگلوس" بنالیا۔ یہ ناول تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ ناول شکیل عادل زادہ کی ادارت میں شائع ہونے والے ڈائجسٹ "سب رنگ" میں قسط وار شائع ہوتا تھا۔ اس ناول کی کل ۵۴ اقساط ہیں۔ بعد میں اسے کتابی صورت دے دی گئی۔" جانگلوس" کو پنجاب کی الف لیلی بھی کہا جاتا ہے۔ اس ناول کو لکھنے کے لیے شوکت صدیقی نے پنجابی اور سرائیکی زبان سیکھی۔ شوکت صدیقی کے ناول" جانگلوس" (جلد سوم) سے اقتباس دیکھیے:

> " مریم نے اس کے تمتمائے ہوئے چہرے اور تیوری پر پڑنے والے بل دیکھے تو دم بخود رہ گئی۔ نرم لہجے میں دریافت کیا۔ دہاڑی مل گئی؟
>
> ہاں !عنایت نے تلخی سے جواب دیا اور ہاتھ میں دبی ہوئی ڈھائی روپے کی رقم حقارت سے اس کے سامنے پھینک دی۔ لے یہ رہی دہاڑی۔۔۔
>
> پر اب گزارا کیسے ہو گا؟ پورا ہفتہ کیسے کٹے گا؟ وہ دل گرفتہ ہو کر اپنی پریشانی بیان کرنے لگی۔ روٹی نہیں ملے گی تو نکے کو دودھ کیسے پلاؤں گی۔ بچے نے اچانک رونا شروع کر دیا۔ بھوک سے رو رہا تھا۔

وہ غصے سے چیخا۔ ایسا کر اس کا گلا گھونٹ دے۔ بچہ اس کی اونچی آوازیں سن کر اور زور زور سے رونے لگا۔۔۔ میں خود ہی اس کا گلا دبائے دیتا ہوں۔ وہ تڑپ کر بچے کی جانب بڑھا۔ مریم جھپاک سے اٹھی اور عنایت کے سامنے کھڑی ہو گئی۔"(۵)

عنایت مسیح مفلسی اور بھٹہ مالکان کے ظالمانہ رویوں سے بہت تنگ آ چکا تھا۔ پورا ہفتہ رات دن سخت محنت کرنے کے بعد بھی صرف ڈھائی روپے کی رقم ملی تھی۔ جسے دیکھ کر وہ حواس کھو بیٹھا تھا۔ کیوں کہ اسے شدید غصہ اس بات کا تھا کہ اس کی بیوی نے بچہ پیدا کرنے کے بعد یعنی دوسرے دن تکلیف دہ حالت میں بھی چھٹی کے بجائے رات دن اس کے ساتھ مل کر محنت کی تا کہ اتنی رقم مل جائے جس سے وہ دو وقت کی روٹی کھا سکیں۔ مگر یہاں تو ناانصافی کی انتہا تھی۔ اس رقم سے تو زہر بھی خریدا نہیں جا سکتا تھا پورا ہفتہ ایک وقت کی روٹی کیسے نصیب ہوتی۔ اس نے احتجاج کیا تھا لیکن منشی کے غنڈوں نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ شدید غصے کی حالت میں جب وہ اپنی بوسیدہ سی جھونپڑی میں داخل ہوا تو اپنی چار سال کی معصوم بیٹی شیماں کو دیکھا جو بھوکی، پیاسی دروازے کے باہر کھانے کا انتظار کرتے کرتے وہی سو گئی تھی تو اس کا دل پھٹ گیا۔ اور ساتھ ہی اس کے نوازائیدہ بچے کے بھوک کی وجہ سے رونے کی آوازیں بھی آنا شروع ہو گئیں۔ تو بے بسی کے عالم میں وہ اسے مارنے کی کوشش کرنے لگا۔

ہمت شکن حالات زندگی کے ہر موڑ پر نظروں کے سامنے گھومتے رہتے ہیں۔ حالات کی مسلسل ناسازگاری انسان کو زندہ درگور کر دیتی ہے۔ مفلسی ایک ایسی سماجی کمزوری ہے جس نے افراد کی زندگی کا پہیہ جام کیا ہوا ہے۔ جن لوگوں کو دولت کی فراوانی ہے۔ انھیں تو مفلسی کی ہوا تک نہیں لگی ہوتی تو وہ اس اذیت کو محسوس بھی نہیں کر سکتے۔

مفلسی بہت ظالم ہے۔ یہ اپنے ساتھ سوگواری اور مایوسی کو بھی لے کر آتی ہے۔ جس کی وجہ سے زندگی ایک بوجھ محسوس ہونے لگتی ہے۔ ناسازگار حالات انسان کو فکر میں مبتلا رکھتے ہیں۔ ہر طرف بے کیفی اور بے رنگی محسوس ہوتی ہے۔ مستقبل کیسے گزرے گا یہ خوف چوبیس گھنٹے سر پر سوار رہتا ہے۔ اپنے گھر والوں کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش اور آرزو پوری نہ کر سکنے پر مفلس انسان کا دل اندر سے روتا رہتا ہے۔ لیکن اپنے آنسو آنکھوں تک نہیں آنے دیتا۔ انسان کو حل نہ ہونے والے مسائل اور آسودگی سے محروم خیالات پریشان رکھتے ہیں۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ اپنا گریبان چاک کر کے جنگل کی طرف نکل جائے۔ اندر کی بے

چینی بڑھتی جاتی ہے۔نہ صرف موجودہ زندگی تکالیف سے بھری ہوتی ہے بل کہ آنے والا وقت بھی تشویش ناک نظر آتا ہے۔ یہ نہیں سمجھ آتا کہ اس مفلسی سے نجات کیسے حاصل کی جائے۔انسانی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب انسان غم کے احساس سے خود کو بوجھل محسوس کرتا ہے۔اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ایسا غم خوار مل جائے جو اس کے زخموں پر مرہم رکھے اس کا سہارا بنے۔ مگر جن قریبی احباب سے ہمدردی کی توقع ہوتی ہے اگر وہ بھی اس ناگفتہ بہ حالت سے گزر رہے ہوں تو غم کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کہ اس کی پریشانیوں اور دکھوں کا مداوا بننے والے در حقیقت خود بھی اس اذیت ناک کیفیت سے گزر رہے ہیں۔ پاکستانی عیسائی اقلیتوں کے لیے سماج میں ایسا ماحول پیدا کیا جائے جو ان کی ذہنی آسودگی اور اطمینان کا باعث ہو۔ وقتاً فوقتاً ایسے اقدامات کیے جائیں جن میں اقلیت اپنے مسائل پیش کر سکیں۔ اور ان مسائل کو حل کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ اس کے علاوہ اقلیت اور اکثریت میں کوئی بدگمانی یا غلط فہمی پیدا ہو جائے تو اس کو بھی رفع کیا جائے۔ ایسے قوانین وضع کیے جائیں جن کے ذریعے انھیں تحفظ حاصل ہو۔ جنید قیصر اپنی کتاب "پاکستانی اقلیتوں کا نوحہ" میں لکھتے ہیں:

> " ایک امن پسند، اعتدال اور انصاف پر مبنی جدید خوشحال معاشرے کے لیے جمہوریت لازمی شرط ہے۔ جمہوریت روح عصر ہے۔ جو ناانصافی، عدم رواداری، جنگ اور استحصال سے نجات دلاتی ہے۔ رواداری، امن اور حقوق کی بازیابی کے لیے جمہوری لبرل اصولوں کو اپنانا بہت ضروری ہے۔ جمہوریت کے بغیر انسانوں کو ان کے معاشی، سیاسی، شہری اور ثقافتی حقوق نہیں مل سکتے۔ جمہوریت کے تسلسل اور استحکام سے اکثریت کے لیے یہ ممکن نہ ہو گا کہ وہ اقلیتوں کے حقوق سے انکار کرتے ہوئے انہیں سلب کر سکیں۔ حقوق کا فارمولا یہ ہوتا ہے کہ جب انسانوں کو ان کے شہری اور سیاسی حقوق مل جاتے ہیں، تو اس کے بعد ان کو ثقافتی، مذہبی، لسانی غرض تمام طرح کے حقوق خود بخود مل جاتے ہیں۔ آج یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی جمہوری ملک میں حکومت نہ تو مذہبی اقلیتوں کے ووٹ کے بغیر بن سکتی ہے اور نہ ہی ان کے بغیر چل سکتی ہے۔"(۶)

انسان کی زندگی اگر سکھ اور چین سے گزرے تو اس کی شخصیت میں ایک طرح کا الگ ہی نکھار خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اخلاق و آداب اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ دکھ اور مایوسی پیدا ہونے کا کوئی

امکان نہیں ہوتا۔ اسے ہر طرح کا ذہنی سکون میسر ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ مفلسی کی زندگی گزار رہا ہے تو اس کا ذہنی سکون مکمل ختم ہو جاتا ہے۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ سماجی زندگی میں تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ لوگوں کے رہن سہن، اقدار، رویوں ، نظریات، مہارتوں اور پیشوں میں تغیرات ہو رہے ہیں ۔ ٹیکنالوجی میں نئے خیالات پیش کیے جا رہے ہیں۔ آسانی اور سہولتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی مفلسی کی زندگی بسر کر رہا ہے تو نہایت ہی افسوس کا مقام ہے۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے انسان بہت سی نفسیاتی الجھنوں اور بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

مفلس آدمی کی سوچ منفی ہو جاتی ہے۔ وہ ڈرپوک اور بزدل ہو جاتا ہے۔ خود اعتمادی جاتی رہتی ہے۔ یہ تمام مسائل مل کر اسے نیم پاگل بنا دیتے ہیں۔ ہمیں پاکستانی عیسائی اقلیتوں کی مفلسی کے اس حصار کو توڑ کر ان کے حال اور مستقبل کو بچانے کے لیے بحیثیت قوم اور انفرادی طور پر ایک ایک فرد کو کام کرنا ہو گا۔ تا کہ اس تکلیف دہ حالت سے انھیں نجات دلائی جا سکے۔ کیوں کہ عیسائی اقلیتوں کی بھاری اکثریت غربت، جہالت ، بیماری اور مفلسی کے گھناؤنے سائے میں زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حالات کی ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے قرضوں کی زنجیریں بھی لمبی ہوتی جا رہی ہیں۔ سخت مشقت کرنے کے باوجود سارے پیسے قرضے کا کہہ کر کاٹ لیے جاتے ہیں اور محنت کے آدھے پیسے بھی نہیں دیے جاتے۔ بل کہ وہ قرض ان کے لیے وبالِ جان بن جاتا ہے۔ ساری زندگی قرض کے پیسے دیتے ہیں مگر ان ظالموں نے جان بوجھ کر یہ کھیل رچایا ہوا ہے کہ قرضہ ختم نہیں ہوا۔ اور انھیں اس غلامی سے نجات کی راہیں کھلنے کا کوئی سبب نظر نہیں آتا۔ بعض اوقات حالات اس نہج پر آ جاتے ہیں کہ انسان مفلسی سے جتنا بھاگتا ہے وہ اسی قدر شدت سے اس کا تعاقب کرتی ہے۔ شوکت صدیقی کے ناول "جانگلوس" (جلد سوم) سے اقتباس دیکھیے:

> "اس نے غصے سے چیخ کر عنایت سے کہا۔ تو نکے کا گلا دبا دے۔ ضرور دبا دے۔ پر یہ بھی سوچ لے، اس کے کفن دفن کو کوئی ادھار نہیں دے گا۔ نہ منشی دے گا اور نہ مالک۔
>
> عنایت مسیح سر جھکائے گم سم بیٹھا رہا۔ مریم کی آواز ابھرتی رہی۔ تجھے پتہ ہے پچھلے جاڑے میں واحد کے پتر کا مرن ہوا تھا تو کیا ہوا تھا۔ واحد منشی کے پاس گیا۔ میاں صاحب کے پاس بار بار گیا۔ منت کی، زاری کی۔ پر اس نے صاف انکار کر دیا۔ کہا جب تک پیشگی ادا نہیں ہو گی کوئی ادھار نہیں ملے گا۔۔۔ تین روز تک لاش پڑی رہی۔ جب

> بہت زیادہ بو اٹھنے لگی تو ڈوگر آ کر واحد پر سخت گرم ہوا۔ گالاں نکالیں۔ چھتر تھام کار بار بار اسے مارنے کو جھپٹا۔ مریم بتاتی رہی۔ واحد نے شام تک کفن دفن کا وعدہ کیا۔ تب ڈوگر نے اسے چھوڑا۔ واحد ایک ایک کے آگے ہاتھ پھیلا تا تھا۔ کسی نے کچھ دیا، کسی نے انکار کر دیا۔ پر پورے سات روپے بھی اکٹھے نہ ہوئے۔ اس میں تو کفن بھی نہ آ سکتا تھا۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ کئی دفعہ ہو چکا ہے۔"(۷)

عنایت کی بیوی نے جب شوہر کو بے بسی کے بعد غصے سے بے قابو ہوتے دیکھا تو فوراً اسے یاد دلانا شروع کر دیا کہ اگر بچے کو مارو گے تو اس کے دفنانے کے لیے پیسے کہاں سے لاؤ گے۔ انھی کے ساتھ کا ایک اور غریب اور مفلسی کے ہاتھوں مارے واحد کے بیٹے جب انتقال ہو گیا تو اس کے پاس کفن کے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے تین دن تک لاش گھر میں پڑی رہی یہاں تک کہ اس سے بو آنا شروع ہو گئی۔ حالات سے تنگ آ کر انسان پھر اس قسم کے کام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جان بوجھ کر کوئی بھی ذی شعور آدمی اپنے لخت جگر کو مارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ لیکن ستم رسیدہ حالات میں انسان ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آتی کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

وہ ایک ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ لوگ سارا سارا دن جھلسا دینے والی دھوپ میں محنت و مشقت کر کے دو وقت کی روٹی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر بااثر اور دل کی جگہ پتھر رکھنے والے مالکان ان کی دیہاڑی بھی پوری نہیں دیتے۔ جس کی وجہ سے وہ فاقوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ انھیں زندگی کی کوئی بھی بنیادی سہولت میسر نہیں ہوتی۔ انھیں زندگی کا مقصد سمجھ نہیں آ رہا۔ اور وہ مفلسی کے گہرے اندھیروں میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔ انھیں متوازن غذا نہیں ملتی جس کے نتیجے میں وہ بیمار، لاغر اور ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جاتے ہیں۔ سارا سارا دن محنت کر کے زندگی کی گاڑی گھسیٹنے کی ناکام کوشش کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ یہ بھی تہہ دل سے چاہتے ہیں کہ کسی بھی طرح ہمیشہ کے لیے اس مفلسی سے جان چھوٹ جائے۔ اور وہ بھی مایوسی کی اس گہری دلدل سے باہر نکلیں۔ لیکن کوئی تدبیر کارگر ثابت ہوتی نظر نہیں آتی۔

ناکامی ان کا منہ چڑاتی ہے۔ ان کے حالات روز بروز بگڑتے چلے جا رہے ہیں۔ اور صورت حال بہتر ہونے کے بجائے خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے۔ یعنی معمولی سی معمولی چیز کے لیے دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ملک میں بڑھتی ہوئی مہنگائی سے اشیا کا ملنا دشوار ہو رہا ہے۔ پھر بحالت مجبوری انھیں بے راہ روی

اپنانی پڑتی ہے۔ ان کی زیادہ تعداد عموماً ان پڑھ ہوتی ہے اور ہر میدان میں کوئی بھی مہارت نہیں رکھتے۔ اور پھر اقلیت ہونا بھی ان کے لیے عذاب کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر انھیں چھوٹی موٹی ملازمت مل بھی جائے اور ان کے معاشی مسائل کسی حد تک حل ہو بھی جائیں تو بھی وہ عدم مطابقت کے سبب ذہنی مریض بن جاتے ہیں۔ "سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں" میں اس معاملے پر یوں خامہ فرسائی کی گئی ہے:

> "اس وقت اس بات پر اصرار کی ضرورت ہے کہ آئین اپنے شہریوں کو جو بنیادی حقوق دیتا ہے، اقلیتیں اس سے محروم نہ رہیں۔ انھیں جان و مال کا پورا تحفظ دیا جائے اور روز مرہ معاملات میں انھیں کسی امتیاز کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"(۸)

پاکستانی عیسائی اقلیت محنت مشقت کرنے میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو محنت کش طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور نہ ہی زبان پر شکوہ شکایت لاتے ہیں۔ یہ ایک قدرتی عمل ہے کہ جہاں انسان رہتا ہے اس جگہ، اس گھر سے، اسے محبت اور انس کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے پھر گھر سے شروع ہونے والا محبت کا یہ جذبہ پھیل کر وطنی محبت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ہر انسان خواہ وہ اقلیت ہی کیوں نہ ہو اپنے وطن کے لیے محبت کے جذبات رکھتا ہے۔ وطن سے محبت وعقیدت کی وجہ سے وہ ہر طرح کی مشکلات برداشت کر لیتا ہے۔ اور یہی عظمت اور خوب صورتی پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کی بھی ہے۔ کہ وہ وطن عزیز سے بہت عقیدت رکھتے ہیں تمام مسائل کے باوجود۔ کیوں کہ یہ ملک ایک خوب صورت پھولوں کی کیاری کی طرح ہے۔ جس میں اقلیت اور اکثریت کی ثقافتوں کے رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے ہیں۔

تن درستی کے لیے جسم اور دماغ کو مکمل آرام اور سکون کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ آرام کے دوران قوت کا ذخیرہ جمع ہوتا ہے۔ جو ضرورت کے وقت کام آتا ہے۔ اور بہترین آرام نیند کی حالت میں میسر آتا ہے۔ انسان قوت اور تازگی محسوس کرتا ہے۔ جب کہ گہری نیند کے لیے سکون بہت ضروری ہے لیکن تفکرات، غم اور پریشانی سے نیند کوسوں دور ہو جاتی ہے۔ جب ولیم کو اس کی نو لکھی کوٹھی سے جبراً بے دخل کیا جا رہا تھا تو وہاں کا علاقہ مجسٹریٹ اپنے ساتھ پولیس بھی لے کر آیا تھا۔ کہ شاید ولیم کو زبردستی باہر نکالنا پڑے۔ مگر ولیم نے کوئی شور شرابہ نہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا اس ملک میں کوئی رشتہ دار موجود نہیں تھا جو اس کی مدد کو آتا۔ اور خود وہ بوڑھا، کمزور، اور لاغر ہو چکا تھا۔ لہذا اس نے خاموشی سے ہی چلے جانا ہی بہتر سمجھا۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھا کہ کوئی بھی مزاحمت اب کام آنے والی نہیں۔ وہ اس مشکل کے وقت اور

ناساز گار حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت اب نہیں رکھتا تھا۔ علی اکبر ناطق کا ناول "نو لکھی کو ٹھی" ۲۰۱۲ء میں سانجھ پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔ ناول کا نام "نو لکھی کو ٹھی" اس کو ٹھی کی نسبت سے رکھا ہے۔ جو اوکاڑا میں موجود ہے۔ اس کو ٹھی کی تعمیر میں نو لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔ اس لیے اس کا نام "نو لکھی کو ٹھی" ہے۔ ناول کے ۵۶ باب ہیں۔ علی اکبر ناطق کے ناول "نو لکھی کو ٹھی" سے اقتباس دیکھیے:

"آپ دیکھ رہے ہیں، میں اتنا بوڑھا ہو گیا ہوں کہ اس لکڑی کے بغیر چلنے میں میرے گھٹنے درد کرتے ہیں۔ کاندھے پر چادر پھیلانے کے لیے ہاتھ اٹھاؤں تو بازوں کے سرے کانپ اٹھتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اس ملک میں اتنا اجنبی ہوں کہ میری پرسش کو اس وقت ایک چیونٹی تک نہیں آئے گی۔ پھر آپ یہ پولیس کس لیے لائے ہیں؟ مجسٹریٹ ولیم کے اس چبھتے ہوئے سوال پر لرز کر رہ گیا۔"(۹)

بے بس اور اکیلے آدمی کا کوئی دوست اور غم خوار نہیں ہوتا۔ بل کہ لوگ اسے حقیر اور بے حیثیت سمجھتے ہیں۔ اور اس سے کوئی بھی واسطہ رکھنا اپنی ہتک محسوس کرتے ہیں۔ ولیم جب اسسٹنٹ کمشنر تھا تو کئی لوگ مثلاً ریٹائرڈ افسر، سرکاری افسر، اور بہت سے لوگ آگے پیچھے گھومتے تھے۔ لیکن اب اسے شدت سے احساس تھا کہ نہ وہ اسسٹنٹ کمشنر ہے اور نہ یہ جگہ اس کا گھر۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو جائے تو کوئی مڑ کر دیکھنے والا بھی نہیں۔ اگر کبھی کبھار کسی سے آمنا سامنا ہو جائے تو طنز کے تیر برساتی نظروں سے گھورتے تھے۔

اس لیے کہتے ہیں کہ تن درستی اللہ تعالی کی وہ عظیم اور انمول نعمت ہے کہ جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ انسان ہزاروں روپے خرچ کر کے بھی اچھی صحت حاصل کرنے کے گارنٹی نہیں لے سکتا۔ اور یہ ایک ایسی شے ہے کہ مادی اشیاء اس کی قیمت ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ تن درستی کی قدر و قیمت ایک بیمار اور بے بس آدمی ہی سمجھ سکتا ہے۔ جو بستر پر پڑے پڑے تن درست آدمیوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہتا ہے۔ اور پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ اچھی صحت اللہ پاک کی طرف سے ایک بیش قیمت عطیہ ہے۔ صحت مندی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ غریبی، بے بسی، ناداری اور اکیلے پن کے ساتھ ساتھ صحت بھی خراب ہو تو وہ انسان زندہ در گور ہو جاتا ہے۔ صحت مند آدمی اللہ رب العزت کی عطا کردہ نعمتوں سے مستفید ہو سکتا ہے اور ان نعمتوں کے حصول کے لیے تگ و دو کر سکتا ہے۔ جو ابھی تک اسے حاصل نہیں ہوئیں اور ساتھ ہی وہ اپنی بے بسی کو بھی ختم کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

"جنید قیصر" کے نزدیک:

"ہمیں ایک ایسے معاشرے اور ریاست کے لیے جستجو کرنی چاہیے جہاں تمام عقائد، مذاہب اور نظریات کے لیے رواداری پائی جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں ریاست پر زور ڈالنا ہو گا کہ وہ رواداری پر مبنی لبرل جمہوری معاشرے کو فروغ دے۔ ایک جمہوری معاشرے میں ہی بنیادی انسانی حقوق کی حیثیت اور عظمت کو پہچان ملتی ہے۔ جمہوریت میں یہ تصور کیا گیا ہے کہ کسی نظریہ، خیال، جماعت، فرقہ اور مذہب کی بنیاد پر کسی سے تعصب نہیں برتا جائے گا اور تمام انسانوں کو بنیادی مساوی حقوق کی ضمانت دی جائے گی۔ ایک جمہوری معاشرے کے لیے سماجی انصاف اور ہم آہنگی لازمی ہے۔ ایک کثیر الجہت، اعتدال پسند معاشرہ اس وقت مرض وجود میں نہیں آسکتا، جب تک اس میں انسانی حقوق کا مکمل احترام نہ ہو۔"[۱۰]

بے بس آدمی اپنی تقدیر اور بدبختی کا رونا روتا رہتا ہے۔ اسے ہمیشہ یہ گلہ رہتا ہے کہ اس کی قسمت خراب ہے۔ اسے اپنی ناکامی کا بہت افسوس رہتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر انسان بے بس ہو تو بعض اوقات انسان کے قریب ترین رہنے والوں کے درمیان بھی کچھ ایسی دوریاں آ جاتی ہیں کہ تنہائی کا احساس بڑھنے لگتا ہے۔ اور سب اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی کسی ایسے شخص کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے جو تنہائی اور بے بسی کے لمحوں میں عارضی ہی صحیح ایک طرح کا سہارا دکھائی دے۔ کیوں کہ اس کے اندر کی ویرانی اس کو بے چین رکھتی ہے۔ انسان کو اپنے زور بازو پر بھروسہ نہیں رہتا۔ اگر اس کے ارد گرد خوشیوں اور مسرتوں کا سماں ہو پھر بھی وہ خود کو اس ہجوم میں تنہا اور اداس محسوس کرتا ہے۔ اس کے دل کی کیفیت کا کسی کو اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کے دل میں بے بسی نے ہلچل مچا رکھی ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود تقدیر پر راضی رہنا بھی ان لوگوں کا فلسفہ ہوتا ہے۔ تقدیر پرستی کا یہ فیصلہ ہمیشہ سے مقبول عام رہا ہے اور اس فلسفے کے سہارے صدیوں انسانوں نے ہر قسم کی مصیبتیں جھیلیں اور تکلیفیں برداشت کیں۔ اکثر لوگ اس خیال کے حامل ہوتے ہیں کہ دنیا کے دکھ ناگزیر ہیں اور مقدر میں لکھ دیے گئے ہیں۔ اور ان کے حل کے لیے ایک ہی صورت ہے کہ ان کو ہنس کر برداشت کیا جائے۔ اگر کسی اقلیت کو اس کے سر چھپانے کے ٹھکانے سے دربدر کر دیا جائے تو اس کے لیے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں انھیں عموماً شہر کے گندے اور پس ماندہ علاقوں میں رہنا پڑتا ہے۔ ان کی تمام امیدوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔ اور انھیں مزید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا

ہے۔" زینہ "میجر (ر) خالد فتح محمد کا ناول ہے۔جو ۲۰۱۹ء میں عکس پبلی کیشنز نے لاہور سے شائع کیا ہے۔"زینہ" ایک بیانیہ ناول ہے۔ جس میں بیانیے کی جادوگری سے ساری دل کشی پیدا کی گئی ہے۔ناول کے صفحہ اول پر مجروع سلطان پوری کا شعر درج ہے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر

لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

خالد فتح محمد کے ناول "زینہ" سے اقتباس دیکھیے:

"چودھری کے مر جانے کی خبر انھیں فوراً ہو گئی اور وہ ٹڈی دل کی طرح آ گئے۔ مجھے انھوں نے گھر سے نکال دیا۔چودھری نے مجھے اپنی جائیداد میں حصہ دیا تھا جس کے بارے میں، میں نے انھیں بتایا لیکن ان کا جواب دوٹوک تھا۔وہ اس نے کیا اور نہیں رہا ہم ہیں اور تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔ میں ایک تو غریب تھی اور دوسرے عورت ذات۔ میں ان کی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ میں اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ کے یہاں آ گئی۔ ۔۔مارتھا دکھی تھی۔"(۱۱)

مارتھا ایک عیسائی عورت تھی اور چودھری ظفر کے ساتھ بغیر نکاح کے کئی سالوں سے رہ رہی تھی۔ اپنے مذہب یعنی عیسائیت کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے نتیجے میں مارتھا کہ ہاں ایک بیٹا بھی پیدا ہوا۔چودھری کی زندگی میں اس کی طاقت اور ڈر کی وجہ سے کوئی ان کے خلاف آواز نہ اٹھا سکا مگر چودھری کے مر جانے کے بعد اس کے خاندان والوں نے مارتھا کو اس کے گھر سے بے دخل کر دیا۔چودھری کو تو کوئی نہ پوچھ سکا مگر ایک مظلوم اور بے بس عورت کو سب نے مل کر دھکے دے کر بے سائباں کر دیا۔

ہمیں وطن عزیز میں ہر قسم کی آزادی اور سامان آسائش مہیا ہے۔ ہمیں روپے پیسے اور زمین و جائیداد کی ہوس کو ترک کر کے خوشیوں اور محبتوں کے دیپ چلانے چاہئیں۔اتفاق و اتحاد کے ساتھ اپنے عمل سے پکے مسلمان اور سچے پاکستانی ہونے کا عملی ثبوت دینا چاہیے۔ پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت خوش گوار زندگی گزاریں گے تو ہم دنیا پر چھا جائیں گے۔(انشاءاللہ) یہ لوگ بھی اپنی زندگی سنوارنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی زندگی سرگرمیوں سے خالی ہی نہیں رہ سکتی۔ اگر ان کی سرگرمیوں کو کسی مثبت سمت لگا دیا جائے تو ان سے بہت اچھے نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ البتہ ان کی سرگرمیوں کا رخ منفی ہو جائے یا وہ ہمہ

وقت فارغ ہوں اس سے خطرناک نتائج بر آمد ہو سکتے ہیں۔ موجودہ حالات میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور فارغ البالی سے بھی پاکستانی اقلیت بہت پریشان ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ بے بسی کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ مگر پھر بھی حوصلہ نہیں ہارتے مایوسی اور بددلی کے باوجود خاموشی سے جیئے جا رہے ہیں۔ "جنید قیصر" لکھتے ہیں:

> "کسی بھی معاشرے میں مذہبی رواداری اور ہم آہنگی قائم کرنے کے لیے سب سے اہم مثبت قدم یہی ہے کہ اس اہم بنیادی اصول کو فروغ دیا جائے کہ نہ کوئی فرد اس بنا پر مراعات یافتہ ہے اور نہ ہی کوئی امتیازی سلوک کا شکار، کیوں کہ وہ کسی خاص مذہبی یا سماجی گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔۔۔اکثریت کو مذہبی اقلیتوں کے بنیادی حقوق انسانی آزادیوں اور ان کی انفرادیت کا احترام کرنا چاہیے۔ مذہبی رواداری اور ہم آہنگی کے مقاصد اکثریت اور مذہبی اقلیتوں کے درمیان مشاورت اور تعاون کے ذریعے ہی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ مذہبی رواداری اور ہم آہنگی محض اسی وقت قائم ہو سکتی ہے۔ جب مذہبی اقلیتوں کو مساوی بنیادی حقوق اور انسانی آزادیاں دی جائیں۔اسی سے معاشرہ ہم آہنگی، اور رواداری کی طرف بڑھے گا۔"[۱۲]

انسان بقائے حیات کے لیے تگ و دو کرتا رہتا ہے۔غاروں میں رہنے والے انسانوں کو خونخوار جانوروں سے جان بچانے کے لیے تیز بھاگنا پڑتا تھا۔ بڑی پھرتی کے ساتھ درختوں پر چڑھنا پڑتا تھا۔ اور خوراک کے حصول میں خون پسینہ ایک کرنا پڑتا تھا۔ لیکن جوں جوں تہذیب پھیلتی گئی انسان کی زندگی پر سکون ہوتی گئی۔ اب اسے خوراک کے لیے جنگلوں میں مارامارا پھرنا نہیں پڑتا بل کہ اسے گھر میں بیٹھے بیٹھے ہر چیز میسر آنے لگی ہے۔ لیکن مفلس اور بے بس انسان کو بہت سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے بے بس انسان ہمیشہ بے قرار اور مسلسل اضطراب کی حالت میں رہتا ہے ۔ بے بس انسان دنیاوی زندگی کو سنوارنے میں ایسا مصروف عمل ہوا ہوتا ہے کہ اسے خود اپنی ذات کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ وہ اپنی زندگی کی کشتی کو بے بسی کے طوفانوں سے نکالنے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔اسے اپنے اردگرد رونما ہونے والے حالات و واقعات سے قطعی کوئی سرکار نہیں ہوتا۔ گردش زمانہ اسے آلام و مصائب میں ڈبو دیتا ہے۔اور وہ اپنی ذات سے بھی لاپرواہ ہو جاتا ہے۔ اس کا دل رونا، دھونا اور آہ و بکا کرنا چاہتا ہے۔ مگر وہ بظاہر خاموشی سے اپنے حالات سنوارنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ بعض اوقات انسان کو محسوس ہوتا ہے کہ بے بسی اس کی قسمت میں لکھی ہوئی ہے لہذا وہ جتنی بھی کوشش کرے ناکام ہی رہے گا۔

سجیلہ تمام حالات وواقعات کے رونماہونے کے بعد خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اس نے بے اختیار خدا کو پکارنا شروع کر دیا۔ اور دل ہی دل میں دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔ کیوں کہ اس کا محبت سے رہنے والا کنبہ اور وہ آشیانہ جہاں آرام و سکون اور محبت کی بہاریں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن اب امریکہ سدھارنے کے بعد امریکہ کی طرز زندگی اختیار کرتے ہوئے ہر ایک نے اپنے لیے الگ، الگ راہ کا انتخاب کر لیا تھا۔ اور ان کی ماں سجیلہ بے بسی کے عالم میں سب کچھ دیکھتی رہ گئی۔ "طاوس فقط رنگ " نیلم احمد بشیر کا ناول ہے۔ جو سنگ میل پبلی کیشنز نے لاہور سے ۲۰۱۷ء میں شائع کیا ہے۔ یہ ناول ۵۰ ابواب پر مشتمل ہے۔ نیلم احمد بشیر نے ناول کا نام مغرب کی چکا چوند اور مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک کو چاک کرنے کے لیے علامہ محمد اقبال کے شعری مجموعے بال جبرئیل کی ایک غزل کے شعر سے مستعار لیا ہے۔ نیلم احمد بشیر کے ناول "طاؤس فقط رنگ "سے اقتباس دیکھیے:

> " یا اللہ میں کیسے سب کی زندگی آسان کر سکتی ہوں؟ میری کوئی سنتا بھی کہاں ہے؟ میاں اپنی زندگی میں مصروف اور مگن اور انھوں نے اپنے لیے دلچسپیاں بھی ڈھونڈ رکھی ہیں جن کا سجیلہ کو اندازہ تھا۔ بیٹا برگ آوارہ تھا دیوانہ ہوا پھر رہا تھا۔ بیٹی نے نئی راہ ڈھونڈ لی تھی۔ اپنا طرز زندگی بدل کر مذہبیت میں پناہ لے رہی تھی۔ کوئی بھی اپنی جگہ پر قائم نہیں تھا۔ سکون نام کی کوئی چیز ان کی زندگی میں نہیں تھی۔ کیا ہم اس لیے امریکہ آئے تھے کہ ایک دوسرے کو کھو دیں۔ اب ہم گول گول چکر کھاتی زمین پر کھڑے ہیں مگر ایک دوسرے کا ہاتھ چھوٹا جاتا ہے۔ دوریاں بڑھتی جاتی ہیں۔"[۱۳]

بے بس انسان کی زندگی کسک اور درد و کرب سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ بے بسی کی کڑی دھوپ اسے جان لیوا مسائل میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ خوش حال اور ایک ساتھ رہنے کی جتنی بھی کوشش کریں بے بسی ان کے اجلے راستوں میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کا دل خاموشی سے اندرونی کیفیات پر خون کے آنسو روتا ہے۔ ہمہ وقت ایک عجیب سا احساس اسے اپنے اندر کروٹیں لیتا محسوس ہوتا ہے۔ امریکہ جا کر زندگی اور مستقبل کے سنوارنے کے خوب صورت خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ پورا گھرانہ انجان راہوں کا راہی بن گیا تھا۔ ہر فرد اپنے منتخب کیے ہوئے راستے پر اتنا آگے نکل گیا تھا کہ واپسی کا راستہ مشکل نظر آرہا تھا۔ اس ڈولتی ہوئی زندگی کی کشتی کو بے بسی کے عالم میں ایک ماں اور ایک بیوی حسرت بھری نگاہوں سے

دیکھنے پر مجبور تھی۔" آغا امیر حسین "اپنی کتاب "بھارت اور امریکہ پاکستان کے دوست یا دشمن "میں رقم طراز ہیں: "اوورسیز پاکستانیوں کو درپیش مسائل کا حل ان کی وطن واپسی میں ہے۔"[۱۴]

پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کا بہت بڑا مسئلہ جہالت بھی ہے۔ مفلسی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ جہالت بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ان کے لیے مفت پیشہ ورنہ تعلیم کا بندوبست کرنا نہایت ضروری ہے۔ تاکہ فنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد معاشی لحاظ سے بہتر زندگی گزارنے کے قابل ہو جائیں۔ ان کو ایسے فن، ہنر اور پیشے کی تربیت دی جائے جو ان کے رجحان کے مطابق ہو تاکہ وہ خود کفیل بن سکیں۔ پاکستانی آئین کے آرٹیکل نمبر ۱۸ کے تحت ہر پاکستانی شہری کے معاشی حقوق کو تحفظ حاصل ہے۔ ہر شخص کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ آزادی سے جو پیشہ چاہے اختیار کرے۔

پیشہ وارانہ تعلیم ہی کی بدولت مفلسی سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ کم از کم انھیں یہ فکر دامن گیر نہیں ہو گی کہ وہ کوئی فن یا ہنر نہیں جانتا تو وہ دو وقت کی روٹی کیسے حاصل کرے گا۔ بل کہ وہ معاشی طور پر آسودگی محسوس کرے گا۔ کیوں کہ جب تک کوئی بھی فرد معاشی طور پر پسماندہ ہو تو کبھی استحکام حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتی بچوں کو مفت تعلیم دی جائے۔ اور انھیں عام تعلیم دینے کے بجائے بامقصد ٹیکنیکل تعلیم دی جائے تاکہ ان کی چھپی ہوئی صلاحیتیں اجاگر ہوں، اور ان میں محنت کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ پاکستانی ہندو اور عیسائی خواتین کو بھی کوئی نہ کوئی ہنر سکھانا بہت ضروری ہے۔ انھیں گھریلو دست کاریاں مثلاً کپڑے سلائی کرنا، کڑھائی وغیرہ کرنا جیسے ہنر کی تربیت دی جائے۔ اور اس مقصد کے لیے انھیں امدادی سامان مثلاً سلائی مشین، دھاگے، کپڑے، نلکیاں وغیرہ مفت حکومت کی طرف سے فراہم کی جائیں۔ پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتی مردوں کے لیے بھی ورک شاپس نما سکول کھولے جائیں تاکہ وہ بھی کوئی ہنر سیکھ لیں۔ اور تجربے کی حامل افراد ان کی رہنمائی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی صلاحیتوں کو ایسے رخ پر ڈالیں کہ وہ بھی معاشی طور پر باعزت طریقے سے روزی کما سکیں اور معاشی ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ خوش گوار زندگی گزارنے کے قابل ہو جائیں۔

انسان اپنی روز مرہ کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے شب و روز کوشاں رہتا ہے۔ اسے ان کی تکمیل کے لیے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کوئی ذریعہ روزگار کے لیے مارا مارا پھرتا ہے اور کسی کو سر چھپانے کے لیے جگہ نہیں ملتی۔ اس وسیع و عریض دنیا میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو مکمل طور پر بے فکر اور

مطمئن نہیں ہیں۔ ہر شخص کسی نہ کسی پریشانی کا شکار نظر آتا ہے۔ اسی طرح غربت بھی ایک عالمی سماجی مسئلہ ہے۔ جس کے اثرات کا دائرہ کار ترقی یافتہ ممالک میں بھی ہے۔ پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں میں غربت انتہائی گمبھیر اور سنگین سماجی مسئلہ ہے۔ یہ غربت ان کی معاشی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ تمام عوامل مل کا ذہنی ہیجان اور احساس محرومی کو جنم دے رہے ہیں۔ پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں میں غربت کی صورت حال بہت نازک ہے۔ بعض اقلیت غربت کی انتہائی سطح سے بھی نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ روزگار کی عدم دستیابی اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کی وجہ سے پاکستانی عیسائی اور ہندو اقلیتوں کی اکثریت کی بنیادی ضروریات تک رسائی مشکل ہے۔ اس وجہ سے بہت سے خاندان غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ یوں محدود وسائل کی وجہ سے ان کی آنے والی نسلیں بھی متاثر ہو رہی ہیں۔ غریب انسان خود کو ستم خوردہ تصور کرتا ہے۔ غربت اس کی زندگی میں زہر گول دیتی ہے اور اس کی گھریلو حالت خستہ تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ لوگ بھی غریب انسان سے نفرت کرتے ہیں اور انھیں اپنے قریب تک بیٹھنے نہیں دیتے۔ اس طرح کے رویے انھیں مزید اذیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ "بھاگ بھری" صفدر زیدی کا ناول ہے۔ جو ۲۰۱۸ء میں عکس پبلی کیشنز نے لاہور سے شائع کیا ہے۔ ناول کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ "انگلستان ۳۰۰۰ء" ہے۔ اس کے مزید ۴۳ حصے ہیں۔ دوسرا حصے کا نام "ایٹمی حملوں کے بعد" ہے۔ اس کے مزید ۲۰ حصے ہیں۔ تیسرے حصے کا نام "خشک سالی کا دور" ہے۔ اس کے بھی مزید ۲۰ حصے ہیں۔ ناول کا نام صفدر زیدی نے محمود اعوان کے شعری مجموعے "سیجل" کے ایک شعر سے مستعار لیا ہے۔ اس ناول کا پشتو ترجمہ پاکستان اور ہندوستان سے زیر اشاعت ہے۔۔ صفدر زیدی نے اپنے ناول "بھاگ بھری" میں سندھ کے ظالم اور جابر وڈیروں کا چہرہ ساری دنیا کے سامنے بے نقاب کیا ہے۔ کہ کیسے وہ ہندو غریب اچھوت لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔ انھیں رات دن کام میں مصروف رکھتے ہیں۔ اُنھیں اچھا کھانا تو دور کی بات روکھا سوکھا بھی پیٹ بھر کر کھانے کے لیے نہیں ملتا۔ بھاگ بھری کا معصوم بیٹا ساون جو کہ اپنی شرارتوں اور کھیلنے کودنے کے دنوں میں بھی اپنی ماں کے ساتھ محنت کرتا تھا لیکن پھر بھی پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ اور جب وڈیرے کے ہاں کوئی مہمان وغیرہ آتے تو اس کے گھر سے رنگا رنگ لذیذ کھانوں کی خوشبو آتی تو وہ اس خوشبو کو محسوس کرنے کے لیے اس کے آنگن کے باہر گھنٹوں کھڑا رہتا اور اپنی سانسوں کے ذریعے ہوا پر تیرتی ہوئی اس خوشبو کو اپنے پیٹ میں اتار کر بھوک مٹانے کی بھرپور کوشش کرتا۔

ناول "بھاگ بھری" سے اقتباس دیکھیے:

" اس نے شام کا کھانا نہیں کھایا تھا اسے ماں کا کہنا یاد آرہا تھا جو وہ اس کے بار بار کھانا مانگنے پر کہتی تھی: ہم غریبوں کو بھگوان جتنا کم دیتا ہے ہم کو بھوک اتنی ہی زیادہ لگتی ہے ۔۔۔ہوٹل کے باہر بہت سی چارپائیاں جا بجا بچھی ہوئی تھیں۔ ان چارپائیوں پر لوگ آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو ٹرک تک آرہی تھی۔ اس خوشبو نے ساون کی بھوک کو ناقابل برداشت کر دیا تھا۔ جب کبھی وڈیرا اپنے اطاق پر مہمانوں کی دعوت کرتا تھا تو وہاں سے ایسی ہی خوشبو آتی تھی۔ وہ اکثر اطاق کے پیچھے جا کر اس کھانے کی خوشبو سونگنے کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا۔"(۱۵)

عام طور پر انسان کو خوش رہنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان میں اچھی غذا، پسندیدہ ملبوسات، عمدہ اور آرام دہ گھر ہے۔ اگر گھر اس کی ملکیت نہ بھی ہو تب بھی وہ چاہتا ہے کہ جہاں وہ رہے وہاں کا ماحول خوش گوار ہو۔ ارد گرد والے ملنسار اور ہمدرد ہوں۔ سیر و تفریح کے مواقع حاصل ہوں اور اتنی دولت ہو جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکے۔ لیکن جب انسان کو غربت کی وجہ سے یہ سب نعمتیں اور آسائشیں میسر نہ ہوں تو وہ نہ اچھی اور پیٹ بھر کر خوراک کھا سکتا ہے نہ اپنا پسندیدہ لباس زیب تن کر سکتا ہے۔ اور نہ ہی اپنی سوچ کے مطابق خوب صورت اور صاف ستھرے گھر کی فضا سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اسے یہ تمام سہولتیں اس وقت حاصل ہوں گی جب وہ غربت اور غلامی سے چھٹکارا پا کر خوش حال ہو گا۔ غربت اسے کسی بھی نعمت سے لطف اٹھانے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ غربت کی کوکھ سے غربت ہی جنم لیتی ہے۔ جس طرح صفر + صفر ہمیشہ صفر کے برابر ہوتا ہے۔ اسی طرح غریب ہمیشہ غریب ہی رہتا ہے۔ غربت ایک طرح کی دلدل ہے جتنا کوئی شخص اس دلدل سے باہر آنے کی کوشش کرتا ہے اتنا ہی مزید اس دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ غربت کے اثرات سماج پر بہت گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ غربت میں رہنے والے افراد بھوک اور فاقوں کی وجہ سے مختلف بیماریوں سے روزمرہ کی بنیاد پر نبرد آزما ہوتے ہیں۔ اشیائے ضرورت کی بڑھتی ہوئی قیمتیں اور غیر یقینی ذرائع معاش بھوک و افلاس کو جنم دیتے ہیں۔ لوگ اشیائے ضرورت کو خریدنے کے قابل نہیں ہوتے اور پھر ناجائز طریقوں کو اپنانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جو کہ مزید سماجی مسائل کا باعث بنتے ہیں۔

"ڈاکٹر مبارک علی" کا کہنا ہے:

"اگر جاگیر داری اور قبائلی نظام کو ختم کیا جائے، ریاست کو مذہبی طور پر غیر جانبدار بنایا جائے، اور ریاست ہر شہری کی تعلیم، صحت، روزگار اور رہائش کی ذمہ داری لے تو ملک میں خوش حالی آ سکے گی۔"(۱۶)

غربت سارے سماجی ڈھانچے کو تبدیل کر دیتی ہے۔ خراب معاشی حالت ان لوگوں کی سماجی زندگی کو بری طرح متاثر کرتی ہے۔ معاشی تنگ دستی سے سماج میں مزید الجھنیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اور یہی الجھنیں بعد میں جرائم کا سبب بن جاتی ہیں۔ غریب گھرانے جاہلیت، پسماندہ علاقوں کی گندی رہائش اور گھریلو جھگڑے کا باعث بنتے ہیں۔ لہذا ملک سے غربت اور افلاس کا قلعہ قمع کرنا ضروری ہے اور سماجی ناہمواری کے فرق کو بھی کم کیا جائے۔ غریب لوگوں کو انتقامی رویے پر آمادہ کرنے والا ان کا یہ شعور ہوتا ہے کہ ان کی غربت میں سماج کے امیر طبقے کا ہاتھ ہے اس لیے پھر وہ مختلف جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

سماج میں ذرائع پیداوار پر صرف بااثر طبقے کی اجارہ دری قائم نہیں ہونی چاہیئے بل کہ سماجی بھلائی کے ثمرات غریب عوام تک بھی پہنچنے چاہیئں۔ غربت کے موثر تدارک کے لیے معاشی حالات بہتر بنانے ہوں گے تاکہ سماج کا یہ غریب طبقہ بھی سکون سے ہمکنار ہو سکے۔ کیوں کہ غربت انسان کو تمام احساسات سے غافل کر دیتی ہے۔ چین اور سکون کی نیند غریب انسان سے کوسوں دور چلی جاتی ہے۔ کیوں کہ غربت کا زخم بہت مہلک زہم ہوتا ہے۔ ساون وڈیرے کے روز روز کے ظلم و ستم سے تنگ آکر گندم والے ٹرک میں چھپ کر اس علاقے سے نکل کر ایک انجانی راہ پر نکل کھڑا ہوا۔ لیکن جب وہ رات کی گہری تاریکی میں چھپ چھپا کر ٹرک سے اترا تو تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ بھوک کی شدت سے بے ہوش ہو گیا۔ اور جب اسے ہوش آیا تو وہ اجنبی اور لمبی لمبی داڑھیوں والوں کے درمیان موجود تھا۔ سب سے پہلے اس نے کھانا مانگا اور جب ان لوگوں نے اس کے سامنے گوشت اور چاول رکھے تو زندگی میں پہلی بار گوشت اور چاول دیکھ کر اس نے آؤ تاؤ دیکھے بغیر جلدی جلدی کھانے شروع کر دیے۔ کھانا دیکھنے کے بعد ساون کی بے قراری اقتباس کی صورت میں ناول "بھاگ بھری" سے ملاحظہ کیجئے:

"وہ بچپن سے جس کھانے کو چھپ چھپ کر سونگھتا آیا تھا آج وہ پلیٹ بھر کر اس کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ساون نے کسی کی طرف نظر اٹھائے بغیر گوشت کے بڑے سے

> ٹکڑے کو منہ میں ڈالا۔ آج اس نے زندگی میں پہلی بار بکرے کے گوشت کا ذائقہ چکھا تھا۔ اس گوشت کا ذائقہ اور مصالحے کی خوشبو اس کے سارے منہ میں پھیل گئی، وہ فوراً ہی مٹھی میں چاول بھر کر منہ میں ٹھونس کر جلدی جلدی چبانے لگا۔۔۔ سب لوگ اس کے ارد گرد کھڑے حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے اور وہ بے نیازی سے جلدی جلدی اپنی بھوک مٹا رہا تھا۔"(۱۷)

غربت انسان کے ذہن کو مفلوج کر دیتی ہے اور انسان تمام عمر معاشی چکر میں پھنسا رہتا ہے۔ اس کی زندگی محرومیوں اور مایوسیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ ہر وقت مصائب میں گھرا رہتا ہے۔ خوش حالی اور کامرانی کا دور دور تک کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ غربت کی داستان بڑی طویل اور دل خراش ہوتی ہے۔ پاکستان کی ہندو اقلیت کو اپنی گرتی ہوئی حالت سنبھالنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ غربت کی صورت حال ان کے لیے نقصان دہ بھی ہے اور تکلیف دہ بھی۔ غربت ایسا موذی مرض ہے جس کو جڑ سے ختم کرنے کے غم میں انسان نڈھال ہو جاتا ہے۔ اپنی حالت کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کی حالت لحظہ بہ لحظہ خراب ہوتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے جذبات میں کمی کے بجائے شدت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور وہ چاہتا ہے کہ وہ ایک خوش گوار اور صحت مند زندگی گزارے۔ کیوں کہ ان کا کل سرمایہ ان کی صحت اور کارکردگی ہی ہوتی ہے جس کے بل بوتے پر وہ اپنے روزگار پر قائم رہتے ہیں۔ لیکن جب انسان بیمار ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی بے روزگار بھی ہو جاتا ہے اور بیماری غربت کے ساتھ دگنا عذاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ غریب اور اوپر سے بیمار شخص بے اطمینان اور بے سکون ہوتا ہے۔ اور جب غربت اور ستم کے مارے شخص کو بھوک نے بھی نڈھال کر رکھا ہو تو اس کی ذہنی کیفیت اس کے قابو سے باہر ہو جاتی ہے۔ تو وہ عام روش سے ہٹ کر ایک نئی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ جب اس قسم کے افراد کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ سماج کے لیے ایک مسئلہ بن جاتے ہیں۔ جس طرح ساون ہمت کر کے وڈیرے کے چنگل سے بھاگنے میں تو کامیاب ہو گیا مگر وہ ایک بار پھر قسمت کی ستم ظریفی کی وجہ سے بظاہر نمازی اور پرہیز گار لیکن حقیقت میں دہشت گرد تنظیم کے ہتھے چڑھ گیا۔ انھوں نے اسے ہر دن اچھے سے اچھا کھانا کھلا کر اپنا گرویدہ کر لیا۔

جب انھوں نے اس سے مذہب کی تبدیلی کے بارے میں پوچھا تو ہائے رے غربت تیرا کچھ نہ رہے کے مصداق اس نے سب سے پہلا جو سوال کیا وہ ناول "بھاگ بھری" سے ملاحظہ کیجئے:

"بیٹا! کیا مسلمان بنو گے ہمارے جیسے؟ انھوں نے بہت نرمی سے ایک بار پھر دریافت کیا۔ کیا مسلمان بن جانے سے روز ایسا کھانا ملے گا؟ساون نے جواب دینے کے بجائے سوال کر ڈالا۔ "(۱۸)

اچھی اور متوازن خوراک انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ کوئی بھی فرد خواہ وہ اکثریت ہو یا اقلیت اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ امیر لوگوں کو یہ سہولت عام ہے مگر غریب لوگ ان سہولتوں سے محروم ہیں۔ فلک بوس عمارتیں، ملیں، کارخانے وغیرہ سب آج کے سماج کی ترقی کے عکاس ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ دن رات محنت کر کے ان کو بناتے اور چلاتے ہیں ان کی الجھنیں اور مسائل بڑھتے جارہے ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی بنیادی ضروریات کے حصول کے لیے بھی انھیں سخت اور بے حد محنت اور کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اور ناکام ہونے کی صورت میں وہ شدید احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو کوستے ہیں یا پھر ان میں باغیانہ جذبات ابھر آتے ہیں۔ جن کے سبب وہ تخریبی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگتے ہیں۔ قوانین کی خلاف ورزیاں کرتے ہیں اور جرائم، بے راہ روی، ذہنی امراض اور مایوسی جیسے مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی سماج میں ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ ملک یا سماج میں بہت سے لوگ ایک ہی پریشانی کا شکار نظر آتے ہیں۔ اس حالت کو بدلنے کے لیے اجتماعی کوشش و عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ حالت جب قابو سے باہر ہو جائے تو لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ کچھ کرنا چاہیے تو اس سلسلے میں ضرور کوئی حل نکالا جا سکتا ہے۔ اقلیت اور اکثریت باہم مل کر راہ نجات کے بارے میں کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ سماج کا ایک حساس اور باشعور طبقہ بھی ہے جو پاکستانی ہندو اقلیتوں کو غربت کی دلدل سے نکالنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ کیوں کہ سماج کا حساس باشعور اور دانش مند طبقہ اپنے فہم و ادراک اور تحقیقات سے ان مخفی طاقتوں کو جاننے کی کوشش کرتا ہے جو کسی سماجی مسئلے کے وجود میں آنے کا باعث ہوں۔ "ڈاکٹر مبارک علی" یوں لکھتے ہیں:

" آج کے دور کی مناسبت سے ریاست کو مذہب کے معاملہ میں غیر جانبدار قرار دیا جائے اور جمہوری اداروں کو مضبوط کرنے کے لیے جاگیر داری اور سرداری نظام کا

خاتمہ کیا جائے۔ لیکن تاریخ خواہشات کی بنیاد پر تشکیل نہیں ہوتی ہے۔ اس کے پس منظر میں سیاسی، سماجی اور معاشی قوتیں ہوتی ہیں۔ اگر یہ قوتیں پیدا ہوں اور آزاد ہوں تو اس صورت میں تبدیلی آ سکتی ہے۔ ورنہ قومیں ہزاروں سال سے پس ماندگی اور غربت کی حالت میں زندگی گزار دیتی ہیں۔"[۱۹]

عنایت مسیح اور اس کی بیوی مریم بھٹہ مزدور ہیں۔ انھوں نے کچھ رقم ادھار لی تھی جو ختم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ دن بھر محنت و مشقت کرتے مگر جب ہفتے کے بعد پیسے ملنے کی باری آتی تو منشی چالاکی سے بہت کم اجرت دیتا اور باقی کی رقم ادھار کی مد میں کاٹ لیتا۔ انھیں اس ناانصافی پر احتجاج کرنے کا کوئی حق اور اختیار نہیں تھا۔ مریم کے ہاں اینٹیں بناتے ہوئے بچے کی پیدائش ہوئی اور وہ دوسرے دن معمول کے مطابق کام پر آ گئی صرف اس وجہ سے کہ اگر اس نے کام نہ کیا تو کھائے گی کیا۔ اور اب روکھی سوکھی روٹی کے اوپر نمک اور مرچ رکھ کر پیٹ کا دوزخ بھرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مریم اور اس کا خاندان ایک اذیت ناک زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ اس حوالے سے ناول "جانگلوس "(جلد سوم) سے اقتباس دیکھیے:

"وہ زچہ مریم تھی اور شاداں کے سامنے بیٹھی ہری مرچ اور نمک کے ساتھ روٹی کھا رہی تھی۔ وہ دوسرے پتھیروں اور بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کے ساتھ ہی صبح کام پر آ گئی تھی اور مٹی کے گارے سے کچی اینٹیں تیار کر رہی تھی۔ چلچلاتی دھوپ سے اس کا جسم پگھل رہا تھا۔ وہ پسینے سے شرابور تھی۔

شاداں نے حیرت سے پوچھا۔ تو نے کل بچہ جنا ہے اور آج کام پر آ گئی ہے؟

۔۔۔پر تجھے کچھ روز آرام تو کرنا ہی چاہیے۔ شاداں نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ایسے تو بیمار پڑ جائے گی۔ دیکھ تو کتنی کمزور لگ رہی ہے۔ جا کر آرام کر کل آنا۔

آرام کرنے لگیں تو گزارا کیسے ہو۔ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ویسے ہی خالی پیٹ رہنا پڑتا ہے۔ آرام کی سوچنے لگیں تو بھوک اور ننگ سے مر جائیں۔ اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔"[۲۰]

غربت کے دائرہ کار میں غیر یقینی ذریعہ معاش، رہائش کا نامناسب انتظام، عدم تحفظ، سماج میں طبقاتی فرق، محدود صلاحیتیں اور کمزور ریاستی نظام شامل ہے۔ پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کے افراد کے معاشی و سماجی وسائل محدود ہیں۔ اکثریت کی آمدنی ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ غربت کی وجہ سے ان کا معیار زندگی پست ہے اور وہ خراب صحت، ناکافی تعلیم، کم سماجی رتبہ، ادھوری شخصیت جیسے مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔ ان کی اکثریت غربت کی لپیٹ میں آچکی ہے۔ غربت وہ معاشی مسئلہ ہے جو ان افراد میں کارکردگی کی صلاحیتوں کو روکتی اور سماجی ترقی کی رفتار کو سست کر دیتی ہے۔ غربت کی وجہ سے یہ لوگ عدم تحفظ اور بے اطمینانی کا شکار ہیں۔ اور بڑھتا ہوا طبقاتی فرق مزید امیر اور غریب کے درمیان نفرتوں کو فروغ دینے کا باعث بن رہا ہے۔ غربت سماج میں نہ صرف جہالت کو فروغ دیتی ہے بل کہ معاشی و سماجی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کا باعث بھی ہے۔ غربت افراد کو اجتماعی طور پر سخت نقصان پہنچانے کا باعث بنتی ہے۔ یہ افراد معاشرہ کے اندر انا پرستی اور غیرت کو ختم کر دیتی ہے۔ انسان میں خودی کو کچل دیتی ہے۔ ذہنی صلاحیتوں کو مفقود کر کے چستی و پھرتی اور کام کرنے کی لگن اور آگے بڑھنے کا عزم ختم کر دیتی ہے۔ اخلاقی اور نفسیاتی مسائل اور جرائم میں قابل ذکر اضافہ ہوتا ہے۔ انسان خراب عادات کے چنگل میں پھنس جاتا ہے۔ انسانی رشتے اور اخلاقی اقدار پامال ہوتے ہیں۔ انسان اپنے جیسے انسانوں کا دست نگر بن جاتا ہے۔ ایسے لوگ سماج میں بہت دردناک زندگی گزارتے ہیں "ڈاکٹر مبارک علی" کے نزدیک:

> "پاکستانی معاشرے میں عیسائی اقلیت بظاہر نہ تو معاشی طور پر نہ سیاسی و سماجی طور پر کسی طبقہ کے لیے خطرہ ہے۔ کیوں کہ ایک تو ان کی تعداد بہت کم ہے اس کے علاوہ ان کا متوسط طبقہ اس قدر محدود ہے کہ وہ ملازمتوں یا دوسری مراعات کے لیے کوئی مطالبہ نہیں کرتا نہ ہی صنعتی و تجارتی طور پر عیسائی کمیونٹی آگے ہے اس کے برعکس ان کی اکثریت کا تعلق غریب اور کچلے ہوئے طبقوں سے ہے۔ یہاں تک کہ تعلیمی لحاظ سے بھی پسماندہ ہیں۔"(۲۱)

غربت کا عام ہونا دراصل مناسب معاشی نظام نہ ہونے کی بدولت ہے۔ وطن عزیز میں ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے جو یہاں رہنے والے پاکستانی عیسائی اور ہندو اقلیتوں کے ہر فرد کی مالی ضروریات کو پورا کر سکے۔ انھیں صحت مند اور غیر محتاج زندگی گزارنے کے قابل بنا سکے۔

غربت انسان کی صلاحیتوں کو زنگ لگا دیتی ہے۔ تعلیم و ہنر کی کمی اور غربت میں بڑا گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ غربت کی وجہ سے افراد تعلیم مکمل نہیں کر پاتے۔ فنی تعلیم و تربیت کی کمی بھی ان لوگوں کو معمولی معمولی روز گار حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ جس سے دو وقت کا کھانا پورا نہیں ہوتا اور نہ ہی خاندان کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا آسان ہوتا ہے۔ آج کے صنعتی دور میں ٹیکنالوجی کا استعمال ناگزیر ہے اور اگر افراد اس کے استعمال سے ناواقف ہوں تو وہ روز گار کے بہت سے مواقع کھو دیتے ہیں۔ اور اس سے بھی معاشی مسائل بڑھتے ہیں۔ معاشی وسائل کی استعداد میں کمی غربت کا بڑا سبب ہے۔ ہمارے ہاں اقلیتوں کو معاشی تحفظ حاصل نہیں ہے اس طرح کے بے روز گار افراد کو حکومت کی طرف سے ہر مہینے کچھ امداد بھی ملنی چاہیے تاکہ وہ زندگی کی گاڑی کو چلا سکیں۔ غربت میں سجی سجائی، چمکتی دمکتی دکانیں دیدہ زیب لباس اور جوتوں کے خوب صورت ڈیزائن دیکھ کر ہزاروں ارمان ان کے دل میں بھی اٹھتے ہوں گے مگر غریب آدمی کی پہنچ سے یہ سب چیزیں بہت دور ہوتی ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر غربت ان کے ذہن پر جو اثرات مرتب کرتی ہے وہ کبھی بھی نہیں بھلائے جا سکتے۔ غریب کی حالت زار دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے اور آنکھیں بے اختیار برسنا شروع ہو جاتی ہیں۔ کیلشیم اور غذائیت کی کمی کی وجہ سے مریم کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ وہ جوانی میں ہی صدیوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ اس پر بڑھاپے کے سائے وقت سے پہلے منڈلا رہے تھے۔ اس تکلیف دہ حالت میں بھی وہ کام کر رہی تھی اور تھکن کی وجہ سے نڈھال ہو چکی تھی۔ اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ مریم کا شوہر عنایت بھی غذائی قلت کا شکار ہو کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ اس حوالے سے شوکت صدیقی کے ناول "جانگلوس" (جلد سوم) سے ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے: جس میں عیسائی اقلیت غربت کی سطح سے بھی نیچے کی سطح پر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں:

"مریم کے شوہر نے ڈپٹ کر کہا مریم تیز ہاتھ چلا۔

چلا تو رہی ہوں مریم نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ عنایت مجھے تنگ نہ کر۔ تجھے پتہ ہے میری طبیعت ٹھیک نہیں۔

مجھے پتہ ہے، سب پتہ ہے۔ عنایت مسیح نے نظریں اٹھا کر بیوی کی طرف دیکھا۔۔۔

مجھے بھی پتہ ہے۔ تب ہی تو سویرے ہی سویرے کام پر آ گئی۔۔۔

نکے کو صرف ایک بار دودھ پلانے گئی تھی۔ بار بار اس کے رونے کی آوازیں سنتی ہوں پر کام چھوڑ کر اس کے پاس نہیں گئی۔ وہ اپنے نوزائیدہ بچے کے بارے میں بتا رہی تھی۔ بھوک سے رو رہا ہے۔ شور مچا رہا ہے۔۔۔

میں تو یہ جانتا ہوں کام کم ہوا تو نہ تجھے کھانے کو ملے گا نہ نکے کو۔ عنایت مسیح کے سدھے ہوئے ہاتھ تیزی سے چلتے رہے۔ اس کے ہاتھوں اور گردن کی رگیں ابھری ہوئی تھیں ۔ گال پچکے ہوئے تھے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ بدن پر گوشت اس قدر کم تھا کہ جگہ جگہ سے ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ مسلسل کام کرتا رہا اور بولتا رہا۔۔۔ تجھے پتہ ہے ہماری دیہاڑی تو پیشگی میں کٹ جاتی ہے ملتا ہی کیا ہے۔"(۲۲)

قرض لینا بھی عیسائی اقلیتوں کے لیے وبال جان بن جاتا ہے۔ وہ مختلف موقعوں پر اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قرض کا سہارا لیتے ہیں۔ جسے ان کی زبان میں پیشگی کہا جاتا ہے۔ مگر وہ قرض اترنے کے بجائے بڑھتا چلا جاتا ہے اور پھر وہ اور بھی غربت وافلاس میں جکڑتے چلے جاتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر بااثر اور نو سرباز گروہوں کے ہاتھ چڑھ جاتے ہیں۔ جو انھیں بہلا پھسلا کر اور جان بوجھ کر قرض دیتے ہیں اور جب وہ نامساعد حالات کی چکی میں پس کر قرض چکا نہیں پاتے تو ان کے پورے خاندان کو ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ اور یوں وہ غربت سے لڑتے لڑتے آزادی جیسی سہولت سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ اس ظالم اور جابر گروہ کی مرضی کے بغیر گھر اور کام کرنے والی جگہ کے علاوہ کہیں بھی نہیں جاسکتے۔ اور اگر کوئی ذرا بھی ان کی بات سے انحراف کرے تو اسے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ بااثر گروہ ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور ان غریبوں کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور یوں ان کی ساری زندگی غربت کے عالم میں گزر جاتی ہے۔ پاکستانی آئین کا آرٹیکل نمبر ۱۱ بیگار اور غلامی کے متعلق ہے۔ اس میں واضح لکھا ہے کہ کسی بھی شہری کو غلامی سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اسے مجبور کر کے بغیر معاوضہ کام لینا بھی منع ہے۔ کسی شہری کو خریدا یا بیچا نہیں جا سکتا۔ مگر پاکستانی سماج میں اقلیتوں کی بدقسمتی ہے کہ سب کچھ سرعام ہو رہا ہے۔ قانون کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان مظلوم اقلیتوں کو ان بااثر گروہوں سے بچانے اور رہائی دلانے کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے جائیں۔ کیوں کہ مسائل کے حل کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ نہ دینے سے مسائل کم ہونے کے بجائے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ماضی

میں بھی پاکستان میں غربت کا مسئلہ دوسرے کئی مسائل کی طرح حکومتوں کی بھرپور توجہ حاصل نہ کر سکا۔ جس کی وجہ سے گزرتے وقت کے ساتھ غربت میں اضافہ ہوتا گیا۔ جو کہ آج ایک بہت بڑا سماجی مسئلہ بن چکا ہے۔

احمد سلیم "پاکستان اور اقلیتیں" میں اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "سندھ میں نچلی ذات کی ہندو قومیں جن میں مینگواڑ، بھیل اور کوہلی شامل ہیں۔ سندھی جاگیرداروں کی نجی جیلوں میں پڑے ہیں۔ ان قوموں کے زرعی مزدور اور ان کے خاندانوں کو برسوں نجات نہیں ملتی۔۔۔ مقروض زرعی مزدوروں کی لڑکیوں کو جاگیردار اور اس کے کارندے جنسی تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔۔۔ اگر کوئی جاگیردار کے خلاف بغاوت کرنے کی کوشش کرے تو اس کا پورا خاندان جاگیردار کے غیض و غضب کا شکار بنتا ہے۔ سندھ میں ہمیں کئی ایسے واقعات کے شواہد ملے ہیں جن میں زرعی مزدوروں کا قرضہ وصول کرنے کے لیے جاگیرداروں نے ان کی عورتوں کو بھی فروخت کر دیا۔"[۲۳]

معاشی حالات کی خرابی بیشتر مسائل کا سبب بنتی ہے۔ غربت بذاتِ خود ایک سماجی مسئلہ ہے۔ اس سے نہ صرف دیگر مسائل پیدا ہوتے ہیں بل کہ غربت انسان کی سوچنے اور سمجھنے کی تمام صلاحیتوں کو بھی زنگ آلود کر دیتی ہے۔ غریب افراد جب اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل بھی نہیں کر سکتے تو بعض دفعہ غیر قانونی ذرائع اپنا لیتے ہیں۔ اس سے ملک میں جرائم اور بے راہ روی جیسے مسائل عام ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں ہر شخص اچھے اور برے حالات سے گزرتا ہے۔ ایسے میں نامساعد حالات سے گھبرانا نہیں چاہیے بل کہ مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے۔ پاکستانی عیسائی اور ہندو اقلیت کو امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کیوں کہ جو دل ناکامیوں سے مایوس ہو جاتے ہیں یا جو لوگ غربت سے گھبرا کر ہمت ہار بیٹھے ہیں جب ان کے دل میں امید پیدا ہوتی ہے تو وہ پھر سے کوشش کر کے اپنے حالات بہتر کر لیتے ہیں۔ ہندو اور عیسائی اقلیتوں کو مایوس ہرگز نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ مایوسی اگر اندھیرا ہے تو امید اس میں روشنی پیدا کر دیتی ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دنیا کا نظام امید کے سہارے ہی چل رہا ہے۔ اگر امید نہ ہو تو دنیا کے سارے کام بند ہو جائیں۔ امید انسان کے دل میں یہ حوصلہ پیدا کرتی ہے کہ دنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں ہے۔ زندگی ایک سفر ہے اس سفر کا ایک

مرحلہ طے ہوتا ہے تو دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ زندگی کا قافلہ اسی امید پر چلتا رہتا ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن ضرور اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔ محنت کرنے کا جذبہ، ترقی کی خواہش، کامیابی کی امنگ، کامیاب زندگی کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔

پاکستانی عیسائی اور ہندو اقلیتوں کو ایسی مستحکم سوچ پیدا کرنی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے انھیں فنی اور نیم فنی ہنر کی تربیت بھی دینا ضروری ہے۔ جس فرد کا رجحان جس ہنر کی طرف ہو اسے اس ہنر کی تربیت دی جائے۔ تاکہ وہ روزگار کے حصول کے قابل ہو سکے۔ اور بغیر کسی پریشانی کے اپنی معاشی ضروریات پوری کر سکے۔ اس صورت حال کو حل کرنے کے لیے مشترکہ طور پر سوچنا چاہیے۔ جس پر چل کر غربت جیسے موذی امراض پر قابو پایا جا سکے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم جہاں کہیں بھی ہوں پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کی ترقی اور خوش حالی کے لیے جذبے سے کام کریں تاکہ ہمارا ملک اقلیتوں کے تحفظ اور حقوق کے لحاظ سے سربلند ہو۔ اس سے نہ صرف وطن عزیز کی عزت میں اضافہ ہو گا بل کہ اقلیتیں بھی اپنے آپ کو خوش حال اور محفوظ تصور کرتے ہوئے زندگی گزاریں گیں۔ اگر کبھی کبھار کوئی پریشانی آ بھی جائے تو سب مل کر اس کا مقابلہ کریں۔ اتحاد جتنا زیادہ ہ گا اتنا ہی اقلیت اور اکثریت کو آپس میں ملنے کے مواقع ملیں گے اور وہ ایک دوسرے کے لیے محبت کے جذبات رکھنے کے ساتھ ساتھ مشکل وقت میں ایک دوسرے کی مدد بھی کریں گے۔

املاک پر قبضہ

اللہ تعالی نے یہ کائنات انسان کے لیے تخلیق کی۔ اسے اشرف المخلوقات بنایا اور اس دنیا میں اپنا نائب بنا کر بھیجا۔ اسے ایسی صلاحیتوں سے نوازا کہ وہ زمین و آسمان اور چاند ستاروں تک کو تسخیر کر سکتا ہے۔ تاکہ وہ اپنی ان صلاحیتوں اور خوبیوں کو پہچانے اور اپنے مقام و منصب سے باخبر ہو کر ایسے کارنامے سرانجام دے جو اللہ تعالی کی مخلوق کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بن جائیں۔ لیکن دولت اور طاقت کے نشے میں سرشار بعض خود غرض گروہ دنیاوی خواہشات کا شکار ہو کر سب کچھ بھلا بیٹھتے ہیں۔ انھیں زیادہ سے زیادہ زمین، دولت اور جائیداد کی حرص و ہوس نے اندھا کر دیا ہے۔ شام کا وقت اس چیز کا احساس دلاتا ہے کہ اب اندھیرا مزید گہرا ہونے والا ہے لہذا سب اپنے اپنے گھروں میں چلے جائیں۔ ہر ذی روح کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ جلد از جلد اپنے گھر پہنچے۔ ہلکا اندھیرا دھیرے دھیرے سنہری روشنی کو کھانے لگتا ہے۔ سڑکوں پر ٹریفک کم ہونے لگتی ہے۔ دکانوں، گھروں اور بازاروں میں بجلی کے بلب آن ہو جاتے ہیں۔ اندھیرا گہرا ہوتے ہی تمام لوگ اپنے اپنے گھروں میں

میٹھی نیند کے مزے لیتے ہیں۔ باہر ہر طرف ویرانی کا منظر ہوتا ہے۔ اور اگر کسی انسان کو اس کے گھر سے بے دخل کر دیا جائے تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام رونقیں ختم ہو گئی ہیں۔ وہ گہرے سائے سے ایک دم چلچلاتی دھوپ میں آ گیا ہے۔ دنیا کی تمام خوشیاں اس سے روٹھ گئی ہیں۔ وہ بے سائباں ہو گیا ہے۔ اب حالات پہلے جیسے اچھے نہیں رہے بل کہ کٹھن ہو گئے ہیں۔ اس کی زندگی بھر کی جمع پونجی اور محنت سے بنایا گیا ٹھکانہ عیار اوراور چالاک گروہ کی نذر ہو گیا ہے۔ اب اس کی زندگی کے باقی دن کیسے گزریں گے۔ غریب پاکستانی عیسائی اقلیتی افراد اپنا خون پسینہ ایک کر کے اپنا پیٹ کاٹ کر مشکل سے سر چھپانے کا ٹھکانہ بناتے ہیں۔ غربت و تنگ دستی میں ایک ایک روپیہ جمع کر کے۔ اگر اس پر بھی قبضہ کر لیا جائے تو اس سے زیادہ شرم ناک بات کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ ان لوگوں کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ لیکن ان کا ضمیر تو مر چکا ہوتا ہے۔ ان کو زمین اور جائیداد جمع کرنے کی لالچ نے اندھا کر دیا ہوتا ہے۔ "کہر" محمد الیاس کا ناول ہے۔ جو ۲۰۱۰ء میں سنگ میل پبلی کیشنز نے لاہور سے شائع کیا ہے۔ محمد الیاس نے تقسیم ہند سے لے کر اسی کی دہائی تک کے پاکستان کے حالات کو اس ناول کا موضوع بنایا ہے۔ خان اسلم ضلع امرتسر کے ایک معروف گھرانے کا فرد تھا۔ اپنے آبائی علاقے میں اس کی ایک شناخت تھی۔ وہاں بڑا امیر آدمی تھا۔ ہجرت کرنے کے بعد یہاں آ کر بھی خان اسلم کو ایک حویلی اور اسی کے مضافات میں پھیلے ہوئے بارانی زرعی رقبے کے علاوہ قصبے سے آٹھ میل دور دریا کی سمت ایک وسیع قطعہ زمین بھی الاٹ ہوا۔ لیکن مزید زمین کی ہوس نے اسے اندھا کر دیا تھا۔ وہ اپنی حویلی کے قریب رہنے والے عیسائی اقلیت کی زمین بھی ہتھیانا چاہتا تھا۔ تا کہ ارد گرد کا سارا علاقہ اس کی ذاتی ملکیت بن جائے۔ اس حوالے سے محمد الیاس کے ناول "کہر" سے اقتباس دیکھیے:

> "حویلی کے عقب اور سڑک کے دائیں بائیں آبادی سے ملحقہ رقبہ خاص طور پر مستقبل قریب میں بڑا قیمتی ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے عین وسط میں بیس کے قریب عیسائی خاندان ایک لحاظ سے مستقلاً آباد ہو چکے تھے۔ دیوان صاحب نے ان غریب لوگوں کو خود ہی اجازت دی تھی۔ اور انھوں نے یہاں بے ترتیب سے نیم پختہ ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ خان اسلم کے ذہن میں مستقبل کا جو فوری خاکہ ترتیب پا رہا تھا، اس میں یہی کچی آبادی رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔۔۔۔ وہ حویلی سے متصل سڑک کے بائیں ہاتھ سارا رقبہ مستقبل کے منصوبوں کے لیے مختص کر چکا تھا۔"[۲۴]

بے گھر ہونے والا انسان ایک ایسے دکھ اور درد میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کا دنیا میں کوئی علاج نہیں۔ جو تکلیف اور اذیت اسے پہنچتی ہے اسے کوئی دوسرا محسوس نہیں کر سکتا۔ کیسی دوسرے کی چیز پر دھوکے سے یا زبر دستی قبضہ کرنا بد اخلاقی، خود غرضی اور جہالت ہے۔ وہ دنیا کی نظروں میں ایک چال باز اور ذلیل انسان ہے۔ کیوں کہ جبراً دوسروں کی جائیداد پر قبضہ کرنا ایک بہت بڑی برائی ہے۔ اس دنیا میں کوئی شخص خواہ کسی بھی حیثیت کا مالک ہو، کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، اسے اپنی زندگی احسن طریقے سے گزارنے کا پورا حق حاصل ہے۔ پاکستانی عیسائی اقلیت کی اکثریت بنیادی ضروریات کے حصول سے محروم رہتی ہے۔ ان کی حالت پہلے ہی ناگفتہ بہ اور قابل رحم ہے۔ یہ سماج بالا دست اور محروم طبقات پر مشتمل ہے۔ ایک طرف اگر مال و دولت کی ریل پیل ہے تو دوسری طرف چھوٹی چھوٹی ضروریات زندگی کو ترستے ہوئے لوگوں کا انبوہ ہے۔ جن کے پاس دولت و طاقت ہے انھیں اختیارات کے اندھے استعمال نے بے حس اور بے رحم بنا دیا ہے۔ مظلوم طبقات کی طاقت وہمت خود ان کی زندگیوں میں تو کسی بھی نوع کی تبدیلی کا باعث نہیں بنتی لیکن دولت مندوں کے سامان راحت کا ذریعہ ضرور بنی رہتی ہے۔ اگر کسی بھی انسان کا سر چھپانے کا ٹھکانہ چھین لیا جائے تو وہ ایک مسلسل اضطراب میں دکھائی دیتا ہے۔ اس غیر یقینی حالات اور ماحول میں ایک حساس اور اقلیتی شخص خود کو بالکل تنہا خیال کرتا ہے۔ اسے رہ رہ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے لوگ بلا وجہ اس پر ہنس رہے ہیں۔ اس نے کسی کو ناراض نہیں کیا ہوتا پھر بھی اسے یوں لگتا ہے جیسے کوئی اس سے خوش نہیں ہے۔ حالاں کہ اس نے کبھی کسی بھی فرد کو شکایت کا موقع نہیں دیا ہوتا۔ "ڈاکٹر مبارک علی" اس حوالے سے یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> " آہستہ آہستہ سماجی رتبہ بلند کرنے، معاشرے میں اہمیت حاصل کرنے، اور اپنی نئی شناخت کو بنانے کے لیے ایک ہی صورت تھی کہ کسی طرح سے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کی جائے اور اس کے سہارے معاشرے میں باعزت مقام حاصل کیا جائے۔ جب دولت، عزت، عظمت اور شرافت کا معیار بنا تو اب اس میں سب ہی شریک ہو گے۔ لہٰذا ہر جائز اور ناجائز طرح سے دولت کا حصول زندگی کا مقصد ہو گیا۔"[۲۵]

حکومت تمام لوگوں کی تہذیب و ثقافت، زمین و جائیداد، روایات، رسومات اور جان و مال کی محافظ ہوتی ہے۔ تا کہ تمام لوگ ایک کنبے کی حیثیت سے پر سکون زندگی گزار سکیں۔ محبت، قرب، یگانگت اور اخوت کے جذبات پیدا ہوں۔ لیکن بعض لوگوں کی فطرت میں خود غرضی شامل ہوتی ہے۔ اور جہاں خود

غرض انسانوں کا ایک گروہ جمع ہو جائے اور ان کی بعض سرگرمیاں مشترکہ ہو جائیں تو وہاں اس قسم کے مسائل سر اٹھاتے ہیں۔ یہ مسائل عام مسائل نہیں ہوتے جنھیں نظر انداز کیا جاسکے۔ بل کہ ان کے حل اور تدارک کے لیے حکومت کو ایک جامع منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ یہ مسائل بڑھتے چلے جائیں گے۔ اور پاکستانی عیسائی اقلیتوں کی زندگی پر بری طرح اثر انداز ہوں گے۔

انسان کو صدیوں کے تاریخی عمل کے بعد سب سے پہلے گھر بنانے کا شوق پیدا ہوا۔ اس کے بعد اس نے ایک طویل جدوجہد کے بعد ایک چھوٹے سے سماج کی تشکیل کی اور اپنے گھر کو اس کا ایک حصہ بنایا۔ گھر ہر انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے۔ بے گھر پاکستانی عیسائی اقلیتوں کی زندگیوں کا نقشہ الفاظ کی صورت میں کھینچنا بہت مشکل ہے۔ انھیں مشکلات کا شکار کرنے والے خود پستیوں کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک وقت آئے گا وہ خود عروج کی بلندیوں سے زوال کی پستیوں میں دھنس جائیں گے۔ ابھی تو یہ دولت وطاقت کے نشے میں دھت ہیں۔ جو عارضی اور وقتی ہے۔ اس کائنات میں بسنے والے تمام انسان ایک دوسرے کے ساتھ کسی نہ کسی رشتے میں منسلک ہیں۔ کسی سے ہمارا ہم مذہب ہونے کا رشتہ ہے، تو کسی سے ہم وطن ہونے کا۔ اور اس سب سے بڑھ کر ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ انسانیت کا رشتہ قائم ہے۔ اس دنیا کا نظام ان رشتوں کے باہمی میل جول اور لین دین کے سبب باہمی تعلق کی بنا پر قائم ہے۔ یہ سب کے سب رشتے حقوق کی نازک ڈوری سے بندھے ہوئے ہیں۔ ان حقوق میں ذرا سی غفلت اور ذرا سی چوک رشتوں میں بگاڑ کا سبب بن سکتی ہے۔ خان اسلم نے پا کھڑا پہلوان کو کئی بار دیکھا تو دل ہی دل میں اس کی منفرد اور مضبوط شخصیت کا اندازہ قائم کر لیا تھا۔ جب اس نے پا کھڑا پہلوان کے بارے میں ارد گرد سے رائے لی تو پتہ چلا کہ مسیحی برادری میں یہ شخص خاصہ اہم ہے۔ اور اپنے حلقے میں بڑا اثر رسوخ رکھتا ہے۔ خان اسلم کے شاطر دماغ نے بڑی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ اس شخص کو اپنا دوست اور حمایتی بنایا جائے تاکہ زمین پر قبضہ کرنے میں آسانی ہو۔ ناول "کہر" سے املاک پر قبضے کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کریں:

> "جب پا کھڑا پہلوان خان اسلم کا سالہ بنا تو سب سے پہلے اس نے اپنے ہی لوگوں کی مار کٹائی کر کے منہ بولی بہن کی زمین کا قبضہ حاصل کیا۔ خان اسلم اور زرینہ بیگم کو بہت بڑا چیلنج درپیش تھا۔ بہت محفوظ اور روشن مستقبل انھیں واضح طور پر نظر آرہا تھا۔
>
> دونوں کی خوابیدہ صلاحیتیں بھی پوری طرح بیدار ہو چکی تھیں۔ "(۲۶)

اتحاد قوت و طاقت کا ذریعہ ہے اور نا انصافی، انتشار، کمزوری اور زوال کا پیش خیمہ ہے۔ پاکستانی عیسائی اقلیتوں کی تعمیر و ترقی، خوش حالی کا دارومدار اتحاد پر ہے۔ اگر اقلیت متحد ہوں تو کوئی حریف دشمن انھیں مغلوب نہیں کر سکتا۔ اور اگر اتحاد نہ ہو تو دشمن آسانی سے زیر کر لیتا ہے۔ جس طرح ناول "کہر" میں پا کھڑا پہلوان نے خان اسلم اور اس کی بیوی کے جھانسے میں آکر اپنے ہی لوگوں کو دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا۔ اگر کبھی پاکستانی عیسائی اقلیتوں پر برا وقت آن پڑے تو اکثریت کو ان کے ساتھ مل کر، اکٹھے ہو کر، بل کہ یک جان ہو کر بُرے وقت اور بُرے لوگوں کا مقابلہ کرنا ہو گا اور ان کی عزت اور املاک کی حفاظت کی خاطر ہر طرح کی مدد کرنی چاہیے۔

شام کے کے سائے پھیلتے ہی انسان ڈوبتے ہوئے سورج کے منظر میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کو اپنے ارد گرد کا ماحول یکسر تبدیل نظر آتا ہے۔ اس کے چاروں اطراف سنہری مائل روشنی رقص کناں ہونے لگتی ہے۔ رات افق سے اتر کر زمین پر رینگنے لگتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی انسان تو انسان پرندے بھی اپنے گھونسلوں کا رخ کرتے ہیں۔ اور اگر بدقسمتی سے کسی سے اس کا آرام و سکون والا گھر بھی چھین لیا جائے تو وہ تھکے ہارے قافلے کی طرح کہیں اور جانے کا عزم سفر باندھے دکھائی دیتا ہے۔ اور اسے یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ قسمت اسے کہاں لے کر جا رہی ہے۔ پتہ نہیں کتنی ٹھوکریں اور دربدری اسے جھیلنا پڑے گی۔ کیوں کہ انسان دن بھر کی تھکن اور کام کے بوجھ کی بدولت اکتاہٹ اور تھکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ اور جیسے ہی رات ہونے لگتی ہے اور اس کے ذہن میں سکون اور آرام کا تصور جگمگانے لگتا ہے۔ انسان کو رات کا وقت اس لیے بھی اچھا لگتا ہے وہ وقت دنیا کے جھمیلوں، مشکلوں اور فرائض کی ادائیگی سے جان چھڑا کر سکون کی نیند سو جاتا ہے۔ اور آرام طلبی کے مزے لیتا ہے۔ روزمرہ زندگی میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر کتنی ہی تلخ اور ترش باتیں ایسی ہیں جو باہمی معاملات کے دوران سنی اور کہی جاتی ہیں۔ ان کا اظہار لوگوں کے عمومی رویوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اور ایک حساس شخص ان تلخ باتوں سے اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کے علاوہ کوئی بھی شخص جن تلخ تجربات سے گزرتا ہے اس کے اظہار سے عموماً گریز کرتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی مجبوراً تلخی کو زبان پر لانا پڑتا ہے۔ اس طرح کے طرز عمل کے دوران ظاہر ہے اسے مخالف سمت سے شدید رد عمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ سچ سننے کی تاب ہر کسی میں نہیں ہوتی۔ عیسائی اقلیت بھی پاکستان کا ایک حصہ ہیں ان کے ساتھ نہ صرف

اچھے تعلقات ناگزیر ہیں بل کے ایک مشترکہ نصب العین بھی ضروری ہے۔ یہی وطن پرستی کا تقاضا ہے۔ "سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں" میں اس حوالے سے لکھا ہے۔:

> "اقلیتوں کے حوالے سے اصل مسئلہ آئین کا نہیں، سماجی رویوں کا ہے ۔۔۔جب اکثریت اقلیتوں کو یکساں حقوق دینے پر آمادہ ہو جائے۔جب شہری غیر مسلموں کو اپنے جیسا شہری سمجھیں گے تو پھر کوئی آئینی رکاوٹ ان کے حقوق کے راستے میں حائل نہیں ہو گی۔"(۲۷)

اگر انسان کے اندر خوشی کا سماں ہو تو وہ باہر کی اداس فضا میں بھی خود کو مسرور رکھتا ہے۔اس کے برعکس اس کا دل اندر سے غمزدہ ہو تو پھر اس کے لیے باہر کی دنیا میں لاکھ خوشیوں کے میلے لگے ہوں بے کار ہیں۔اسے رونقوں سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔

موجودہ ذرائع آمد و رفت اور سڑکیں وغیرہ نہ ہونے کے باعث پرانے زمانے میں لوگ قافلوں کی صورت میں سفر کیا کرتے تھے۔ڈاکو اور لٹیرے ان کے راستوں میں گھات لگا کر بیٹھ جاتے تھے اور موقع ملنے پر انھیں لوٹ لیتے۔اور ان کے مال و اسباب سے انھیں محروم کر دیتے۔لیکن اب وقت بدل چکا ہے ذرائع آمد و رفت بھی بے تحاشا ہے۔کوئی بھی قافلوں کی صورت میں سفر نہیں کرتا۔لیکن ڈاکو اور لٹیرے اب بھی موجود ہیں ذرا جدید شکل میں۔مثلاً اب ڈاکو اور لٹیرے سرعام پاکستانی عیسائی اقلیتوں کو ان کی املاک سے انھیں محروم کر رہے ہیں اور ان فرعونوں کو کوئی بھی پوچھنے والا نہیں۔بظاہر کوئی شمس الحق گیلانی کی طرح پیر، فقیر کے روپ میں چھپا بیٹھا ہے۔اور ولیم کو اس کے گھر سے محروم کر دیتا ہے۔اور دنیا کے سامنے ایک پارسا کے روپ میں دکھائی دے رہا ہے۔اور کوئی دولت مند اسلم خان کی شکل میں جو بظاہر بہت نمازی اور پرہیز گاری کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔اور غریب عیسائی اقلیتوں کے ساتھ چال چل کر ان کی زمین اور گھروں کو ہتھیا لیتا ہے ۔ یہ فرعون نما لوگ اپنے عبرت ناک انجام سے بالکل بے خبر ہو کر یہاں کی آسائشوں اور سہولتوں کے حصول میں اس قدر کھو گئے ہیں کہ اپنے گناہوں کے بوجھ میں اضافہ کرنے کے لیے ان مفلوک الحال اقلیتوں کی زمین و جائیداد بھی ہتھیا رہے ہیں۔وہ یہ بھول گئے ہیں کہ جو مال و اسباب ،زمین و جائیداد وغیرہ وہ دھوکہ دہی سے جمع کر رہے ہیں موت کی وادی میں اترنے کے بعد ان سے سب کچھ چھن جانا ہے۔اور یہاں سے خالی ہاتھ رخصت ہونا ہے۔وہ اس دنیا کی حقیقت سے باخبر ہونے کے باوجود دنیاوی مال و دولت اور مرتبے کے

حصول کے لیے ناجائز طریقوں سے دن رات ایک کر رہے ہیں۔ لیکن جس وقت موت کا بلاوا ان کے سر پر آن پہنچا تو سب شان و شوکت، مال و اسباب یہیں چھوڑ کر بے بسی کے عالم میں اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا پڑے گا۔ اس کائنات میں صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو اس دنیا میں گزارے اپنے ایک ایک لمحے اور ایک ایک عمل کا حساب کتاب دینے کی پابند ہے۔ ظاہر ہے جس مخلوق کو عقل و شعور سے نوازا گیا ہو اور وہ ذمہ دار بھی ہو اور زندگی میں اپنے کیے ہوئے اعمال کے لیے اللہ رب العزت کے سامنے جواب دہ بھی ہو تو پھر اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس دنیا میں بڑی احتیاط سے رہے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھے اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جو اسے غلط سمت لے جائے تاکہ اسے جواب دہی کے وقت شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ انسانی معاملات کے علاوہ انسانی تعلقات بھی اتنے نازک ہوتے ہیں کہ ذرا سی بات سے دلوں کے آئینے چور چور ہو سکتے ہیں۔ اس لیے بات کرتے وقت بھی اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس سے کسی کے دل کو ٹھیس نہ پہنچے۔ کیوں کہ زبان کا زخم تلوار کے زخم سے کہیں زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ اس کائنات کی نزاکت، لطافت اور خوب صورتی یہاں پر انسانوں کے بے حد محتاط رہنے سے ہی قائم رہ سکتی ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان بنیادی طور پر خود غرض ہے۔ ہر شخص کو اپنے دکھوں اور مصیبتوں کی پڑی ہوتی ہے کوئی بھی دوسروں کے دکھ درد کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ اگر لوگ دوسروں کے دکھوں اور تکلیفوں کو جاننے کی کوشش کریں تو انھیں اندازہ ہو گا کہ ان سے بھی دکھی اور غم زدہ بل کہ حالات کے ستم زدہ لوگ اس وطن عزیز میں موجود سانس لے رہے ہیں۔ ولیم نے جب کیتھی اور بچوں کو ہمیشہ کے لیے لندن رخصت کیا تھا اس وقت جذبات کا بہاؤ اتنا زیادہ تھا کہ زیادہ پرواہ نہیں کی تھی۔ ولیم کو لگتا تھا کہ لندن کی نسبت وہ یہاں زیادہ پر لطف زندگی گزاریں گے۔ لیکن کیتھی نے اس کی ایک نہ مانی اور ولیم بھی اپنی ضد پر اڑا رہا کہ وہ نولکھی کوٹھی کو چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جائے گا۔ اور یوں اس مٹی سے محبت کی وجہ سے اس نے سارے جان سے عزیز رشتے ہمیشہ کے لیے کھو دیے۔ اور آخر کار دھوکہ دہی اور زبردستی اس کی نولکھی کوٹھی بھی سیاست کی نذر ہو گئی اور وہ خالی ہاتھ رہ گیا۔ علی اکبر ناطق کے ناول "نولکھی کوٹھی" سے اقتباس دیکھیے:

> "اگلے دن ولیم ابھی بستر میں ہی تھا کہ باہر سے کچھ شور شرابے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں بالکل قریب کوٹھی کے صحن سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ دیکھا تو کئی آدمی ایک ٹریکٹر ٹرالی سے نیچے اتر کر صحن میں گھوم رہے تھے۔ ارد گرد سے کوٹھی کا جائزہ لے رہے تھے اور شور شرابہ کر رہے تھے۔ پولیس کی ایک گاڑی میں چھ سات

سپاہی بھی آئے تھے۔ ان کے علاوہ ایک دو کاریں تھیں۔ لیکن اب تمام لوگ گاڑیوں سے باہر نکل کر صحن میں آ گئے تھے۔ ولیم نزدیک پہنچا تو ایک شخص آہستہ رفتار سے آگے ہو کر اس کی طرف بڑھا اور ایک فائل ولیم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا، ولیم صاحب، میں یہاں کا علاقہ مجسٹریٹ ہوں، آپ ان کاغذات پر دستخط کر دیں کہ یہ کوٹھی آپ ابھی خالی کر رہے ہیں۔ گورنمنٹ پنجاب نے یہ کوٹھی جناب سید شمس الحق گیلانی کے نام الاٹ کر دی ہے۔ آپ اپنا جو کچھ سامان اٹھا کر لے جانا چاہتے ہیں اس کی اجازت ہے۔ اس شخص کے یہ الفاظ سن کر ولیم کے اوسان گویا بالکل جاتے رہے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ جیسے کسی نے سر پر ایک زوردار ضرب لگائی ہو۔۔۔ ولیم پر یہ سکتہ کچھ ہی لمحوں تک جاری رہا۔ وہ فوراً اس کیفیت میں داخل ہو گیا، جہاں ہر چیز نہ چاہتے ہوئے بھی سمجھ آ جاتی ہے۔"[۲۸]

ولیم بظاہر اپنے دکھوں اور بے بسی کا شکوہ کرتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس کا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ یہ کیسی مصیبت کی گھڑی آن پہنچی ہے کہ اپنے آشیانے کو ترس جاؤں گا۔ اس کوٹھی کے ساتھ اس کی خوشیاں، آخری امید، آخری سہارا اور خوب صورت یادیں وابستہ تھیں۔ جہاں اس نے ایک مکمل اور پر سکون زندگی بسر کی تھی۔ جہاں اس کے بچوں کی قلقاریاں اور کھیلنے کودنے کی آوازیں ابھی بھی اسے سنائی دیتی تھیں۔ لیکن اب وہ بے بسی کے ساتھ اپنے بے گھر ہونے کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اور بے کسی و بے چارگی کی تصویر بن گیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم کا اظہار اگرچہ کھلے لفظوں میں نہیں کر رہا تھا لیکن اس کا دل گریہ زاری کر رہا تھا۔

اس گھر میں اچھی یادوں کے کتنے ہی تاج محل تعمیر تھے۔ کتنی آرزوؤں کے ساتھ اس کو سجایا اور بنایا ہوا تھا۔ لیکن اب سب کچھ فضا میں بکھرنے والا تھا۔ وہ گھر اس کے بڑھاپے کا واحد آخری سہارا تھا۔ مگر فرعون نما انسانوں نے اس کی آخری امید کا دیا بھی بجھا دیا اپنی لالچ و حرص کی وجہ سے۔ ولیم ایک کمزور عام سا بندہ تھا اس کا گھر چھن جانے کے بعد اسے طرح طرح کی تکلیفیں سہنا پڑی تھیں۔ قدم قدم پر دکھ اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اسے ہزار طرح کے امتحانوں اور آزمائشوں سے گزرنا پڑا تھا۔ سر چھپانے کا ٹھکانہ نہ ہو تو انسان فکروں اور مسائل کا شکار ہو جاتا ہے۔ ولیم کو بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی آفت ناگہانی اس کے سر پر آن پڑی ہے۔ اب اسے بیوی اور بچوں کی جدائی بہت ستا رہی تھی۔ اور اب گھر بھی چلے جانے سے وہ مزید بوڑھا، کمزور اور لاغر ہو گیا تھا۔ اس کا یہاں رہنے کا جوش و جذبہ ماند پڑنے لگا تھا۔ جوش پر ہوش غالب آنے لگا تھا۔ اس

کا ضبط و تحمل ختم ہو تا جارہا تھا۔ یہ دور اگرچہ عقل و شعور کی پختگی کا ہو تا ہے۔ لیکن ولیم کے قوی اعصاب آخری سائبان کے چھن جانے کی وجہ سے شل ہوتے جارہے تھے۔ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو تا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ دکھوں اور مصیبتوں کو سہتے سہتے ولیم میں اتنی کمزوری اور ناتوانی آگئی تھی کہ اب اسے اپنی زندگی کا چراغ کسی بھی وقت بجھتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ پتہ نہیں کب زندگی کی ڈور ٹوٹ جائے گی۔ اسے اپنا آپ چراغ سحری کی مانند لگ رہا تھا۔ کیا ہو تا اگر اس کی زندگی کا چراغ گل ہونے کی آخری گھڑی میں اسے اس کے گھر سے محروم نہ کیا جاتا۔ تاکہ وہ سکون اور آرام سے اطمینان کے ساتھ اسی گھر میں زندگی کے آخری دن گزار لیتا۔ جس کی خاطر اس نے اپنے لخت جگروں اور اپنی شریک حیات کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا لیکن اس مٹی اور گھر کی محبت میں خود نہ گیا۔ وہ اس گھر، جگہ اور وطن کی محبت میں اپنا وطن بھول گیا لیکن اسے بہت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے چمن کے پھولوں کی مہک پورے گھر میں پھیل جاتی تھی۔ جس سے سارا گھر مہک اٹھتا تھا۔ مگر اب ولیم کو ہر طرف خزاں کا موسم نظر آرہا تھا۔ باغ کی ساری رونقیں ماند پڑ گئی تھیں۔ جس طرح پھولوں کی زندگی اور بہار کے موسم کا دورانیہ مختصر اور تھوڑے عرصے کے لیے ہو تا ہے۔ یہی حال ولیم کی زندگی میں آنے والی خوشیوں اور مسرتوں کا ہوا۔ اس کی زندگی میں خوشی اور مسرت کے لمحے بہت ہی مختصر اور تھوڑے عرصے کے لیے آئے جب کہ دکھوں اور اداسیوں نے اسے گھیرے رکھا۔ ولیم نے تمام مشکلات و مصائب اور ظلم و ستم کو صبر اور حوصلے سے برداشت کیا۔ جس کی وجہ سے دنیا کی نظروں میں اس کی وقعت بڑھ گئی۔ بدبختی اور بدقسمتی پاکستانی عیسائی اقلیت کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔ سب کچھ ان کی آرزوؤں کے برعکس ہو رہا ہے۔ اور جبراً کیا جارہا ہے۔ تمام پاکستانی اکثریت کو اپنے دل میں ان لوگوں کے لیے نرم گوشہ پیدا کرنا چاہیے تاکہ ان کی ساری تکلیفیں راحت اور خوشی میں تبدیل ہو جائیں۔ "سماج ریاست اور مذہبی اقلیتیں" میں اس معاملے پر یوں روشنی ڈالی گئی ہے:

> "اگر پاکستان کے معاملات ایک "قومی جمہوری ریاست" کی حیثیت سے چلائے جائیں تو مسلم اکثریت کے ساتھ ساتھ غیر مسلم اقلیتوں کو بھی برابر کے شہری کی حیثیت سے حقوق مل سکتے ہیں۔ ریاست پر اقلیتوں کے ایک ثابت شدہ حق کی نفی کے بعد کسی قسم کی دیگر یقین دہانیاں اقلیتوں کے مسائل کو حل نہ کر سکیں گی۔ اقلیتوں کو ان کی اپنی ریاست پر حاصل حق سے محروم کر دینا کسی طور پر جائز اقدام نہیں۔"(۲۹)

ان دولت کے پجاریوں کو اگر وقت پر لگامیں نہ ڈالیں تو ملک میں انتشار پھیل جائے گا۔ نہ کسی پاکستانی اقلیت کی جان محفوظ رہے گی اور نہ مال۔ سماج میں جنگل کا قانون بن کر رہ جائے گا۔ جب تاریکی کے سائے چاروں جانب پھیلنے لگتے ہیں تو انسان تو انسان پرندے بھی اپنے گھونسلوں میں واپس پہنچنے کے لیے پرواز شروع کر دیتے ہیں۔ اور اگر انسان کا گھر اس سے چھین لیا جائے تو دہشت انگیز مناظر اسے اپنے چاروں طرف گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ بااثر گروہ مکر و فریب میں مبتلا ہیں اور پاکستانی عیسائی اقلیتوں کے ساتھ منافقت کر رہے ہیں ۔ ان کی دغابازی کو توڑنا اور دنیا کے سامنے لانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں حرس و ہوس کا جو کاسہ ہے اس کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کرنا لازمی ہیں۔ انھیں اپنا یہ طرز زندگی چھوڑنا ہو گا اور محبت کو عام کرنا ہو گا۔ "ول کیملیکا" لکھتے ہیں کہ ایک لبرل جمہوریت کی سب سے بنیادی وابستگی اس کی انفرادی شہریوں کی آزادی اور مساوات ہے۔ حقوق کے آئینی بلوں میں یہ تمام چیزیں موجود ہیں ۔ جو تمام افراد کو بنیادی، شہری اور سیاسی حقوق کی ضمانت دیتے ہیں۔ ان کا تعلق چاہے جس مذہب سے بھی ہو۔ پاکستانی عیسائی اقلیتوں کو ان بڑی طاقتوں سے ہر گز ڈرنا نہیں چاہیے۔ تاکہ ان کے مذموم مقاصد خاک میں مل جائیں۔ اگر دنیا بھر کی دولت ان لالچی لوگوں کی جھولی میں ڈال دی جائے یہ پھر بھی کسی کو سکون سے نہیں رہنے دیں گے اور نہ خود سکون سے بیٹھیں گے۔ ان کا مقابلہ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ وطن عزیز میں بسنے والے اقلیت اور اکثریت سبھی ایک ہیں۔ اس ملک کے اندر رہنے والے تمام لوگ یوں ہیں جس طرح ایک باغ کے تمام پھول مل کر باغ کی خوب صورتی کا باعث بنتے ہیں۔ اسی طرح سے اکثریت اور اقلیت وطن عزیز پاکستان میں خوب صورت پھولوں کی طرح ہیں۔ ہماری خوشیاں اور غم ایک ہیں۔ ایک دوسرے کی خوشیاں بر قرار رکھنے کے لیے ہمیں ہر طرح کی قربانی دینی چاہیے۔ ہمیں اپنے اندر اتحاد پیدا کرنا چاہیے، اور ان کی املاک اور عزت کو ایسے ہوس کے پجاریوں سے ہر صورت بچانا چاہیے۔ ان لوگوں کو ایک ایسے پھل دار درخت کی طرح ہونا چاہیے جو اپنے پھل، اور لکڑی غرض ہر طرح سے اقلیتوں کو فائدہ پہنچائیں۔ مال و دولت جمع کرنے کے بجائے اپنی کمائی سے ان غریب مستحق عیسائی اقلیتوں کا بھی حصہ کریں۔ بجائے اس کے کہ ان غریبوں کی آہوں سے گمنامی کے گہرے سمندر میں اتر جائیں۔ بل کہ انھیں ایک چراغ کی مانند ہونا چاہیے جس کا کام روشنی پھیلانا ہے۔

جبری مشقت

آج کے سماج میں سماجی انصاف کا بہت شہرہ ہے۔ ہر ملک کے دستور میں سماجی انصاف کے لیے شقیں رکھی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود عصر حاضر کا انسان سماجی انصاف سے محروم جبری مشقت کی چکی میں پس رہا ہے۔ اس کے باوجود کہ دستور میں عدل و انصاف کی ضمانت اور ظلم کے خلاف تحفظ کے بلند و بانگ دعوے موجود ہوتے ہیں۔ پھر بھی جنگل کے قانون کی طرح ظلم کا بازار گرم رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دستور پر عمل درآمد کرنے والے ہاتھ مخلص نہیں ہیں۔ یہ لوگ منصف بن کر انصاف سے محروم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دلوں سے خدا کا خوف اٹھ گیا ہے اگر کسی سماج میں سماجی انصاف ختم ہو جائے تو پورے سماج کا امن و امان تہ و بالا ہو جاتا ہے۔ اعلی اقدار مٹ جاتی ہیں۔ جیسا کہ آج کے ترقی یافتہ سماج میں بھی یہ صورت حال سامنے آرہی ہے۔ پاکستانی آئین میں بھی اقلیتوں کو تحفظ دینے کے لیے قانون موجود ہیں۔ مگر صرف آئین کی حد تک۔ اگر ان قوانین پر عمل بھی ہو تو پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کی زندگیاں بھی خوش حالی سے جگمگا رہی ہوتیں۔ جس طرح ایک تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان وڈیروں، جاگیرداروں، بھٹہ مالکان اور بااثر گرہوں کے بھی دو رخ ہوتے ہیں۔ یعنی کہ وہ جب ٹی وی میں یا کسی بھی ٹاک شو میں یا اخبار میں یا پھر رسالے کے لیے انٹرویو دیتے ہیں تو وہ ایسی خوب صورت باتوں کے پھول بکھیرتے ہیں کہ لگتا ہے ان جیسا شفیق نرم دل اور قوم کی خدمت کرنے والا اور وطن کی محبت کے جذبے سے سرشار اور کوئی ہے ہی نہیں۔ اور دوسرا رخ ان کا انتہائی شرم ناک اور دل دہلا دینے والا ہے۔ اُنھوں نے غریب پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کو اپنا غلام بنا کر رکھا ہے اور جبری مشقت کا خطرناک زہر ان کی ساری نسلوں کی رگوں میں انڈیل رہے ہیں۔ اور یہ زہر ان کے لیے اس قدر خطرناک ہے کہ وہ چاہ کر بھی اس سے جان نہیں چھڑا سکتے۔ صرف موت کی وادی میں اترنے کے بعد ہی ان کی جان ان زہریلے سانپوں سے چھوٹتی ہے۔ صفدر زیدی کے ناول "بھاگ بھری" میں بھاگ بھری کے باپ نے اپنا بیل مرنے کے بعد دوسرا بیل خریدنے کے لیے وڈیرے حیدر شاہ سے قرضہ لیا اور یوں وڈیرے کے بچھائے ہوئے معاشی جال میں پھنس گیا۔ بھاگ بھری نے وڈیرے حیدر شاہ کی زمین پر بنی ایک چھوٹی سی کٹیا میں آنکھ کھولی تھی۔ اب یہ خاندان قرضہ ادا کیے بغیر اس گاؤں کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہ علاقہ اب ان کے لیے کھلا زندان تھا۔

ناول "بھاگ بھری" سے جبری مشقت کا اقتباس دیکھیے:

"بھاگ بھری نے آنکھ کھلتے ہی ماں کو کھیتوں میں کام کرتے دیکھا تھا۔ سو اس نے بھی بچپن سے ہی ماں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔"(۳۰)

جبری مشقت ایک ایسی قید ہے جس میں موسم کتنا بھی دل کش اور خوب صورت ہو دل ہمیشہ ہی غمگین رہتا ہے۔ وہ غم زدہ اور دکھے ہوئے دل کی چیخ و پکار کسی کو چاہ کر بھی سنا نہیں سکتے۔ صرف سہہ سکتے ہیں۔ بے زبان جانور کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ صرف یہ سوچ سکتے ہیں کہ کاش میری رہائی میرے بس میں ہوتی اور میں اڑ کر اس وحشت زدہ ماحول سے کہیں دور چلا جاتا۔ لیکن وہ اپنی قسمت پر صرف افسوس ہی کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی دکھ بھری کہانی اور مصیبت کا حال سنائیں بھی تو کس کو۔ ان لوگوں کا کام بڑا صبر آزما اور حوصلہ شکن ہوتا ہے۔ ان کو بڑی بڑی تکلیفوں اور کھٹن مراحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ انھیں اپنی رہائی کی کوششوں کی راہ میں ان ظالموں اور جابروں کی مخالفت کا خدشہ لاحق رہتا ہے۔ ان کو مفاد پرست گروہوں کی ریشہ دوانیوں سے باخبر کرنے والا کوئی ذریعہ بھی نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ان کی ہر سرگرمی پر نظر رکھی جاتی ہے کہ کہیں وہ کسی مشکوک سرگرمی میں مصروف تو نہیں۔ ان لوگوں کو اپنا ذاتی انداز فکر، خیالات اور جذبات و احساسات کو بالائے طاق رکھنا پڑتا ہے۔ سیر و تفریح اور کھلی فضا میں سانس لینا، اپنی آرزوؤں، امنگوں اور خواہشوں کو پورا کرنا ہر خاص و عام کی دلی خواہش ہوتی ہے۔ اور ان تمام وجوہات کی وجہ سے وہ کچھ وقت کے لیے سماج اور ماحول کے دباؤ سے آزاد ہو کر مسرت میں کھو جاتا ہے۔ ہنسی مذاق کرتا ہے۔ کیوں کہ ہنسی مذاق کی باتیں دماغ کو کوفت سے دور کرتی ہیں۔ تھکے ماندے لوگوں کی طبیعتیں پر فضا مقام پر جانے سے شاد ہو جاتی ہیں۔ اور ان کو دل و دماغ کو فرحت بخش احساس ہوتا ہے۔ جس سے طبیعت کی افسردگی اور بیزاری دور ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ سارا دن کام کرنے سے انسان تھک جاتا ہے لیکن جبری مشقت کرنے والے پاکستان کی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کو ایسی کوئی سہولت میسر نہیں وہ سارا دن کام کرنے کے بعد تھک ہار کر سو جاتے ہیں۔ اگلے دن پھر صبح سے لے کر شام تک اپنے اہل و عیال سمیت جبری مشقت جیسے زہر کو پیتے ہیں۔ وہ پورے انہاک اور تندہی سے کام کرتے ہیں۔ اس کے باوجود انھیں ان کے کام کا پورا معاوضہ بھی نہیں دیا جاتا۔ جس کی وجہ سے ان کے معاشی مسائل میں اضافہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

احمد سلیم اپنی کتاب "پاکستان اور اقلیتیں" میں یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں:

> "پاکستان کے جاگیردارانہ اور وڈیرہ شاہی پس منظر میں اقلیتوں کے زرعی مزدور بڑے پیمانے پر استحصال کا شکار ہیں۔ نہ صرف اکثریتی جاگیردار اور وڈیرے بل کہ اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے زمیندار بھی زرعی مزدوروں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ زرعی مزدوروں کو زمیندار کے یک طرفہ معاہدے کے تحت کام کرنا پڑتا ہے اور ان کا پورا خاندان زمیندار کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ اجرتوں کی کمی کے باعث زرعی مزدور قرضوں کے جال میں پھنس کر نسل در نسل غلامی کی زنجیروں میں جکڑے اپنی آزادی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ قرض کی بروقت ادائیگی نہ ہونے پر زمیندار اپنی مرضی سے اس میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔"[۳۱]

اس دوران انھیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ طرح طرح کی سختیاں جھیلنا پڑتی ہیں۔ لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود وہ مستقل مزاجی سے ان کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ظالموں کے دل میں ذرا بھی خدا ترسی اور ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ کسی بھی سماج میں اس طرح کے حالات اس وقت نمودار ہوتے ہیں جب اقدار کا احترام دلوں سے اٹھ جاتا ہے۔ اور دوسروں کو غلام بنانا اور ذاتی مفادات کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اقدار یا تو بالکل مسمار ہو جاتی ہیں یا اس قدر کمزور ہو جاتی ہیں کہ سماج کو سہارا دینے کی سکت نہیں رکھتیں۔ افراد کے کردار میں ناہمواری آ جاتی ہے۔ اور لوگ دوسروں کا خیال رکھنے کی روش پر چلنا چھوڑ دیتے ہیں۔ پاکستانی سماج میں ہندو اور عیسائی اقلیتوں کے امن و سکون کی بحالی اور جبری مشقت سے نجات کے لیے استحکام بھی لازمی ہے۔ ورنہ محسوس ہوتا ہے کہ ملک میں لاقانونیت پھیلی ہوئی ہے سماج میں اس طرح کی منفی قوتیں بر سر پیکار آ جاتی ہیں۔ خود غرض افراد اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کو جبری طور پر اپنے ہاں ملازم رکھ لیتے ہیں۔ اور انھیں اپنا آلہ کار بنا کر اپنا مقصد پورا کرتے ہیں۔ ایسے افراد اور گروہ قابل مذمت اور قابل سزا ہیں۔ ایک طرف وہ دن رات جانوروں کی طرح کام میں مصروف رہتے ہیں تو دوسری طرف ان کی محنت کی قدر و قیمت گھٹا کر انھیں اجرت بھی پوری نہیں دی جاتی۔ یہ ملک دشمن عناصر پاکستانی اقلیتوں کے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ بس ان وڈیروں کے حکم کو بجا لینا ہی اپنا دین سمجھتے ہیں۔

"ناول بھاگ بھری" سے ہی جبری مشقت کا ایک اور اقتباس دیکھیے:

"وہ صبح صبح اصطبل کی صفائی کرتی پھر دوسرے مویشیوں کے باڑے کی صفائی کا کام اور پھر دن بھر کھیتوں میں مزدوری۔۔۔ لیکن وڈیرے اور ان کی اولادیں اس سے ہمیشہ حقارت سے اور اکثر ٹھوکریں مار کر بات کرتے تھے۔ اس کو اس بات کا ادراک تھا کہ وہ پنچ ذات ہے قابل نفرت ہے۔"(۳۲)

اللہ رب العزت کے ہاں کوئی بھی انسان حقیر نہیں ہے۔ جبری مشقت ایک ایسی لعنت ہے جس سے ہندو اقلیتوں کا چھٹکارا حاصل کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اس لعنت کے ختم ہونے کی وجہ سے ہی سماجی انصاف اور انسانی مساوات کا دور دورہ ہو گا۔ مذہبی تنگ نظری کسی صورت قابل قبول نہیں۔ تاکہ پاکستانی ہندو اقلیت اپنے مذہب اور سماجی زندگی کے تقاضوں کے مطابق طرز بود باش اختیار کر سکیں۔ جہاں انھیں مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو اور امتیازات کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ اخلاقی لحاظ سے بھی ہمیں ہندو اقلیت کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ ان کی چادر اور چار دیواری کا ہر صورت تحفظ کرنا چاہیے۔ اعلیٰ اخلاقی اوصاف سے پیش آنے والے کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں اعلیٰ مقام ہے۔ ہمیں نسل، رنگ، زبان اور مذہب سے بالاتر ہو کر انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا احترام کرنا چاہیے۔ پاکستانی ہندو اقلیتوں سے امتیازات کی شدید مذمت کرنی چاہیے۔ ان کو ان کے بنیادی حقوق دلانے کے لیے احتجاج کی صدا بلند کرنی چاہیے۔ تاکہ ان کی سلامتی کو فروغ ملے۔ "احمد سلیم" کے نزدیک:

"ظلم سے تنگ زرعی مزدور کام چھوڑ کر فرار ہونے کی کوشش کرے تو پورے خاندان کو زنجیروں سے باندھ لیا جاتا ہے۔ یا پھر کسی اور زمیندار کے ہاتھوں قرضے کی رقم کی ادائیگی کے عوض بیچ دیا جاتا ہے۔ سندھ اور جنوبی پنجاب کے علاوہ شمالی پنجاب کے بعض علاقوں میں بھی زرعی مزدوروں کے ساتھ صدیوں سے یہ مکروہ، گھناونا اور انسانیت سوز سلوک ہو رہا ہے۔"(۳۳)

جبری مشقت ایک ناپسندیدہ عمل ہونے کے باوجود بعض اوقات یہ نسل در نسل منتقل ہو کر بغیر کسی احتجاج کے اپنا لیا جاتا ہے۔ ان طور طریقوں کو رسم و رواج کا نام دے کر انھیں پابند بنا دیا جاتا ہے۔ پاکستانی سماج میں رسم و رواج اور روایات کا کافی دخل ہے۔ ان رسم و رواج کی وجہ سے ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن سے

لوگ سخت پریشان تو ہوتے ہیں مگر ان سے نجات حاصل کرنا ان کے بس کی بات نہیں لگتی۔ یہی رسم و رواج پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کی تعمیر و ترقی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ ان توہمات جیسے رسم و رواجوں سے جان اور پیچھا چھڑانے کے لیے ایک طویل کوشش اور جدوجہد کرنی ہوگی۔ زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے کے لیے ہر انسان کو روزگار کا بندوبست کرنا پڑتا ہے پھر وہ خواہ جبری مشقت ہی کیوں نہ ہو، یا وہ محنت مزدوری ہو جس میں کام کے مطابق اجرت بھی نہ ملے۔ ان لوگوں کا دل بھی چاہتا ہے کہ وہ بھی روزی کمانے کے لیے ایک آزاد اور باعزت طریقے کا انتخاب کریں۔ جہاں انھیں کوئی بات بات پر بے عزت کرنے والا نہ ہو۔ بل کہ وہ بھی اپنی مرضی سے جس پیشے کو چاہیں اپنا لیں۔ وہ بھی کوئی ایسا کام کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے مستقبل میں خوش حال اور باوقار زندگی گزارنے کے قابل ہو جائیں۔ نہ کسی پر بوجھ بنیں، اور نہ کسی کے دست نگر۔ ایک صاف ستھری زندگی چاہے وہ اقلیت ہی کیوں نہ ہوں گزارانا چاہتے ہیں۔ پاکستانی ہندو اقلیتوں کے بچوں کی جبری مشقت ایک سنگین سماجی مسئلہ کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ بچوں کا کم عمری میں مشقت سے وابستہ ہونا ان کی ذہنی صلاحیتوں اور جسمانی نشوونما پر بڑے برے اثرات مرتب کرتا ہے۔ ان بچوں کی مشقت کے اسباب میں غربت، وسائل کی عدم دستیابی، قرض کی ادائیگی وغیرہ شامل ہیں۔

بھاگ بھری کا بیٹا ساون جو کہ چھوٹے وڈیرے جعفر شاہ کی زنا بالجبر کے نتیجے میں ناجائز اولاد تھا۔ ساون کی اور چھوٹے وڈیرے کی مشابہت بہت نمایاں تھی۔ لیکن تھا تو وہ ایک اچھوت ہندو عورت کے بطن سے۔ وڈیروں اور ان کے گھر والوں کا ساون سے رویہ انتہائی ہتک آمیز اور غلاموں جیسا تھا۔ اس حوالے سے ناول "بھاگ بھری" سے اقتباس دیکھیے:

> "کپاس کی چنائی شروع ہو چکی تھی۔ وہ اپنے لخت جگر کو سارا دن چنائی کے کام میں اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ کام بہت زیادہ تھا۔ وڈیرے کی زمینوں کی حد بھاگ بھری کو کبھی سمجھ نہ آتی تھی۔ تاحد نظر اس کی ہی زمینیں تھیں۔۔۔ زیادہ تر بچے اور عورتیں تھیں کیوں کہ عورتوں اور بچوں کو کم مزدوری دینا پڑتی تھی۔"[۳۴]

کھیلنے کودنے کی عمر میں سخت کام کرنے کے بعد یہ بچے چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ بچوں کا کم عمری میں مشقت کا کام، طویل دورانیہ، کم پیسوں میں مزدوری کرنا، کام کے لیے ناموافق ماحول، تعلیم سے محرومی ایسے مسائل ہیں جو بچوں کی ذہنی نشوونما کے لیے انتہائی نقصان دہ ہیں۔ نو عمری میں

بچوں کی مشقت اس بات کی ضامن ہے کہ مفلسی، نا انصافی اور رنگ و نسل، ذات، مذہب کی بنیاد پر تفریق آنے والی نسلوں میں بھی منتقل ہو گی۔ نو عمری میں مشقت کے منفی اثرات بچوں کے ساتھ زندگی بھر چلتے ہیں۔ اور نہ صرف ان کی شخصیت، رویہ، عزت نفس بل کے ان کے اعتماد کو بھی مجروح کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ معمولی نوعیت کے روزگار سے وابستہ رہتے ہیں۔

حالاں کہ بچوں کی زندگی تو خوب مزے میں گزرتی ہے۔ صبح اٹھنے کے بعد مائیں منت سماجت کر کے کھانا کھلاتی ہیں۔ ذرا دن چڑھے اپنے ہم عمر دوستوں کی تلاش میں گلی میں نکل جاتے ہیں اور پھر سب بچے مل کر کھیلتے ہیں۔ نہ فکر نہ کسی قسم کا کوئی غم۔ خوشی اور ہنسی ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی ہے۔ کھلونوں کو دیکھتے ہیں تو فوراً خریدنے کے لیے مچل جاتے ہیں۔ تو کبھی کھانے پینے کی چیزوں کے لیے اونچی اونچی آواز میں رونا دھونا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنی خوب صورت اور چھوٹی چھوٹی شرارتوں سے گھر بھر کا جی بہلاتے ہیں۔ مگر بد قسمتی سے ساون اور اس کی ماں بھاگ بھری کو بچپن میں ہی پر کاٹ کر غلامی کے پنجرے میں قید کر دیا گیا۔ شرارتوں اور لاڈ اٹھوانے کی عمر میں دونوں ماں بیٹا جبری مشقت کرنے پر مجبور اور بے بس تھے۔ ان کی بنیادی آزادی آنکھیں کھلتے ہی سلب کر لی گئی تھی۔ ان کا آرام و آسائش بھی جاگیر دار کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ یہ لوگ پیدائشی غلام اور وفادار ہوتے ہیں۔ اور ہر گھڑی ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ بغاوت کا کوئی جذبہ یا احساس ان میں پیدا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ انسانیت نوازی اور سماجی عدل و انصاف ان پریشان حال لوگوں کو اپنی طرف راغب نہیں کرتا۔ ایسا سماج سماجی ناانصافیوں اور بندشوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جبری مشقت کرنے والوں کی حیثیت کولہو کے بیل جیسی ہوتی ہے۔ ہندو اقلیتوں کو ان جابر افراد کی چیرہ دستیوں سے بچانے کے لیے سخت قوانین اور عبرت ناک سزائے مقرر کی جائیں اور ان پر ہر صورت عمل درآمد بھی کیا جائے تاکہ اس مظلوم طبقے کو جبری مشقت سے تحفظ حاصل ہو۔ "ڈاکٹر مبارک علی" کے نزدیک:

> "ہمارے جاگیر دار اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے پاس لا محدود زمینیں ہیں۔
> ان کی قید میں ہاریوں کو رکھا جاتا ہے۔ وہ موروثی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مال
> و دولت اور جائیداد ان کے سماجی مرتبہ کو اونچا کرتی ہے۔"(۳۵)

انسان جسمانی طور پر کام کرنے کے بعد تھک جاتا ہے۔ اور عموماً محنت و مشقت کے بعد انسان کا ذہن بھی بری طرح تھکن سے متاثر ہوتا ہے۔ لیکن غریب اقلیتوں کی زندگی میں آرام و سکون کا کوئی لمحہ بھی نہیں

ہوتا۔ وہ دن رات کام کرنے کے باوجود اپنی حالت کو سدھار نہیں پاتے۔ وہ دن رات جبری مشقت کی چکی میں پس رہے ہیں۔ اور تفکرات میں گھیرے ہوئے ہیں۔ انھیں زندگی میں چند لمحے بھی خوشیوں کے میسر نہیں آتے۔ کام کرنے کی وجہ سے بدن چست اور اعضاء تندرست رہتے ہیں لیکن اس کے لیے پیٹ بھر کر کھانا بھی ضروری ہے۔ جہاں اور بے شمار مسائل ہیں وہاں خوراک کا مسئلہ بھی ان کے لیے ایک سنگین صورت حال رکھتا ہے ۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ جبری مشقت کے ساتھ ساتھ کھانا بھی مشکل سے دو ٹائم کا ملتا ہے اور وہ بھی روکھا سوکھا اور انتہائی کم مقدار میں۔ ان لوگوں کی زندگی تصنع اور بناوٹ سے مبرا ہے انھیں تن ڈھانپنے کے لیے ڈھنگ کے کپڑے بھی میسر نہیں ہوتے کہ جو بدلتے ہوئے موسمی حالات سے انھیں بچا سکیں۔ جبری مشقت کرنے والوں کے لیے جنگل کا قانون ہوتا ہے۔ وڈیرے اور جاگیر دار اور بھٹہ مالکان انھیں اپنے بدترین بنائے گئے قانون کی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ انھیں سفر کرنے کے لیے یا کہیں بھی یعنی بازار یا ہسپتال جانے کے لیے کوئی ذرائع آمد و رفت کی سہولت میسر نہیں ہوتی اور نہ ہی اجازت ہوتی ہے۔ خطرناک اور موزی بیماریوں سے بچاؤ اور ان کے علاج کے لیے کوئی بھی انتظام نہیں ہوتا۔ وہ بیماری کی حالت میں بھی کام کرتے کرتے ایسے ہی سسک سسک کر مر جاتے ہیں۔ چھوٹی سی چھوٹی ضرورت کے لیے ان کے محتاج ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہوتے ہیں بعض اوقات جان بوجھ کر حالات کو اپنے کنٹرول میں کرنے کے لیے مصنوعی غذائی قلت بھی پیدا کرتے ہیں ان مظلوموں کے لیے۔ عنایت مسیح کی چار سال کی بیٹی شیماں بھی دن بھر سانچوں میں مٹی بھر بھر کر اینٹیں بناتی تھی لیکن کام کا معاوضہ نہ ہونے کے برابر ملتا تھا۔ اس زیادتی کے باوجود وہ دن بھر ماں باپ کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتی۔ شیماں کی گڑیوں سے کھیلنے کی عمر روٹی کی فکر کی نذر ہو گئی تھی۔ اس کا بچپن جس میں غم اور فکر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی مشقت کرتے کرتے گزر گیا۔ شوکت صدیقی کے ناول "جانگلوس" (جلد سوم) سے اقتباس دیکھیے:

"تو نے شیماں کو بھی ادھر نکے کے پاس چھوڑ رکھا ہے۔ عنایت مسیح نے مریم کو یاد دلایا۔

اس کا کام بھی تو ہم نے ہی کرنا ہو گا۔

شیماں کو ادھر نہ چھوڑتی تو نکا اکیلا رہ جاتا۔۔۔ ویسے چار سال کی شیماں کتنا کام کر سکتی ہے۔

یہ جو سارے ذرا ذرا سے ننگے اور ننگیاں ہیں ان کو دیکھ رہی ہے عنایت نے ہاتھ اٹھا کر لہرایا اور ان کم سن اور نو عمر بچوں اور بچیوں کی جانب اشارہ کیا جو عورتوں اور مردوں کے ساتھ طرح طرح کے کام کر رہے تھے۔۔۔ میں تو یہ جانتا ہوں کام کم ہوا تو نہ تجھے کھانے کو ملے گا نہ ننگے کو۔ عنایت مسیح کے سدھے ہوئے ہاتھ تیزی سے چلتے رہے ۔"(۳۶)

کہتے ہیں کہ انسان کی پہلی درس گاہ ماں کی گود ہوتی ہے اور دوسری درس گاہ جہاں سے اسے علم سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یہی درس گاہ انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ دنیا کے مسائل و مصائب کا جان فشانی سے مقابلہ کر سکے اور ترقی کی منازل طے کرئے۔ یہ سکول ہی ہوتا ہے جو اس کے شعور کو چار چاند لگا کر اس کی جہالت کو تار تار کر دیتا ہے۔ مگر جبری مشقت کرنے والوں کی اولادیں بھی چاہے ان کی عمر چار سال ہی کیوں نہ ہو وہ بھی والدین کے ساتھ دن بھر کام کاج کرتے ہیں اور جبری مشقت کے مہلک زہر کو عمر بھر پینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ انھیں اپنی پہلی درس گاہ یعنی ماں کی گود سے ہی مشقت کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اور وہ کبھی بھی علم جیسے نور سے اپنے دلوں کو منور نہیں کر سکتے۔ ان کی پوری زندگی اندھیرے کے شعلوں کی نظر ہو جاتی ہے۔ وہ ایک کوفت زدہ اور بیزار زندگی گزارنے پر بے بس ہوتے ہیں۔ اقوام متحدہ نے اقلیتوں کے متعلق قانون سازی کے سلسلے میں جو منشور پاس کیا ہے اس کے آرٹیکل نمبر چار میں واضح لکھا ہے کہ اقلیتی گروہ سے تعلق رکھنے والے تمام افراد اپنے تمام انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں سے لطف اندوز ہو سکیں گے بغیر کسی امتیازی سلوک کے۔

بعض دفعہ اقلیت بھی ایک خاص طرز فکر کے مالک بن جاتے ہیں۔ ان کے خیال میں انسانی کوششیں حالات کی درستی کے لیے بے کار ہیں۔ اس لیے مسائل سے رہائی کے لیے کسی بھی قسم کی حرکت بے سود ہے۔ یہ لوگ ہر عمل اور کوشش کو شک اور بے یقینی کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ کیوں کہ مفاد پرست گروہ زیادہ طاقت ور ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اغراض و مقاصد کے پیش نظر خفیہ طریقوں سے مسئلے کی اہمیت کو کام کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ جب سماج میں متضاد فکر رکھنے والے گروہ پیدا ہو جائیں تو سماج ایسے ہی مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔ ان پاکستانی عیسائی اقلیتوں کو اس متضاد فکر رکھنے والے گروہ سے نجات دلانا از حد ضروری ہے۔ تاکہ وہ بھی اپنے حال اور مستقبل کو سنوار سکیں اور خوش گوار فضا اور ماحول میں زندگی بسر کر سکیں۔ کیوں کہ ان

جبری مشقت کرنے والوں کی زندگی قیدیوں سے بھی بدتر زندگی ہے۔ وہ اپنے چنگیز خان اور ہلا کو خان نما مالک کی مرضی کے بغیر کام کرنے کے علاوہ کہیں اور قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔ ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب "تاریخ اور معاشرہ" میں کہتے ہیں:

> " ایک ایسے ماحول میں نہ تو تخلیقی صلاحیتیں ابھرتی ہیں نہ نئے نظریات پیدا ہوتے ہیں اور نہ ہی فکر جنم لیتی ہے بلکہ اس کے مقابلے میں یہ معاشرے جبر و تشدد اور تنگ نظری سے اپنا دفاع کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرہ اور زیادہ پسماندہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جہالت اور جنونیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے ایک ایسے معاشرے میں ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ اور وہ تنزل کی جانب تیزی سے روانہ ہو جاتا ہے۔ ہم موجودہ دور میں اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔"[۳۷]

جبری مشقت کی صعوبتیں پاکستانی عیسائی اقلیتوں کے حوصلوں کو پست نہ کر سکیں گی اور نہ ہی ظلم و تشدد۔ انھیں غلامی کا بوجھ اپنی گردنوں سے اتار پھینکنے کے لیے کوشاں رہنا ہو گا۔ زندگی سے مایوس ان لوگوں میں بیداری کی روح پھونکنے کے لیے اور غفلت سے جگانے کے لیے ہمیں اپنا کردار ادا کرنا ہو گا۔ آزاد فضاؤں میں جینے کا حق انھیں بھی حاصل ہے۔ جبری مشقت سے نجات حاصل کرنے کے لیے پاکستانی عیسائی اور ہندو اقلیتوں کو پہاڑ کی طرح اس مقصد کے حصول کے لیے ڈٹنا ہو گا۔ پاکستانی اکثریت کو بھی چاہیے کہ وہ ان لوگوں کو انصاف دلانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑیں۔ تاکہ ان لوگوں کی بھی زندگی گزارنے کی آرزوئیں پوری ہو سکیں۔ جبری مشقت کے اثرات بد سے بچانے کے لیے ان لوگوں کے لیے خصوصی تنظیمیں بنائی جائیں۔ جو باقی عوام کے شعور کو بھی بیدار کر سکیں۔

ہمیں ان مصیبت زدہ اقلیتوں کے ساتھ ہمدردی رکھنی چاہیے۔ لیکن صرف ہمدردی کافی نہیں بل کہ ہمدردی کو عملی شکل دے کر انھیں جبری مشقت کی قید سے رہائی دلانے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے تاکہ یہ اقلیت بھی زندگی اپنی خوشی و مرضی کے مطابق گزار سکیں۔ ان قوتوں کے خلاف ہر فورم پر آواز بلند کرنی چاہیے۔ جو ان اقلیتوں کے موجودہ حالات کو برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔ ان ظالم قوتوں کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سماجی مسئلہ خطرناک صورت حال اختیار کر لے۔ یہ طاقتیں کسی خاص جگہ نہیں ہوتیں بل کہ پورے معاشی نظام میں موجود ہوتی ہیں۔ ان طاقتوں کو منظر عام پر لانے کا کام ہوشیاری اور ذی

شعور طریقے سے کرنا ہوگا۔اور پھر اکثریت کے تعاون سے منصوبہ بندی کے ذریعے اس مسئلے کو ہر ممکن طریقے سے حل کیا جانا ضروری ہے۔ ہمیں اپنی تمام تر کوشش اقلیتوں کے بنیادی حقوق کے کے لیے کرنی چاہیے۔ایک ولولہ انگیز قیادت ہی پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کی نمائندہ بن کر انھیں جبری مشقت سے نجات دلانے کے ساتھ ساتھ معاشی طور پر مستحکم اور مضبوط بنا سکتی ہے۔

سیاسی اجارہ دار طبقہ

جب انسانوں نے مل کر رہنا شروع کیا تو ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکرائے۔اسی ٹکراؤ سے باہمی تنازعات پیدا ہوئے۔اِس سے اُس ضرورت کا احساس پیدا ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے یہ ٹکراؤ پیدا نہ ہو۔اور اگر ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو باہمی کش مکش اور تنازعات کا فیصلہ عمدگی سے ہو جائے تاکہ سماج فساد اور جنگ و جدل سے محفوظ رہے۔اس سے نظام سیاست کے تصور کی ابتدا ہوئی۔ جب ابتدا ہوئی تو اس ضرورت کے تحت جن لوگوں نے جھگڑے نپٹائے اور فیصلے کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا تو انھوں نے محسوس کیا کہ دوسروں سے اپنا حکم منوانے میں بڑی لذت ملتی ہے۔اس لیے انھوں نے ایسی تدابیر سوچنی شروع کیں جن سے ان کے ہاتھ میں آیا ہوا اقدار چھننے نہ پائے۔اس سے سماج میں دو طبقے پیدا ہو گئے۔ ایک طبقہ وہ جو دوسروں سے اپنا حکم منواتا تھا اور دوسرا وہ جو ان کا حکم مانتا تھا۔پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کی رہنمائی کے لیے ایمانی قوت، صلاحیتوں میں خود اعتمادی اور قومی مقاصد کے لیے دکھ جھیلنے کی ہمت کی ضرورت ہے۔یہ تمام اوصاف تو صرف اور صرف وطن سے محبت اور خلوص رکھنے والے لوگوں میں ہو سکتے ہیں۔لیکن افسوس کہ سیاسی لوگ جب بھی آگے آئے اقتدار دل میں لیے آئے۔ ان تمام نام نہاد لیڈروں نے اس عظیم ملک کا حلیہ بگاڑنے اور شیرازہ بکھیرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ان نام نہاد لیڈروں نے جہاں وطن عزیز کو ہر طرح سے نقصان پہنچایا وہیں ان کا یہ کارنامہ بھی سر فہرست ہے کہ نہ تو خود اتحاد و اتفاق سے اس ملک کی ترقی کے لیے کچھ کیا اور نہ ہی اس ملک کی اکثریت اور اقلیت کو اتحاد و اتفاق سے رہنے دیا۔رنگ و نسل، زبان و مذہب، فرقہ واریت اور صوبائیت پسندی جیسی لعنتوں کو ہوا دے کر اپنے مفادات حاصل کیے۔ناول "نو لکھی کوٹھی" میں شمس الحق گیلانی جو کہ سیاست کے علاوہ پیر خاندان سے بھی تعلق رکھتے تھے اور ان کے مرید پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔جو پیر صاحب کی ایک اشارے پر کٹ مرنے کو تیار تھے۔ شمس الحق گیلانی نے اسسٹنٹ کمشنر نواز الحق سے کہا کہ وہ جو نو لکھی کوٹھی ہے وہ ان کے نام کر دیں اور نواز الحق بھی ان کی بات

کو رد کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سیاسی اجارہ دار طبقے کے حوالے سے علی اکبر ناطق کے ناول "نو لکھی کوٹھی" سے اقتباس دیکھیے:

> " سیاست دانوں میں نواز صاحب کے ایک دوست شمس الحق گیلانی تھے۔ یہ شاہ صاحب حجرہ شاہ مقیم کے ایک رئیس خاندان کے فرد تھے۔ یہ وہ خاندان تھا جس کا ملک کی سیاست میں بڑا اہم کردار تھا۔ اور علاقے میں ان کی طاقت کا لوہا سب مانتے تھے۔۔۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی گپ شپ کے بعد شمس الحق گیلانی نے اپنے مطلب کی طرف آتے ہوئے بات کا آغاز کیا، نواز صاحب آپ ہمارے لیے ایک کام کر دیں بڑی مہربانی ہو گی۔۔۔ کمشنر صاحب آپ کے اس بڑی نہر کے دوسری طرف ایک نو لکھی کوٹھی خالی پڑی ہے جس کے ساتھ کچھ زمین ہے۔۔۔ آپ کسی طرح اسے میرے نام کروا دیں۔ جو خرچہ ہوا میں دینے کو تیار ہوں۔۔۔ نواز صاحب وہاں ایک بڈھا انگریز رہتا ہے۔۔۔ آپ کہیں تو اسے اٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں۔ اور آپ وہاں اپنا بندوبست کر لیں۔"(۳۸)

ان نام نہاد سیاسی اجارہ دار طبقے کی وجہ سے سیاست ایک ایسی لعنت بن چکی ہے جو انسان اور انسانیت کی آنکھوں سے روشنی، کانوں سے سماعت، بدن سے گرمی، ذہن سے عقل و شعور، دل سے عزت و شرافت تک نچوڑ لیتی ہے۔ جس کی وجہ سے انسان کی تباہی و بربادی اور ذلت و خواری میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان تمام برائیوں کی جڑ دراصل ہمارا غلط سیاسی نظام ہے۔ جن لوگوں کو قوانین بنانے ہوتے ہیں ان کے لیے تعلیم یا قابلیت ضروری نہیں ہے۔ جو کہ نہایت حیرت اور افسوس کی بات ہے۔ آج جب کہ دنیا سائنسی ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھ رہی ہے۔ ہمارا سیاسی اجارہ دار طبقہ نہ خود آگے بڑھتا ہے اور نا پاکستانی اقلیتوں کو آگے بڑھنے کا موقع دے رہا ہے۔ ہم زندگی کے ہر شعبے میں عالمی ترقی سے بہت پیچھے رہ چکے ہیں۔ ایک نظام تعلیم ہی کو دیکھ لیں یہ سیاسی اجارہ دار طبقہ سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے اور اپنی سیاست چمکانے کے لیے نوجوان لوگوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ایسا کر کے وہ قوم کے مستقبل کو تاریک تر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بعد جب کام کی باری آتی ہے تو یہی نام نہاد لیڈر وہ دعوے کرتے ہیں کہ بندہ سن کر دنگ رہ جاتا ہے۔ پاکستانی عیسائی اقلیت کو قوت فیصلہ اور قوت مزاحمت میں اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ وہ ہر بری شے سے نہ صرف انکار کر سکیں بل کہ ان سیاست دانوں کو برائی سے روکنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں تبھی وہ خوش حال زندگی گزار سکتے

ہیں۔ ورنہ یہ طبقہ اس طرح کی سیاست کا عادی ہوتا ہے۔ صرف یہی نہیں اب اس طبقے نے رشوت سفارش، بدعنوانی، قتل و غارت اور نہ جانے کتنی بیماریاں اپنے اندر پیدا کر لی ہیں۔ وہ اخلاقی طور پر تاریکی، بربادی اور ذلت کے اندھے گھڑوں میں جاگرے ہیں۔ سیاست کے نشے کی وجہ سے ان کے سوچنے، سمجھنے، صحیح اور غلط کو پرکھنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی ہے۔ "احمد سلیم" اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> " پاکستان کے مخصوص سماجی اور جغرافیائی حالات میں وڈیرہ شاہی، جاگیرداری اور ملائیت کی موجودگی میں ملکی آئین اور قانون کے دامن میں اقلیتوں کے لیے سماجی، سیاسی اور معاشی تعصب کے سوا کچھ نہیں بچتا۔۔۔ سماجی تعصب، مذہبی منافرت، زنا بالجبر، پولیس تشدد، مذہبی بنیاد پر بننے والے جھوٹے مقدمات اور آئین اور قانون کی واضح جانبداری کے واقعات پاکستانی اقلیتوں کی زندگیوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ جہاں آئین، پارلیمنٹ، انتظامیہ، جاگیرداری، وڈیرا شاہی اور انتہا پسند مذہبی عناصر نے مقدس اتحاد بنا کر اقلیتوں کو دوسرے درجے کا شہری بنا دیا ہے۔"[۳۹]

ازل سے حصول اقتدار انسانوں میں سے ایک مخصوص طبقے کی شدید ہوس رہا ہے۔ یہ ہوس فرعون کی شکل میں ہو یا نمرود کی شکل میں، یزید کی صورت ہو یا چنگیز خان کی صورت میں، جس صورت میں بھی ہو ہوس اقتدار نے ہمیشہ دنیا کے امن و سلامتی کے دامن کو تار تار کیا ہے۔ ہوس اقتدار کی یہ جنگ اور کش مکش صرف ماضی کا حصہ نہیں ہے۔ بل کہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ راتوں رات ساری دنیا پر چھا جانے اور اپنا تسلط قائم کر لینے کی خواہش امن کی راہ میں بنیادی رکاوٹ ہے۔ پاکستانی عیسائی اقلیتوں کو اس سیاسی اجارہ دار طبقے سے بچانے کے لیے ایسے بدنما داغوں اور مفاد پرستوں سے کوئی رعایت روا نہیں رکھنی چاہیے بل کہ ایسے لوگوں سے دائمی نجات حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ ہمیں چاہیے کہ انھیں یہ احساس دلائیں کہ یہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ اقلیتوں اور سماج کے لیے کس قدر ہلاکت آفریں اور تباہ کن ہے۔

دور حاضر ایک مادی دور ہے۔ جس میں ہر شخص نفسا نفسی کے عالم میں آگے بڑھنے کی دوڑ میں مصروف ہے۔ اور وہ اس بے جہت دوڑ میں اس قدر آگے بڑھ چکا ہے کہ اسے اپنے ذاتی مفادات کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اور وہ اپنے مفادات کو مقدم خیال کرتے ہوئے دوسروں کے حقوق اور اپنے فرائض کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور یہی سوچ اسے دوسروں سے الگ راستے پر چلنے کا باعث بنتی ہے اور وہ اپنے بنیادی عقائد کو

بھی پس پشت ڈالنے پر تیار دکھائی دیتا ہے۔ سیاسی اجارہ دار طبقہ خصوصاً اپنے ذاتی مفادات کی سیاہ پٹیوں کو اپنی آنکھوں پر باندھے تعصب و انتشار کی گہری کھائی کی طرف جارہا ہے۔ اس حوالے سے "نولکھی کوٹھی" سے اقتباس ملاحظہ کیجئے:

"ہمیں سیاست کرنی ہوتی ہے۔ وہ رہنے کے لیے تھوڑی الاٹ کروانی ہے؟ وہاں ہمارے مال مویشی ہوں گے یا کچھ نوکر رہیں گے۔۔۔ سر میں ابھی تمام ریکارڈ منگوا لیتا ہوں (پیر شمس الحق صاحب کی طرف منہ کر کے حبیب اللہ انتہائی چاپلوسی سے) پیر صاحب، ویسے وہ کوٹھی آپ ہی کے لائق ہے۔ وہاں ایک بڈھے انگریز کی وجہ سے نحوست پھیلی ہوئی ہے۔ پتہ نہیں ابھی تک یہاں کیا کرتا پھر رہا ہے۔۔۔ آپ جتنی جلدی ہو سکے اس منحوس بڈھے سے خالی کروالیں۔ ہمارے شاہ صاحب کے قدم لگنے سے وہاں مٹی تو پاک ہو گی"[۴۰]

ہوس سیاست نہ صرف خود ایک بہت بڑی بیماری ہے بل کہ اور بھی بہت سی بیماریوں مثلاً حسد، لالچ، ذخیرہ اندوزی، حق تلفی اور بے جا نمود و نمائش کا سبب بھی بنتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس وقت تمام برائیوں کی جڑ، تمام سماجی بیماریوں کا اصل منبع و مظہر صرف اور صرف سیاست کی ہوس ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اور اسے ہر چیز کا معیار اپنے معیار کے مطابق رکھنا چاہیے۔ اگر وہ تمام مخلوقات سے اعلیٰ ہے تو اسے دوسرے لوگوں کا بھی خیر خواہ ہونا چاہیے۔ کیوں کہ انسان کا اچھا کردار ہی اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنے اشرف المخلوقات ہونے کی پاسداری کرنی چاہیے۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے دل و دماغ میں دوسروں کے لیے ہمدردی کا جذبہ کارفرما ہونا چاہیے جس کی وجہ سے برائی کا خاتمہ خود بخود ہو جائے گا۔ سیاست میں ہمارا حال یہ ہے کے اپنے عیب کو ہنر اور دوسرے کے ہنر کو عیب ثابت کر سکیں۔ ہر سیاسی گروپ اپنے نظریات کو صحیح سمجھتے ہوئے ان کی بالا دستی کے لیے ہر حربہ آزمانا ایمان کے مطابق سمجھتا ہے ۔ اس سیاسی تعصب نے نازک صورت حال پیدا کر دی ہے ۔"سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں" میں اس حوالے سے یوں لکھا ہے:

"پاکستان جیسی مسلم اکثریتی ریاست کا اقلیتوں کے حوالے سے بطور خاص حساس ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کے اسلام کے نام پر بنائی گئی ریاست کا دنیا کے سامنے منفی

تاثر خود اسلام اور مسلمانوں کے لیے مفید نہیں۔ اقلیتوں کے لیے حقوق کی عملی ضمانت در حقیقت کسی ریاست کی اخلاقی بلندی کی علامت ہوتی ہے۔ اقلیتوں کے حقوق کی آئینی ضمانت اور جمہوری اصولوں کی پاسداری کے قول و قرار کے بعد اس پر قائم رہنا قومی اخلاقیات کی آزمائش ہے۔"[۴۱]

سیاسی اجارہ دار طبقے کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے دوغلا پن اختیار کیا ہوا ہے۔ ان کا سیاسی کردار دوغلی پالیسیوں پر مبنی ہے۔ سیاسی اجارہ دار طبقے نے اپنی سیاست چمکانے کے لیے اور اپنے ذاتی مفادات حاصل کرنے کے لیے اکثریت اور اقلیت کے درمیان ذات پات کو لا کھڑا کیا ہے۔ اس وقت ہر طرف فرقہ بندی کا دور دورہ ہے۔ مختلف جماعتوں، مختلف فرقوں اور مختلف مکتبہ فکر رکھنے والے سیاست دانوں کے آپس میں شدید نوعیت کے اختلافات ہیں۔ جن کے باعث سیاست کا کوئی پرسان حال نہیں۔ ہر کوئی اپنی سیاسی جماعت کی مشہوری میں مصروف ہے۔ جب انسان کو مشکلات اور مسائل درپیش ہوں کچھ لوگ ہمت اور حوصلے سے حالات کا مقابلہ کرتے ہیں جب کہ ان جیسے مفاد پرست مسائل سے گھبرا کر راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ یا پھر اقلیتی عوام کے فرائض ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ یہ صرف اپنی ذات اور خاندان کے لیے مادی ثمرات سمیٹنے میں مگن ہیں۔ آج اس سیاسی اجارہ دار طبقے کی ناانصافی اور انتشار کے سبب ہم کمزور ہو چکے ہیں اور ہماری اس کمزوری سے دشمن فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ایک طرف سامراجی قوتیں پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کو محکوم بنا لینے کے درپے ہیں تو دوسری طرف یہ سیاسی اجارہ دار طبقہ اپنے شیطانی عزائم کے ساتھ موقع کی تلاش میں ہے۔ ان لوگوں کو ملک کی بقا کا ذرا بھر احساس نہیں۔ پاکستانی اقلیت کی تمام امیدیں اس ملک ساتھ وابستہ ہیں۔ سیاسی اجارہ دری کا ایک اور اقتباس "نو لکھی کوٹھی" سے دیکھیے:

"سردی کی شدت، ولیم کا بڑھاپا اور سب سے بڑھ کر بردباری سے پیش کی گئی زبانی درخواست نے مجسٹریٹ کو انتہائی متاثر کیا۔ اسے توقع تھی ولیم اس کا حکم سنتے ہی آپے سے باہر ہو جائے گا۔ چیخ و پکار کے ساتھ واویلا شروع کر دے گا اور دیواروں سے لپٹ جائے گا۔ انھیں گالیاں دے گا۔ پنجاب حکومت ،بیورکریسی، سیاستدان اور پاکستانی عوام کو برا بھلا کہے گا۔ جس کی وجہ سے وہاں دیر تک بدمزگی پیدا ہو گی۔ نتیجے میں اسے زبردستی باہر پھینکنا پڑے گا۔ لیکن یہ سب کچھ نہ ہوا۔۔۔ اس کے بعد مجسٹریٹ بولا ولیم صاحب ایک بات طے ہے اب کوٹھی آپ کو چھوڑنا پڑے گی۔ اس بارے میں دو رائے

نہیں رہیں۔۔۔میرا مشورہ یہ ہے اپنے سامان کو اٹھا کر کسی دوسری جگہ ٹھکانے لگانے کی کوشش کریں کوٹھی نہ آپ سے اب بچ سکے گی ۔نہ اب اس میں وقت ضائع کریں۔"(۴۲)

جب حاکم اور محکوم وجود میں آجائیں تو حاکم اپنی اطاعت کرانے پر جبر کا اختیار بھی قانوناً حاصل کرتا ہے اور یہیں سے سیاسی مسائل کی ابتدا ہوتی ہے۔ میثاق مدینہ میں یہ کہا گیا ہے کہ اتحاد و یگانگت کی وجوہات ایک جیسا لباس، زبان، رنگ و نسل یا خطے کے بدلتے ہوئے موسموں کے اثرات کی یکسانیت نہیں ہے۔ بل کہ اسلام اس لیے اتحاد کی مستحکم بنیاد ہے کہ وہ مسلمانوں کو اخوت کے لازوال بندھن میں باندھنے کے علاوہ اقلیتوں کے بارے میں بھی غیر جانب دارانہ، مصالحانہ اور انسانی رویہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ سیاسی اجارہ دار طبقے کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اس لیے عصر حاضر میں بھی اس کی جڑیں نہایت مضبوط ہیں۔ سادہ لوح پاکستانی اقلیت نے اس طبقے سے امیدیں وابستہ کی ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی اپنی مصلحتیں ہیں۔

اپنے مفادات ہیں۔ ہوس اقتدار ہے۔ سستی شہرت کی خواہش ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ ہم نے خدا کے ہاں جواب دہ ہونا ہے۔ قوم کی اقتصادی خوش حالی کا تمام دارومدار اس بات پر ہے کہ اس کے سیاست دان کتنے دیانت دار اور محب وطن ہیں۔ بے ایمان افراد کے ہاتھوں میں آپ لامحدود وسائل دے دیں وہ ان سے صرف اپنا اور اپنی فیملی کا پیٹ بھرنے کی کوشش کریں گے ۔اس لیے یہ کہنا مناسب ہو گا کہ پاکستانی عیسائی اقلیتوں کی اصل قوت، اصل سرمایہ اور ان کی قابل اعتماد لازوال دولت ان کے دیانت دار سیاست دان ہی ہوا کرتے ہیں۔ عوام تو جذبات کے ایک بہتا ہوا دھارا ہیں جو نہ رکتا ہے اور نہ خود کو سوچ اور فکر کی گتھیوں میں الجھاتا ہے۔ یہ فرض تو قوم کے دانش ور طبقے اور لیڈروں کا ہے کہ وہ پاکستانی عیسائی اقلیت کی منزل اور مقاصد کی نشان دہی کریں اور ان کی صحیح رہنمائی کریں۔ بدقسمتی سے قیام پاکستان کے بعد یہ نام نہاد لیڈر پاکستانی اقلیتوں کی توقعات پر پورا نہیں اترے۔ "ڈاکٹر مبارک علی" اس معاملے پر یوں لکھتے ہیں:

" یہاں قدامت پرست جماعتوں کا سیاست پر تسلط ہے۔ ان میں چاہے مذہبی یا سیاسی جماعتیں ہوں یا نام نہاد لبرل سوچ رکھنے والی، جب بھی یہ جماعتیں برسر اقتدار آئیں انھوں نے حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے تمام فرسودہ قوانین اور روایات کو اسی طرح سے برقرار رکھا جس کی وجہ سے معاشرے میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔"(۴۳)

کوئی بھی ملک اس وقت ترقی کی منازل طے کر سکتا ہے۔ جب اس کے سیاست دان منتشر نہیں ہوں گے۔ جب افراد کے درمیان مکمل ہم آہنگی پائی جائے گی اور اقلیتوں کے مسائل کے حل کے لیے پوری قوم وحدت فکر و خیال کی حامل ہو گی۔ ان لوگوں کو ہمدرد اور مقبول رہنما کی حیثیت سے اقلیتوں پر اچھا تاثر قائم کرنا چاہیے۔ پاکستانی عیسائی اقلیتوں کو اگر تضاد اور تفریق کی نگاہ سے دیکھا جائے گا تو مسائل کا حل ناممکن ہے۔ البتہ برابر اور مساوات کا جذبہ پیدا کر کے ہمیں قیام امن کے لیے کوششیں تیز تر کر دینی چاہیں۔ پاکستان کے آرٹیکل ۲۵ کی رو سے پاکستان کا آئین تمام شہریوں کو مساوی سمجھتا ہے۔ ان میں کسی بھی قسم کی تفریق یا امتیاز روا نہیں رکھتا۔ ان کو یکساں قانونی تحفظ حاصل ہو گا۔ اگرچہ سلامتی، امن اور محبت کی منزل دور نہیں ہے۔ مگر دولت وزر کے بجائے پاکستانی عیسائی اقلیتوں کے جذبوں کی قدر کر کے ہم صلح و سلامتی، محبت و اخوت اور امن کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ اگر ظلم پاکستانی سماج میں پھیلتا جا رہا ہے تو یقیناً عدل و انصاف بھی یہیں کہیں موجود ہے۔ جسے اپنی محبت اور اخلاق سے اقلیتوں پر ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ ہر ایک کالی رات کے بعد سویرا لازمی ہے۔ یہ ہیں وہ اسباب جن کی وجہ سے پاکستانی عیسائی اقلیت آج مسائل سے دوچار ہیں۔ اسباب سامنے موجود ہیں اب تو صرف ان کے تدارک کے لیے عملی کوششوں کی ضرورت ہے۔ پاکستانی عیسائی اقلیتوں میں اس مسئلے کی سنگین صورت حال کا شعور پیدا کرنا اور مختلف مسائل سے نمبرد آزما ہونے کے لیے ہر قسم کے وسائل کی فراہمی اور سب سے بڑھ کر انسانی کوششیں اور جدوجہد بہت ضروری ہے۔ اس لائحہ عمل کو اپناتے ہوئے ہم (انشاء اللہ) بہت جلد خوش حالی اور شادمانی کی منزل کی طرف گامزن ہو جائیں گے۔

تعصب

دنیا میں کوئی بھی فرد ہو یا قوم اس میں اپنی عزت نفس کا احساس ہونا بہت ضروری ہے۔ جس فرد یا قوم میں یہ احساس ختم ہو جاتا ہے تباہی و بربادی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ غیرت مند انسان غریب بھی ہو تو وہ غیرت کے باعث نہ کسی کے سامنے جھکتا ہے اور نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ غیرت کے جذبے کی حامل قومیں دنیا میں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ کیوں کہ وہ کسی پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنی تقدیر آپ بناتی ہیں۔ اپنے آپ پر انحصار کرتی ہیں۔ اس لیے کوئی بھی انھیں جھکانے یا جھوٹا الزام لگانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ امریکہ میں موجود پاکستانی مسلمان اقلیت کو اپنی عزت نفس کا احساس پیدا کرنا چاہیے۔ تو تب وہ اپنے زور بازو پر بھروسہ کرتے ہوئے باطل قوتوں سے ٹکرا جائیں گے۔ اور اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

جب بھی دنیا میں مسلمانوں پر کسی بھی قسم کی افتاد کی خبر آئی تو وقتی طور پر مسلمان مضطرب اور بے قرار دکھائی دینے لگتے ہیں لیکن عملی طور پر ان کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جاتا۔ مغربی دنیا میں اسلام کو بطور دہشت گردی کو فروغ دینے والا مذہب جب کے خود کش حملوں اور انتہا پسندی کو مسلمانوں کے ساتھ جوڑا جاتا ہے ۔ اور مسلمان اقلیت کبھی مغربی تہذیب کی چمک دمک سے متاثر ہو کر اس کے گن گانے لگتے ہیں۔ اور کبھی ان کی ثقافت سے مرعوب ہو کر اس کی طرف لپکتے ہیں۔ بے سمتی اور بے یقینی کے اس مرض نے انھیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اور ان کی حیثیت ایک ملت کے بجائے ایک قافلے کی سی ہو گئی ہے۔ ایمان ویقین کی کمزوری کے باعث وہ غیروں کے سہارے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ انھیں اپنے آپ پر اعتماد باقی نہیں رہا۔ جس کی وجہ سے امریکہ نے نائن الیون کے حادثے کے بعد دہشت گردی کے عذاب میں مسلمان اقلیت کو مبتلا کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ان کی آزادی ختم ہو کر غلامی کی سیاہ رات میں تبدیل ہو گئی۔ اب انھیں ہر طرف تاریکی، مایوسی، خوف اور دہشت کے سائے نظر آتے ہیں۔ اور نہایت خوف زدہ ہیں۔ گھبراہٹ کے عالم میں انھیں کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ مشکلات نے گھیر رکھا ہے۔ امریکہ انھیں دہشت گردی کے الزام میں ذلیل ورسوا کر رہا ہے۔ اور مختلف حربوں سے انھیں خوف زدہ کر رہا ہے۔ ناول "طاؤس فقط رنگ" سے اقتباس دیکھیے:

> " امریکن لوگوں نے سجیلہ اور مراد کو عجیب عجیب نظروں سے گھورا تو سجیلہ کو احساس ہوا کہ اس نے شلوار قمیض پہن رکھی ہے۔ اس سے شاید امریکن کپڑے پہن کر باہر نکلنا چاہیے تھا۔ اسے لگا جیسے وہ اس کا بیٹا دونوں ہی مجرم اور مسلم دہشت گرد ہیں ۔ انھوں نے ہی اس عظیم الشان ملک کو ناکامی سے ہمکنار کیا ہے۔۔۔ مراد امریکہ میں پیدا ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو کسی صورت کسی گورے کالے امریکن سے کم نہیں سمجھتا تھا مگر آج بساط الٹ چکی تھی۔ امریکہ میں جنم لینے والے بھی مجرم اور اجنبی سمجھے جانے لگے تھے۔ "[۴۴]

سجیلہ اور اس کے خاندان نے سنہرے مستقبل کی خاطر اپنا ملک چھوڑ کر دیار غیر میں جا کر خود اپنے لیے تباہی و بربادی کا سامان پیدا کیا تھا۔ حقیقت آشکار ہونے پر انھیں پتہ چلا کہ بظاہر سب کچھ اچھا نظر آنے والی چیزوں میں تو دھوکہ چھپا تھا۔ لیکن اب جب کہ ان کی آنکھوں سے دھول اتر چکی ہے اور سب کچھ صاف صاف دکھائی دینے لگا ہے مگر اب وہ اپنا سب کچھ لٹا چکے ہیں۔ ان کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ اپنا ثقافتی اور اپنی پہچان بننے والا لباس پہننے سے بھی ہچکچا رہے تھے۔ کہ کوئی ان کو پہچان کر زہر آلود جملہ ہی نہ کہہ دے۔

تعصب کی جڑیں امریکہ میں بہت گہرائی تک جاتی ہیں۔ مذہبی انتہا پسندی کی وجہ سے امریکہ میں مسلمان اقلیت کے لیے بے انتہا ناپسندیدگی بڑھی اور بالآخر نفرت میں تبدیل ہو گئی۔ اور اس مقصد کے لیے نائن الیون کے واقعے کو استعمال کیا گیا۔ تعصب انسانی نفسیات پر بہت مضر اثرات ثرات مرتب کرتا ہے۔ جب عام آدمی کی زندگی کا کوئی تحفظ نہ ہو تو اس کے دور رس اثرات سماج کی ترقی اور لوگوں کی نظریہ فکر بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ جو مجموعی طور پر سماج میں مایوسی اور عدم تحفظ کے احساس کو جنم دیتے ہیں۔ مسلمان اقلیتوں کی امریکہ میں رہنے کی صورت حال اس حادثے کے بعد مزید گمبھیر ہو چکی ہے۔ امریکی پالیسیوں نے مذہبی انتہا پسندی اور فرقہ وارانہ اختلافات و تصادم کو فروغ دیا۔ مسلمان اقلیت نے امریکہ جا کر ان کی زبان اور وضع قطع اختیار کی اور سمجھا کہ ایمان کا تعلق تو صرف دل سے ہے۔ ظاہری وضع قطع اور تراش وخراش کا اس میں کیا عمل دخل ہے۔ لیکن تجربے نے ثابت کیا کہ یہی وہ غلطی تھی جو قلب و دماغ پر چھا گئی اور انگریزیت مسلمانوں کے دلوں کی تہہ میں بیٹھ گئی۔ اسی طرح صنف نازک اس بات کی پابند ہے کہ وہ اپنی زینت کو چادر سے ڈھانپ کر رکھے۔ لیکن امریکہ کی ثقافت اور دولت نے مسلمان اقلیت کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکی افکار ان کے اندر اتنے راسخ ہو گئے کہ ہر چیز میں امریکہ کی تقلید واجب و لازم سمجھی جانے لگی۔ اور امریکہ کی پیروی ہی کو متمدن سماج کی بنیاد ماننے لگے۔ لیکن نائن الیون کے واقعے نے ان کی آنکھوں پر بندھی پٹی اتار دی اور انھیں واضح طور پر محسوس ہونے لگا کہ امریکہ میں ان کی کیا حیثیت ہے۔ بے شک وہ امریکہ ہی میں کیوں نہ پیدا ہوئے ہوں۔ اب مسلمان اقلیت بے شمار مسائل میں گھر چکے ہیں۔ جن سے نکلنا اب انھیں خود کے بس کی بات نہیں لگتی۔ اپنا سب کچھ قربان کرنے والوں کو بہت جلدی پتہ چل گیا کہ ہم نے اپنے لیے خود آہنی پنجرہ تیار کر لیا ہے۔ کیوں کہ امریکی نظام اور رویے ان کے محافظ کبھی بھی نہیں ہو سکتے۔ "آزادی اظہار کے نام پر" میں امریکی تعصب کے متعلق کچھ اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

> "اسلام رواداری، برداشت امن اور محبت کا درس دیتا ہے۔ وہ ہر قسم کی دہشت گردی کی سختی سے مذمت اور مخالفت کرتا ہے۔ مغرب اسلام کی آفاقی تعلیمات کے سامنے بے بس ہو چکا ہے۔ اب اس کی تمام تر توانائیاں محض اس بات پر صرف ہو رہی ہیں کہ مسلمانوں کو پوری دنیا میں دہشت گرد قرار دیا جائے۔"[۴۵]

جمہوریت میں ہی انسانی حقوق کی بحالی، انسانیت کا احترام اور برداشت کے عوامل شامل ہوتے ہیں۔ جو کہ ایک سماج کو جوڑے رکھنے اور اس میں استحکام لانے کا باعث بنتے ہیں۔ جب کہ آمریت سے یہ مقاصد حاصل نہیں ہوسکتے۔ مسلمان اقلیت کو اپنے اندر اتحاد پیدا کرنا چاہیے۔ اپنے دفاع کے لیے ایک نیا حوصلہ اور آزاد قوموں کی طرح زندہ رہنے کی خواہش پیدا کرنی چاہیے۔ امریکہ نے مسلمان اقلیت پر مسلسل فتنوں کے طوفان برپا کر دیے اور تمام شعبہ ہائے زندگی میں مثلاً علمی، اخلاقی، سماجی، سیاسی اور مذہبی سطح پر انھیں مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے اپنے دائرے میں جکڑ رکھا ہے۔ امریکی انتہا پسندوں کے خلاف سخت کاروائیاں ہونی چاہئیں۔ تاکہ مستقبل میں تعصب جیسے مسائل سے بچا جا سکے۔ ان تعصب پسندوں سے نمٹنے کے لیے میڈیا اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ میڈیا کو بتانا چاہیے کہ اسلام شخصی آزادی، امن، بھائی چارے اور استحکام کا مذہب ہے۔ پاکستانی مسلمان اقلیت کو اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے متحد ہونا چاہیے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تعصب ایک سماجی مسئلہ بن کر ابھرا ہے۔

جوانی انسان کی ذہنی ناپختگی کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں انسان کی زیادہ تر راہیں درست نہیں ہوتیں۔ جوانی میں انسان ٹھوکریں بہت کھاتا ہے۔ اس دور میں انسان کے اندر بڑی امنگیں ہوتی ہیں۔ دل میں بڑا جوش وولولہ ہوتا ہے۔ خیالات اور جذبات میں بڑی رنگینی اور شادابی ہوتی ہے۔ مراد بھی جوانی کی ترنگ میں آکر یہی سمجھ بیٹھا تھا کہ وہ امریکہ میں پیدا ہوا ہے لہذا اس پر تو شک کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اور نہ اسے کبھی امریکہ کی طرف سے کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ امریکہ کو دل سے اپنا وطن سمجھتا تھا اور اپنی اس سوچ پر بڑا مطمئن اور خوش تھا۔ لیکن جب اس پر حقیقت کھلی تو وہ دنگ رہ گیا۔ ناول "طاؤس فقط رنگ" سے امریکی تعصب کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> " تم پاکستانی ہو اور پاکستانی دہشت گرد ہوتے ہیں۔ ابھی تو نائن الیون کا زخم تازہ ہے۔۔۔ تمھیں اپنا سوشل سیکورٹی نمبر، آئی ڈی وغیرہ سب ہمیں دینا ہوگا۔۔۔ تمہارا کوئی کریمنل ریکارڈ ہے تو میں کمپیوٹر پر چیک کرلوں گی۔ ویسے میں F.O.B(Fresh of the boat)لوگوں پر آسانی سے اعتماد نہیں کرتی۔ سمجھے؟ وہ بدستور سخت لہجے میں بولی۔ .F.O B مراد سن کریوں چونکا جیسے کسی نے اسے گالی دے دی ہو۔ اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اسے پتہ تھا امریکہ میں F.O.B ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو بذریعہ کشتی کسی غریب ملک سے امریکہ آئے ہوں۔ غریب، جاہل اور بے

روزگار، امریکی طرز زندگی سے قطعاًناواقف اور نابلد ہوں۔ ایک پل کو اس کا جی چاہا کہ وہ یہ نوکری بڑھابڑھی کے منہ پر مارے اور چلا جائے مگر پھر اس نے اپنے حواس پر قابو پالیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ میں آپ کو بتادوں میں پیدائشی امریکن ہوں۔ نیویارک سٹی کے مشہور ہسپتال Lenox Hill میں پیدا ہوا ہوں جہاں امریکہ کے مشہور اور ہائی کلاس کے لوگ، سیاستدان علاج کرواتے ہیں۔۔۔ پلیز آئندہ کبھی مجھے F.O.B نہ سمجھیے گا کہ یہ غلط ہے اور بائی دی وے نائن الیون میں کوئی پاکستانی دہشت گرد انوالو نہیں تھایادرہے"(۴۶)

تمام مسلمان اقلیت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ جلی کٹی باتوں اور دھمکیوں سے انھیں کم مائیگی کا احساس دلایا گیا۔ اور یہ چاہ کر بھی ترکی بہ ترکی سخت لہجے میں جواب نہیں دے سکتے۔ اس قدر ڈرے اور سہمے ہوئے ہیں کہ ان کی سخت باتیں نہ چاہتے ہوئے بھی برداشت کر رہے ہیں۔ مراد ہمت کرکے بولا تو صحیح مگر اس کی بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی۔ وہ خود پر گزرنے والی کیفیات اور اپنے گردوپیش وقوع پذیر ہونے والے حالات وواقعات خاموشی سے سہہ رہے ہیں۔ نہ اپنے جذبات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ ایسا کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ یہ دنیا جس میں انسان رہ رہا ہے شیشہ سازی کے ایک کارخانے کی مانند ہے جہاں پر کام کرنے والوں کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ ان کی ذرا سی بے احتیاطی سے شیشہ ٹوٹ سکتا ہے۔ اقلیت کو بھی مغرب سدھارنے کے بعد بڑی احتیاط سے زندگی گزارنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ ان کی ذرا سی غفلت ان کی آنے والی نسلوں کی زندگی بگاڑ دے گی اور وہ صرف ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ جس طرح مراد کو یہ فخر تھا کہ اس کی پیدائش امریکہ کی ہے اس لیے وہ تمام چیزوں سے بری ہے۔ مگر اسے قدم قدم پر دکھ اور تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں۔ کئی قسم کے امتحانات سے گزرنا پڑا۔ وہ بے بسی اور بے چارگی کی تصویر بن گیا۔ لیکن امریکہ کے خلاف ایک آواز تک بلند نہ کر سکا۔ امریکہ کے تمام ظلم وستم اور ہر طرح کی زیادتیوں کو صبر، حوصلے اور تحمل سے برداشت کرنے پر انتہائی مجبور ہو گیا۔ مگر ان کے سامنے احتجاج تو دور کی بات اف تک نہ کہہ سکا۔ کیوں کہ اگر وہ کوئی قانونی چارہ جوئی کرتا بھی بجائے اس کے کہ اس کی دادرسی کی جاتی اسے کسی نئے عذاب میں پھنسا دیا جاتا۔ امریکہ اقتدار اور قوت وطاقت کے نشے میں سرشار ہو کر فرعونیت پر اتر آیا ہے۔ اور اس دنیا میں خود کو ہی سب کچھ خیال کرتا ہے۔ مگر وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ اس کا اقتدار قوت وطاقت سب ناپائیدار اور فانی ہیں۔ یہ چیزیں کسی بھی وقت اس سے چھن سکتی ہیں۔ کیوں کہ یہ فطرت کا

اصول ہے کہ اس کائنات میں کوئی بھی چیز ہمیشہ ایک ہی حالت میں نہیں رہتی۔ قوت و طاقت، اقتدار اور جاہ و حشمت بھی ہمیشہ کسی کے پاس نہیں رہتے۔" آغا امیر حسین "اپنی کتاب "بھارت اور امریکہ پاکستان کے دوست یا دشمن" میں لکھتے ہیں:

"گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد دنیا نے امریکہ اور اہل مغرب کا ایک نیا چہرہ دیکھا ہے۔ یہ چہرہ جس خوب صورت نقاب کے پیچھے تھا، ورلڈ ٹریڈ ٹاورز کی تباہی نے ایک ہی جھٹکے میں نوچ کر پرے پھینک دیا ہے۔ وسیع المشربی، روشن خیالی، عدم امتیاز، سیکولرازم اور جمہوری اقدار ایک ہی ریلے میں بہہ گئے۔"(۴۷)

مسلمان اقلیت مغربی اقدام کی اندھا دھند تقلید کو ہی ترقی حیال کرتے ہیں۔ ان کی قوت عمل اور قوت فکر پر جمود طاری ہو چکا ہے۔ اور ساتھ ہی مغربی جہالت کی تاریکیوں میں ڈوب رہے ہیں۔ مسلمان اقلیت اپنے مذہب اور اپنی ثقافتی، تہذیبی اور سماجی قدروں سے دور ہو گئے ہیں۔ یہ طبقہ اپنی ہر اچھی چیز کے مقابلے میں امریکہ کی برائیوں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ انھیں اپنی ہر ایک چیز میں ذلت و حقارت نظر آتی ہے۔ امریکہ نے انھیں مادی ترقی حاصل کرنے اور دنیاوی زندگی کو کامیابی سے گزارنے کے خوش نما فریب میں الجھا کر ذہنی طور پر اپنا گرویدہ کر لیا ہے۔ اور اپنے حصار میں پھنسا لیا ہے۔ مغربی تعلیم و تربیت سے آراستہ یہ طبقہ نہ صرف اپنی ثقافتی اور سماجی اقدار سے دور ہو گیا ہے بل کہ مذہب سے بھی بیگانہ ہو گیا ہے۔

بد قسمتی سے مسلمان اقلیت دنیاوی ترقی کے جوش میں اس قدر آگے نکل گئے ہیں کہ انھیں اپنے مذہب کی بنیادی باتیں بھی یاد نہیں رہیں اور نہ انھیں کوئی شناسائی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں امریکہ کے تمام قوانین زبانی یاد ہیں۔ اُن قوانین اور ثقافت کے بارے میں ان سے جو بات بھی پوچھی جائے تو یہ اس کا نہایت ہی تسلی بخش جواب دیں گے لیکن اگر ان سے اپنے مذہب کی کوئی بنیادی بات بھی پوچھ لی جائے تو یہ اس کا جواب بالکل بھی نہیں دے سکیں گے۔ جب امریکہ نے مراد پر دہشت گردی کا الزام لگا دیا تو اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے کوئی شخص پنجرے میں بند پرندے کی طرح مجبوری اور بے بسی کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ یا جس طرح کوئی گنہگار اپنی خطا کے باعث لوگوں کے درمیان میں سہما بیٹھا ہو۔

پاکستانی مسلمان اقلیتوں کی ایک بڑی تعداد روزگار اور بہتر مستقبل کی تلاش میں امریکہ جانے کے چکروں میں سرگرداں رہتی ہے۔ کیوں کہ ملک میں معاشی ترقیاتی منصوبوں کی کمی ہے۔ جو مایوس ہوتے ہوئے

خاندانوں کو امید کی کرن دلا سکے۔ کیوں کہ جتنا کوئی سماج خوش حال ہو گا اور وسائل کی فراوانی ہو گی تو قدرتی طور پر کوئی بھی اپنے ملک کو چھوڑ کر جانا پسند نہیں کرے گا۔ امریکی مسلمان اقلیت کو اپنے موجودہ نامساعد حالات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ جس طرح ہر تاریکی کا انجام اجالا ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کی مشکلات اور مایوسی کا دور بھی ختم ہو جائے گا۔ مسلمان اقلیت جو ایک عرصے سے غفلت کی نیند سوئے رہے اب ان کی بیداری کا دور شروع ہو گیا ہے۔ ایک سنہرے، روشن اور تاب ناک مستقبل حاصل کرنے کی خاطر امریکہ جیسے تعصب پسند ملک میں جا کر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں اور آخر انجام کیا ہوتا ہے۔ناول "طاؤس فقط رنگ" سے امریکی تعصب کا ایک اور اقتباس دیکھیے:

> "سجیلہ بیٹے کے ہاتھ ہاتھوں میں لیے انھیں فروری کے موسم کی بے رحم ٹھنڈ میں جمتے ہوئے سوچنے لگی۔ اس بچے کو کتنا مان تھا کہ وہ پیدائشی امریکی ہے مگر وہ اپنی چمڑی کو براؤن سے سفید نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ بھی ہو امریکہ میں مسلمان ہونا اب ایک اضافی بوجھ بن چکا ہے۔ حالات مشکل تر ہوتے جا رہے ہیں۔
>
> بیٹا اب یہ دیکھ لو کہ تمہیں بہت احتیاط اور سمجھ بوجھ سے چلنا ہو گا۔ تمہارا ایک کریمنل ریکارڈ بن چکا ہے۔ جو پانچ سال تک آن لائن رہے گا اور چیک کیا جا سکے گا۔۔۔ کوئی گڑ بڑ نہ کی تو وہ مٹ جائے گا ورنہ زندگی مشکل ترین ہوتی چلی جائے گی۔ آئندہ کسی جاب سرچ میں وہ ریکارڈ تمہاری راہ میں حائل ہو سکتا ہے۔ کرائے کا گھر، یا بینک سے لون لیتے وقت تمہارے لیے مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ اب تمہارے لیے وکیل ڈھونڈنا ہے۔ وکیل کرنے پر پیسہ تو بہت لگے گا۔ میں اپنے زیور بیچ دوں گی۔ مام نے کہا تو مراد نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ "[۴۸]

مراد دہشت گردی کے جھوٹے الزام کی مصیبتیں برداشت کر رہا تھا۔ اس پر یاس، ناامیدی اور رنج و کرب کی کیفیت طاری تھی۔ اس کا حوصلہ دم توڑ رہا تھا۔ عجیب سی بے کسی طاری تھی۔ ایسا لگ رہا تھا یہ مشکل اب کبھی ختم نہیں ہو گی۔ کیوں کہ انسان طبعاً آزادی پسند واقع ہوا ہے۔ پابندیوں سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ اور آزادی کے تحفظ کے لیے جان تک قربان کر دیتا ہے۔ کھلے اور آزاد ماحول میں پرورش پانے سے انسان کی شخصیت کا نکھار اور زیادہ اجاگر ہو جاتا ہے۔ اور اگر اسے حسب ضرورت ماحول میسر نہ آئے تو اس پر ناگوار

اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ وقت اور حالات انسان کو تجربہ کار بنا دیتے ہیں۔ بعض دفعہ ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں یا ایسے واقعات اس پر گزرتے ہیں۔ جو اس کی زندہ دلی چھین لیتے ہیں اور اسے اداسی اور خاموشی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اسے تلخ رویوں کو سہنا پڑتا ہے۔ جب بھی انسان کو کوئی غم اور مصیبت آن گھیرتی ہے تو وہ دو طرح کے رویے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ رونا دھونا اور چیخنا چلانا شروع کر دیتا ہے۔ یا پھر صبر کے ساتھ اس غم اور مصیبت سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دکھ اور مصیبت میں رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہاں حوصلے اور جرات کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔ اخلاقی بگاڑ سماج کو منتشر اور پریشان کر دیتا ہے۔ اس لیے افراد کے اخلاق و کردار کی تربیت بھی ضروری ہے۔ تاکہ ان میں اخوت، انسانی پاسداری، خلوص اور اچھے جذبات پروان چڑھ سکیں۔ اور سماج میں امن و سکون قائم ہو۔ تعصب سے پاک سماج کے لیے ضروری ہے کہ اس کے افراد میں ہمدردی، تعاون اور خیر سگالی کے جذبات موجزن ہوں۔ مختلف اقوام کے افراد میں طبقاتی تقسیم، منافرت اور تعصب نہ ہو۔ یہ برائیاں تعصب کی وجہ سے جنم لیتی ہیں۔ جن سے فساد، تشدد، الزام اور بے راہ روی پیدا ہوتی ہے۔ "آزادی اظہار کے نام پر" میں لکھا ہے:

> 'اگرچہ امریکیوں کا دعوی ہے کہ ان کا معاشرہ دنیا کے مہذب ترین معاشروں میں سے ہے جہاں تمام شہریوں کو جان و مال کا مکمل تحفظ حاصل ہے مگر حقیقت حال اس دعوے سے بہت مختلف ہے۔ مسلمان امریکہ کی سب سے بڑی اقلیت ہیں، مگر یہ بڑی اقلیت سب سے زیادہ غیر محفوظ ہے۔ پوری امریکی قوم ہی مسلمانوں کی جان و مال کو غیر محفوظ کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔"[۴۹]

جس طرح سفر کے لیے منزل کا تعین ضروری ہے اسی طرح تعصب سے بچنے اور خوش گوار زندگی گزارنے کے لیے مقاصد کا تعین بھی کرنا ضروری ہے۔ کسی کام کے لیے سچی تڑپ اور حقیقی ذوق و شوق اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اس کے پیچھے ایک باہمت اور کچھ کر گزرنے کی سوچ رکھنے والا انسان ہو۔ کامیابی کے نشے میں دھت اور امریکہ کے بچھائے ہوئے جال میں الجھے ہوئے مسلمان اقلیت کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ امریکہ کا کھوکھلا پن اور دوغلا پن ان پر ظاہر ہو چکا ہے۔ مسلمان اقلیت کو اپنے اندر غیرت اور دلیری جیسی خوبیاں پیدا کرنی چاہیے۔ مسلمان اقلیت کو ایسا ہونا چاہیے کہ نہ تو امریکہ کے دیے ہوئے دکھوں اور تکلیفوں سے تنگ آ کر اپنی زندگی سے مایوس ہو جائیں کہ مرنے کی خواہش کرنے لگیں اور نہ ہی وہ امریکہ کی رنگینی اور

دل چسپیوں میں اس قدر گم ہو جائیں کہ انھیں دنیا کو چھوڑنے اور مرنے کا خوف ستانے لگے۔اس کے برعکس وہ اپنی زندگی ہنسی خوشی جینے کی کوشش کریں اور ہر حال میں اللہ پاک کا شکر ادا کرتے رہیں۔ ایسے لوگ مکمل مسلمان کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ مسلمان اقلیت کو اپنے اندر بیداری کی لہر پیدا کرنی چاہیے۔ ایک ایسا جذبہ پیدا کرنا چاہیے جو انھیں ان کی کھوئی ہوئی شناخت واپس دلا سکے۔ ورنہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا مسائل میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا جائے گا۔اور امریکہ تعصبات کو ہر صورت خیر آباد کہنے پر مجبور ہو جائے گا۔

امریکہ جا کر مذہب سے بیزاری، حصول دولت کی دوڑ اور جدید امریکی تہذیب کے لوازم مسلمان اقلیت کے پسندیدہ مشاغل ہوتے ہیں۔ انھیں لگتا ہے کہ پاکستان میں تو وہ ایک پس ماندہ زندگی گزار رہے تھے یہاں آکر وہ ہر طرح کی گرفت اور روک ٹوک سے آزاد ہیں۔ اور اپنی من پسند زندگی گزار سکتے ہیں۔ یہ احساس انھیں بڑا فرحت بخش محسوس ہوتا ہے۔اس وقت کرہ ارض پر مسلم ممالک کی تعداد ۵۶ ہے۔ جن میں آباد مسلمانوں کی مجموعی آبادی تقریباً ایک چوتھائی ہے۔ مسلم ممالک کے پاس مدنی دولت سے مالا مال علاقے ہیں۔ تاہم باہمی عدم تعاون اور اتحاد و یگانگت کے فقدان کے باعث وہ ابھی تک ایک بڑی قوت بننے سے قاصر ہیں۔ اتحاد و اتفاق ہی ایک ایسی قوت ہے جو مسلمانوں کو ان کی عظمت رفتہ واپس دلا سکتی ہے۔ مگر آج ذرا سے مفادات کی خاطر مجموعی فوائد مفادات کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نیلم احمد بشیر کے ناول "طاؤس فقط رنگ" سے اقتباس دیکھیے:

> "اب مراد کے لیے ایک نئی پریشانی کا سامنا تھا۔ اس کے آفس نے اسے فارغ کر دیا تھا ۔وہ کسی ایسے شخص کو نہیں رکھنا چاہتے تھے جس کا کریمنل ریکارڈ آن لائن آچکا ہو۔ مراد نے لاکھ کہا یہ مقدمہ جھوٹا ہے اور وہ اس سے بری ہو جائے گا مگر انھوں نے اسے صاف جواب دے دیا۔ مسلم اور دہشت گردی دو ایسے لفظ تھے جہاں بھی اکٹھے ہوتے ،لوگوں کے ذہن میں شکوک و شبہات پیدا کر دیتے۔۔۔ سجیلہ اس افتاد پر کڑھ کر کہنے لگی بڑے متعصب ہیں یہ امریکن لوگ۔چاہے ساری زندگی بھی یہاں گزار لو، یہیں جنم لو، آپ سیکنڈ یا تھرڈ کلاس شہری ہی رہتے ہیں۔"(۵۰)

مراد کو جھوٹے الزام کا دکھ اور تکلیف کسی بھی طرح موت سے کم محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بل کہ اسے لگ رہا تھا کہ اگر موت کی تکلیف ہوتی تو ایک بار ہی برداشت کرنی پڑتی لیکن جھوٹا اور وہ بھی دہشت گردی کا الزام موت سے بھی زیادہ اسے اذیت دے رہا تھا۔ زندگی میں فتح و شکست، مذہبی تعصب، ناکامی، جھوٹے الزام، امید وغیرہ سب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن جو شخص ان سے گھبرائے بغیر ناامیدی کے اندھیروں میں بھی پر امید رہتا ہے اور کوشش کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا تو ایک وقت آتا ہے کہ اندھیرے اس کے راستوں سے خود بخود چھپٹ جاتے ہیں۔ اور منزل و مراد صبح روشن کی طرح اس کا استقبال کرتی ہے۔ زندگی میں پیش آنے والی مشکلات سے ہرگز گھبرانا نہیں چاہیے۔ اور مسلمان اقلیت کو تو بالکل بھی نہیں۔ کیوں کہ اگر ساری مغربی دنیا مل کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہے مگر اللہ پاک نہ چاہیں تو وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ بس وقتی طور پر پریشانی ہوتی ہے۔ ایک مسلمان کا اس بات پر پختہ ایمان ہے۔ اللہ پاک کے خصوصی کرم سے مسلمان اقلیت کو جھوٹے دہشت گردی کے الزام کے سفر کی کڑی دھوپ میں گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں مہیا کرنے والے ہزاروں سایہ دار شجر مل جائیں گے۔ مسلمان اقلیت کو ترقی اور سیدھی راہ پر چلنے کے لیے ایمان داری اور دیانت داری کا دامن بھی تھامنا چاہیے۔ کیوں کہ جب تک انسان ایمان داری سے اپنے مقاصد کے حصول کی جدوجہد نہیں کرتا اور پھر دیانت داری سے ان پر عمل پیرا نہیں ہوتا وہ کامیابی و ترقی حاصل کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ مقصد کے حصول کے لیے عمل سے ایمان داری برتنا، منزل کے حصول کو آسان تر بنا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمان اقلیت کو اخلاقی قباحتوں سے محفوظ رہنا چاہیے۔ اور اخلاق حسنہ کو اپنانا چاہیے۔ کیوں کہ اخلاقی خصوصیات، عادات اور قوانین کو ملحوظ خاطر رکھنے والے شخص کی شخصیت منتشر نہیں ہوتی۔ اور جب اس کی شخصیت کی تکمیل ہو جاتی ہے اور پھر وہ یکسوئی کے ساتھ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے عمل پیرا رہتا ہے۔ اور ساتھ ہی اللہ رب العزت کی امداد کا طالب بھی رہتا ہے۔ اور اس ذات باری کی رحمت سے ناامید اور مایوس نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمان اقلیت کو یورپ کے تعصبی غلبے سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔ تب جا کر ایک نئی راہ اور تازہ قوت کے ساتھ اپنی آزادی اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ "عبدالرافع رسول "اپنی کتاب" مسلمانوں کے خلاف مغرب کی تہذیبی اور فکری جارحیت "میں لکھتے ہیں:

> " نائن الیون کے بعد امریکہ کے قیادت میں مغرب کی حکومتوں اور امریکی و یورپی میڈیا نے دہشت گردی اور انتہا پسندی کی آڑ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف انتہائی

زہریلہ اور مسموم پروپگنڈا شروع کیا جس کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔ مغربی میڈیا کی طرف سے پوری دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمان دہشت گرد اور انتہا پسند ہیں۔ اس لیے پوری دنیا میں امن و امان کو یقینی بنانے کے لیے اسلامی تعلیمات میں تبدیلی ،روشن خیالی اور عتدال پسندی کے نام پر اسلام کا جدید مغربی ایڈیشن پیش کرنااور دہشت گرد اور انتہا پسند مسلمانوں کا خاتمہ ضروری ہے۔"(۵۱)

نائن الیون کے حادثے کے بعد مسلمان اقلیت پر امریکہ کی مذہبی تعصب کی ذہنیت مزید آشکار ہوگئی ہے۔اس کے بعد امریکی حکومت نے ہر ممکن طریقے سے مسلمان اقلیت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔"ول کیملیکا" اپنی تھیوری میں لکھتے ہیں۔ آج تک اکثریتی ثقافتوں نے اقلیتی ثقافتوں کو بر قرار رکھنے کے لیے اپنے روشن خیال مفاد میں نہیں دیکھا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نسلی تعصب کی وجہ سے ہے۔نوجوان مسلمان اقلیت کو بے عملی اور امریکہ کی اندھادھند تقلید سے خود کو ہر صورت دور رکھنا چاہیے۔جوانی کا زمانہ جوش و جذبات،جسمانی اور ذہنی قوتوں کے حوالے سے عروج کا زمانہ ہوتا ہے۔ انسانی اعضا مضبوط ہوتے ہیں۔اعصاب میں قوت اور طاقت ہوتی ہے۔ انسان پہاڑوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔زندگی کا یہ دور جوش و جذبات کا دور ہوتا ہے اس لیے انسانی جذبات پر ہوش کے جائے جوش کا جذبہ زیادہ غالب ہوتا ہے۔لیکن اب امریکہ کی طرف سے تہذیب و تمدن اور فتوحات کے اڈتے ہوئے سیلاب نے مذہب سے روگردانی کرنے والے مسلمان اقلیتوں کو نئے سرے سے اپنے مذہب اور ثقافت کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ان میں بیداری کی لہر پیدا ہو رہی ہے۔ سنہری مستقبل پانے کی خاطر یہ سب کچھ بلا بیٹھے تھے مگر اب ان کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔مسلمان اقلیت کو امریکہ میں اپنے مذہب کی روشنی میں اپنے حال اور مستقبل کی راہوں کا تعین کرنا چاہیے۔

حوالہ جات

۱۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۳۲۸

۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۳۸

۳۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، ص ۴۴۶

۴۔ جنید قیصر، پاکستانی اقلیتوں کا نوحہ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۱

۵۔ شوکت صدیقی، جانگلوس (جلد سوم)، رکتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۲۱ء، ص ۴۵۳

۶۔ جنید قیصر، پاکستانی اقلیتوں کا نوحہ، ص ۷۰

۷۔ شوکت صدیقی، جانگلوس (جلد سوم)، ص ۴۵۴، ۴۵۵

۸۔ سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں، ادارہ تعلیم و تحقیق، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۳۴

۹۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۴۱۹

۱۰۔ جنید قیصر، پاکستانی اقلیتوں کا نوحہ، ص ۱۷

۱۱۔ خالد فتح محمد، زینہ، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۲۵۰

۱۲۔ جنید قیصر، پاکستانی اقلیتوں کا نوحہ، ص ۶۸

۱۳۔ نیلم احمد بشیر، طاوس فقط رنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۲۴۶

۱۴۔ آغا امیر حسین، بھارت اور امریکہ پاکستان کے دوست یا دشمن، کلاسیک دی مال، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۷۳

۱۵۔ صفدر زیدی، بھاگ بھری، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۳۳، ۳۴

۱۶۔ مبارک علی، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ، ص ۷۷

۱۷۔ صفدر زیدی، بھاگ بھری، ص ۳۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۱

۱۹۔ مبارک علی، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ، ص ۶۸، ۶۹

۲۰۔ شوکت صدیقی، جانگلوس (جلد سوم)، ص ۴۴، ۴۴۸

۲۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور معاشرہ، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۹

۲۲۔ شوکت صدیقی، جانگلوس (جلد سوم)، ص ۴۵۰

۲۳۔ احمد سلیم، پاکستان اور اقلیتیں، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۰ ء، ص ۴۰

۲۴۔ محمد الیاس، کہر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۶

۲۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ، ص ۳۱

۲۶۔ محمد الیاس، کہر، ص ۲۲، ۲۳

۲۷۔ سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں، ادارہ تعلیم و تحقیق، ص ۳۵

۲۸۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، ص ۴۲۷

۲۹۔ سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں، ادارہ تعلیم و تحقیق، ص ۲۰

۳۰۔ صفدر زیدی، بھاگ بھری، ص ۲۱

۳۱۔ احمد سلیم، پاکستان اور اقلیتیں، ص ۳۹۹

۳۲۔ صفدر زیدی بھاگ بھری، ص ۲۴

۳۳۔ احمد سلیم، پاکستان اور اقلیتیں، ص ۴۰۰

۳۴۔ صفدر زیدی، بھاگ بھری، ص ۳۲

۳۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ، ص ۴۱

۳۶۔ شوکت صدیقی، جانگلوس (جلد سوم)، ص ۴۵

۳۷۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور معاشرہ، ص، ۴۱

۳۸۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، ص ۴۱۰، ۴۱۱

۳۹۔ احمد سلیم، پاکستان اور اقلیتیں، ص ۳۸۹

۴۰۔ علی اکبر ناطق، نو لکھی کوٹھی، ص ۴۱۲

۴۱۔ سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں، ادارہ تعلیم و تحقیق، ص ۱۰

۴۲۔ علی اکبر ناطق، نو لکھی کوٹھی، ص ۴۱۸

۴۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ، ص ۷۵

۴۴۔ نیلم احمد بشیر، طاوس فقط رنگ، ص ۴۳

۴۵۔ محمد متین خالد، آزادی اظہار کے نام پر (ترتیب و تحقیق)، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۸۹

۴۶۔ نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، ص ۵۱، ۵۲

۴۷۔ آغا امیر حسین، بھارت اور امریکہ پاکستان کے دوست یا دشمن، ص ۲۶۹

۴۸۔ نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، ص ۲۰۹

۴۹۔ محمد متین خالد، آزادی اظہار کے نام پر (ترتیب و تحقیق)، ص ۵۰۵

۵۰۔ نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، ص ۲۳۸، ۲۳۹

۵۱۔ عبدالرافع رسول، مسلمانوں کے خلاف مغرب کی تہذیبی اور فکری جارحیت، محاذ کشمیر پبلی کیشنز، لاہور، س ن، ص ۴۷

باب سوم

پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے سماجی مسائل کی عکاسی

سماجی مسئلے کا تعلق روز مرہ زندگی سے ہے۔ یہ ہماری مختلف نفسیاتی اور سماجی حالتوں کی علیحدہ علیحدہ یا مشترکہ اثرات کی پیداوار ہے۔ اس سے ہر حالت میں انسان انفرادی یا اجتماعی صورت میں متاثر ہوتا ہے۔ روز مرہ کی زندگی کے معاملات کو احسن طریقے سے انجام نہیں دے سکتا۔ مسئلہ کی کوئی بھی صورت ہو یہ منفی اثرات افراد کے رویوں، رکاوٹوں اور انحراف کی ایسی صورت ہے جس سے آدمی متاثر ہوتا ہے۔ اس کی روز مرہ کی ترقی اور انفرادیت متاثر ہوتی ہے۔ سماجی مسئلہ ایک ایسی حالت ہے جو سماج کی اعلیٰ اقدار کا آئینہ دار ہوتا ہے اور سماج اسے نہیں پہچانتا۔ اگر سماج کوشش کرے تو حالت سدھر سکتی ہے۔ یہ ایک ایسی جسمانی حالت ہے جس کو لوگ تسلیم کرتے ہیں اور اس کے خلاف کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا پسند کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تربیتی اداروں، اساتذہ اور علم کی بھی کمی ہے جس میں سے غربت دور ہونے میں رکاوٹ موجود ہے۔ ناخواندگی بھی ہمارے لیے خطرناک ہے۔ معیار تعلیم بھی اتنا تسلی بخش نہیں جس پر بھروسہ کیا جاسکے۔ بہت سی رسومات اور رواج ہمارے ہاں غربت کا باعث ہیں۔ ہم بلاضرورت خرچ کرتے ہیں۔ شادی بیاہ، منگنی، سالگرہ اور انتقال پر خوب روپے بہاتے ہیں۔ اس کے علاوہ تقدیر پر شاکر رہ کر بھی مختلف مسائل کو دعوت دیتے ہیں۔ غربت کے باعث اقلیت تعلیم حاصل کرنے سے قاصر ہیں وہ بچوں کو ابتدائی عمر سے ہی مختلف روزگار پر لگا دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے گھر والوں کی کفالت کرنے کے قابل ہو جائیں۔ دور افتادہ علاقوں میں جاگیرداروں اور وڈیروں نے ذاتی مفاد کی خاطر اقلیتوں کو تعلیم حاصل کرنے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ تاکہ یہ لوگ اپنے حقوق سے آگاہ نہ ہو سکیں اور تاعمر ان کی غلامی کرتے رہیں۔ پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت افلاس کی حالت میں اپنے خاندان کا پیٹ بھرنے کی خاطر دن رات کام کرتے ہیں مگر پھر بھی ان کی مالی حالت سدھرنے کا نام نہیں لیتی۔ ہمارے ہاں علاقائی مقاصد کو ترجیح دینا، فرقہ بندی، صوبائی عصبیت اور ملک و قوم کو پس پشت ڈال کر اپنی ذاتی اغراض کو اولیت دینا سرفہرست ہے۔ جو قوت ہم تعمیر میں خرچ کرسکتے ہیں اسے تخریب میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ سب امور ہمارے سماج پر غلط اثرات ڈالتے ہیں اور سماجی مسائل پیدا کرتے ہیں۔ پاکستان میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ ان کا آپس میں ایک سماجی تعلق قائم ہے۔ انفرادی و اجتماعی زندگی میں پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت کے ساتھ رواداری، عدل و انصاف، نیکی اور خوش اخلاقی سے پیش آنا ہمارا اولین فرض ہے۔ کیوں کہ

سماجی حقوق کے اعتبار سے تمام شہری برابر ہیں۔ عام شہری کے حقوق ہر انسان کے لیے یکساں ہیں۔ ان میں مذہب کی بنیاد پر کسی سے امتیازی سلوک نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن پاکستان میں آباد ہندو اور عیسائی اقلیتوں کو سماج میں امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب کہ اسلام اور پاکستان کا آئین و قانون بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اور "ول کیملیکا" کی تھیوری بھی اسی تناظر میں ہے کہ اقلیتیں بظاہر کمزور ہوتی ہے اور ان کے سماجی حقوق کی پامالی کا اندیشہ رہتا ہے۔ کسی بھی ریاست اور سماج کے امن و استحکام کے لیے ضروری ہے کہ اس میں سماجی انصاف کا بول بالا ہو۔ سماج کے مخصوص افراد تک انصاف محدود نہ ہو بل کہ سماج کے ہر عام و خاص کو آسانی سے میسر ہو۔ پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت پاکستانی سماج کا حصہ ہیں اور اپنے ملک پاکستان کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے سے کبھی بھی دریغ نہیں کریں گے۔ لیکن اپنی حب الوطنی کے باوجود بہت سے سماجی مسائل کا شکار ہیں۔ مثلاً ناروا سلوک، حب الوطنی کی سزا، طاقت وروں کے ظلم و ستم، اقلیتی عورت کا جنسی استحصال، سماجی جبر کے خلاف باغیانہ رویے اور سماجی منفی رویے وغیرہ۔

سماجی منفی رویے

انسان کا ہر عمل سوچ و فکر کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے۔ اور اس عمل کو انسانی رویے کا نام دیا جاتا ہے۔ رویے سے مراد انسان کی شخصیت کا وہ عنصر ہے، جو اسے سوچنے، محسوس کرنے اور کوئی عمل کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ انسانی نفسیات کا خاصہ ہے کہ جس بری بات یا منفی رویے کو بھلانے کے لیے وہ دلی طور پر آمادہ نہ ہو بل کہ حالات و واقعات کے جبر کے باعث ایسا کرنے پر مجبور ہو تو وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ شعوری طور پر وہ اس واقعہ کا نقش اپنے دل و دماغ سے مٹانے کے جتنے بھی جتن کرئے اس کے دل کے نہاں خانوں میں اس کا عکس موجود رہتا ہے۔ اگر وقتی یا عارضی طور پر کسی محدود عرصے کے لیے وہ اس یاد کو اپنے ذہن سے نکالنے میں کامیاب ہو بھی جاتا ہے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ تلخ رویے اپنی پوری شدت اور توانائی کے ساتھ اس کے دل و دماغ کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں۔ مضبوط سے مضبوط قوت ارادی والے شخص کی زندگی میں کوئی نہ کوئی کمزور لمحہ ایسا آتا ہے کی منفی رویے اسے بے چین کر دیتے ہیں۔ ہمیں سماج میں محبت کا چراغ جلانا چاہیے جو منفی رویے کی تاریکیوں میں بھی روشن رہے۔ کیوں کہ محبت اور اچھائی کی دنیا ایک ایسے کھلے میدان کی طرح ہے جس کے وسیع رقبے کی کوئی حد نہیں۔ منفی رویوں سے سماج کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ کسی بھی سماج کے افراد کا مجموعی رویہ اس قوم کی پہچان ہوتا ہے۔ پاکستانی ناول نگاروں نے

اقلیتوں کے مسائل کی نشان دہی کرتے ہوئے جہاں دوسرے موضوعات کو مدنظر رکھا ہے وہیں اقلیتوں کو سماج میں جن منفی رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ ہمارا اکثریتی سماج اقلیتوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ انھیں ہر برائی اور جرم کی جڑ اقلیتی ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے ناول "زینہ" کا اقتباس دیکھیں:

> "ہادیہ کی پریشانی میں سمجھ سکتا تھا۔۔۔ مارتھا کی طرح وہ بھی اقلیت کا حصہ تھی اور میں دیکھ چکا تھا کہ ہمارے ہاں اقلیت کی کوئی اہمیت نہیں اور اکثریت کے مطابق وہ جھوٹے اور ہر وقت ملک دشمن کاروائیوں میں ملوث رہتے ہیں۔"[۱]

اقلیتوں کے متعلق پنپتی یہ برائی ہماری منفی سوچ کا شاخسانہ ہے۔ یہ کم ظرفی کی علامت ہے کہ کسی کو محض اقلیت ہونے کی بنا پر منفی سماجی رویوں کا سامنا کرنا پڑے۔ ہادیہ کو یہ پریشانی تھی کہ اس کا باپ کبھی جوانی کے دور میں کچھ غلط کاموں میں ملوث تھا لیکن پھر اس نے ان کاموں کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ لیکن اب کچھ لوگ ایسے تھے جو ہادیہ کو بلیک میل کر رہے تھے۔ کہ اس کے باپ کے جرائم کی تمام داستان کو از سر نو دنیا کے سامنے لایا جائے گا۔ اور ہادیہ کو ڈر تھا کہ اقلیت ہونے کی بنا پر اس کی کوئی دادرسی نہیں ہو گی۔ کسی اقلیت کو کم تر یا مجرم سمجھنا، اپنی برتری کی دھاک بٹھانا، انھیں ملک دشمن سمجھ کر ان کی عزت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دینا یہ منفی سماجی رویے قطعاً درست نہیں۔ اقلیتوں کے ساتھ منفی سماجی رویے پر "سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں" میں یوں اظہار خیال کیا گیا ہے:

> "غیر مسلموں سے محبت اور قربت کا تعلق پیدا کر کے اسلام کی حقیقی تعلیمات سے انھیں متعارف کروائیں۔ اس رویہ سے ہٹ کر اختیار کیے جانے والا رویہ اکثریت کے لیے ساز گار ہے نہ اقلیت کے لیے۔"[۲]

سماجی منفی رویے اقلیتوں کے لیے چڑچڑے پن کا باعث بنتے ہیں جو مزید ذہنی بیماریوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ اور عمومی رویوں کی تباہی اور سماجی شکست و ریخت کا باعث بنتے ہیں۔ ایسے بیمار سماج میں صحت مند ذہنی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہیں۔ تخلیقی عمل ختم ہو جاتا ہے۔ اقلیتیں جب سماجی منفی رویوں کو دیکھتی ہیں تو ان کے لیے اکثریت کے ساتھ مل کر چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ نفسیاتی الجھنوں

کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ سماج سے اتحاد ختم ہو جاتا ہے کیوں کہ سماج اقلیتوں کے وجود کو برداشت نہیں کرتا۔ ناول "زینہ" سے ہی ایک اور اقتباس دیکھیں:

> " یہ لوگ ملک میں اقلیتوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہنسے۔ میں کہتا ہوں اقلیتیں ہماری زمین سے اگنے والے پھولوں کی طرح ہی ہیں اگرچہ ہمارے گھر میں خالی زمین بالکل نہیں، ہر طرف فرش ہے۔ میں ہمیشہ ان کے حق میں بات کرتا ہوں جس کی وجہ سے ہمیں اقلیت سرپرست سمجھا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے وہ اقلیتوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ "(۳)

اقلیتوں کے ساتھ اس طرح کے سماجی منفی رویے انھیں اندر سے توڑ دیتے ہیں۔ اور یہ ٹوٹ پھوٹ سماج میں غیر رواداری کے رویے کو پروان چڑھاتی ہے۔ دور حاضر میں بھی اقلیتوں کو سماج کی طرف سے منفی رویوں کا بارہا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ برائی کو برائی نہیں سمجھا جاتا۔ قوانین کا احترام ختم ہو چکا ہے۔ اقلیتیں ہر شعبہ ہائے زندگی میں سماجی منفی رویوں کا شکار ہیں اس حوالے سے "سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں" میں یوں تحریر کیا گیا ہے:

> " تجزیہ بتاتا ہے کہ اصل مسئلہ سماجی رویہ ہے۔ قانون ہوتے ہوئے بھی لوگ قانون ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ سماج پر عام طور پر جذبات کا ہی قانون نافذ ہوتا ہے۔ جو عوامل جذبات پر اثر انداز ہوتے ہیں انھیں کسی قانون کا پابند نہیں بنایا جاسکتا۔ ریاست ایسے امور میں قانون کا نفاذ کرنے سے ہچکچاتی ہے۔ وہ اکثریت کے سامنے بے بس دکھائی دیتی ہے اور عام طور پر معاملات کو دبا دینے کی کوشش کرتی ہے۔۔۔ اس دباؤ کا زیادہ تر شکار اقلیتیں ہوتی ہیں۔ "(۴)

تاریخ گواہ ہے کہ اکثریت سماج ہمیشہ اقلیت سماج پر غالب رہا ہے۔ اکثریت طبقے نے ہمیشہ اقلیت طبقے کے حقوق پر ڈاکا ڈالا ہے۔ اقلیت سماجی منفی رویوں سے بچنے کے لیے ڈر ڈر کر زندگی کی گاڑی کو گھسیٹنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ کیوں کہ سماج کی منفی سوچ کے مطابق ہر جرم انھی سے منسوب ہوتا ہے۔ سماج جبراً بھی اقلیتوں کو مختلف جرائم کا مرتکب ٹھہرا دیتا ہے۔ اقلیتوں کو انصاف کی کوئی توقع نہیں ہوتی کیوں کہ وہ

جانتے ہیں کہ ان کی شنوائی یا دادرسی کہیں نہیں ہوتی۔ اس سارے کرب اور منفی سماجی رویے کو ناول "راکھ" میں یوں پیش کیا گیا ہے۔ ناول سے اقتباس دیکھیں:

"آپ برکت مسیح ہو؟ مشاہد نے پوچھا۔۔۔ بکو یکدم انسان سے قدموں میں لوٹنے والا ایک جانور ہو گیا۔۔۔ آج تک جب بھی اس سے یہ سوال پوچھا گیا کہ کیا تم برکت مسیح ہو تو ہمیشہ اس پر کوئی نہ کوئی مصیبت نازل ہوئی تھی۔۔۔ کسی چوری کے شک میں تھانے میں حاضری۔۔۔ پھر چھتر کُٹ اور مک مکا۔۔۔ یا پھر چوہدریوں کی بیگار۔۔۔ یا پھر محکمہ ایکسائز والے۔۔۔ کہ پرمٹ پر شراب لے کر مسلمانوں کو بیچتے ہو۔۔۔ تو وہ ایسے تمام موقعوں پر قدموں میں لوٹنے والا جانور بن جاتا تھا صرف چاؤں چاؤں نہیں کرتا تھا باقی ہو بہو وہی بن جاتا تھا۔۔۔ نہ بنتا تو اتنے انصاف پسند معاشرے میں زندہ کیسے رہتا ہاں مائی باپ۔۔۔ آہو جی۔۔۔ حکم حضور۔"(۵)

ناول نگار نے بہترین انداز میں اقلیتوں کے ساتھ ہمارے سماج کے منفی رویوں کی عکاسی کی ہے۔ کہ برکت مسیح عرف بکو کو اقلیت ہونے کی بنا پر کبھی چوری کے الزام میں، تو کبھی شراب بیچنے کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا۔ تشدد کا نشانہ بنایا جاتا اور پھر رشوت لے کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ منفی رویہ سماجی ڈھانچے میں یقیناً خطرناک وائرس کی حیثیت رکھتا ہے جو آہستہ آہستہ پھیلتے ہوئے سارے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ یہ منفی سماجی رویہ اقلیتوں کے آزاد فضا میں آزاد زندگی گزارنے کے خواب چھین لیتا ہے۔ پاکستان میں ایسی کوئی بہترین قانون سازی یا حکمت عملی موجود نہیں ہے جو اقلیتوں کو سماجی منفی استحصال سے بچا کر انصاف فراہم کر سکے۔ اس حوالے سے "جنید قیصر" لکھتے ہیں:

"پاکستان میں بسنے والے تمام افراد، بلا امتیاز، رنگ و نسل، مذہب و عقیدہ پاکستانی ہیں اور ان کو تمام بنیادی حقوق حاصل ہیں۔۔۔ مگر جہاں جمہوری اقدار کے بجائے گروہی اور ذاتی مفادات غالب ہوں۔ وہاں ایسے خواب، خواب ہی رہتے ہیں۔"(۶)

اقلیتوں کے ساتھ اس منفی سماجی رویے کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا سماج زوال پذیر ہے۔ ہمارے رویے اقلیت کے ساتھ بغض، عناد اور منافرت کا جذبہ لیے ہوئے ہیں۔

ناروا سلوک

اقلیتوں کے ساتھ ناروا سلوک ایک ایسا موضوع ہے جو اکثر ممالک میں عروج پر ہے۔ جس کا سورج پچھلی کئی دہائیوں سے پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ بل کہ اس کی حدت اور تمازت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ناروا سلوک کی بدولت اقلیتی خوف اور دہشت کی فضا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اقلیتی رہنما ناروا سلوک پر اپنے تحفظات کا اظہار کرتے رہتے ہیں تاہم انھیں مسلسل نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اقلیتوں کے ساتھ ہتک آمیز سلوک کرنا، ان کی عزت نفس مجروح کرنا، تشدد کرنا، متعصبانہ رویہ رکھنا، انھیں ذلیل و رسوا کرنا ایک عام سی بات بن کر رہ گئی ہے۔ دنیا بھر میں اقلیتوں کو تعصب، تشدد، جبر جیسے ناروا سلوک کا سامنا ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے اقلیتوں کے ساتھ ناروا سلوک میں اضافہ ہوا ہے۔ نفرت انگیز مہم کے ذریعے اقلیتوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کیا مسلمان، کیا عیسائی، کیا ہندو سب اقلیتوں کا جینا محال کیا جاتا ہے۔ اقلیتیں شدت پسندوں کے مسلسل نشانے پر رہتی ہیں۔ اقلیتوں کے خلاف چیرہ دستیاں بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ اقلیتوں کے ساتھ ناروا اور امتیازی سلوک میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ حکومتیں بھی اقلیتوں کے ساتھ ناروا سلوک روکنے میں بے بس نظر آتی ہیں۔ اقلیتوں کے ساتھ ناروا سلوک کے متعلق پاکستانی ناول نگاروں نے بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ جیسا کہ ناول "زینہ" میں مارتھا اس ناروا سلوک پر شکوہ کناں دکھائی دیتی ہے کہ عیسائی اقلیت کو محض درجہ چہارم کی ملازمتیں کرنے کی اجازت ہے اور صفائی کرنے والی ملازمتوں کے لیے محض عیسائی ہی مخصوص ہیں۔ اقتباس دیکھیں:

> "میں عیسائی ہوں اور جب بھی صفائی کرنے والوں کی ملازمتوں کا اشتہار آتا ہے تو صرف عیسائیوں کو درخواست دینے کا کہا جاتا ہے جو ایک تعصب ہے اور تمام ضرورت مندوں کے حق پر ڈاکہ ہے۔ جب کہ عیسائیوں کے ساتھ بھی امتیازی سلوک برتا جا رہا ہے۔"(۷)

دنیا کے کم و بیش ہر ملک میں ایسے واقعات ہوتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ جس حسن سلوک کا دعوی کیا جاتا ہے وہ قطعاً درست نہیں۔ اقلیتوں کے ساتھ ناروا سلوک کے رجحانات کو قانونی راستے سے کم کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ حکومتی سطح پر بھی اقلیتوں سے ہمدردی کی جھلک دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن بد قسمتی سے یہ کوشش بہت کم جگہوں پر دکھائی دیتی ہے۔ "سماج، ریاست

اور مذہبی اقلیتیں" میں اس ریاست کو اخلاقی قدروں سے عاری قرار دیا گیا ہے۔ جہاں اقلیتیں ناروا سلوک کا سامنا کرنے پہ مجبور ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

"کسی ریاست کی جمہوری اور انسانی اقدار سے وابستگی کا اندازہ وہاں کی اقلیتوں کے حالات سے کیا جا سکتا ہے۔ جس ریاست میں اقلیتیں خود کو غیر محفوظ سمجھیں وہ سماج یقیناً اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حامل نہیں ہو سکتا۔"(۸)

اقلیتوں کے ساتھ نفرت آمیز سلوک کیا جاتا ہے۔ تاریخ میں اقلیتیں اکثریت کے استحصال اور ظلم و ستم کا شکار رہی ہیں۔ اقلیتوں کے ساتھ نہ صرف ملازمتوں کے حوالے سے ناروا سلوک کیا جاتا ہے بل کہ حکومتی عہدوں پر فائز ہونا ممنوع، کاروبار اور تجارت میں ناروا سلوک اور متعصبانہ رویوں کا بھی ہمیشہ سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب اقلیتیں ناروا سلوک سے تنگ آجاتی ہیں تو اس صورت میں ان کے تعلیم یافتہ اور سرمائے والے افراد تو ملک چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور غریب لوگ یہاں بار بار ناروا سلوک کا شکار ہونے کے لیے رہ جاتے ہیں۔ اکثریت کا مقصد بھی یہی ہے کہ انھیں پس ماندہ رکھا جائے تا کہ وہ ان کے تسلط میں رہیں۔ ناول "نو لکھی کوٹھی" میں بوڑھے انگریز کے ساتھ روا رکھے گئے ناروا سلوک کو دکھایا گیا ہے جو اقلیت ہے اور اکثریت اس سے ناروا سلوک کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ اقتباس دیکھیں:

"کچھ لوگ آرے اور کلہاڑیوں سے پیپل کے ارد گرد گھڑا کھود کر اس کو کاٹنے کے درپے تھے۔ جبکہ ایک بوڑھا انگریز اس گڑھے میں بیٹھا ان کے کام میں رکاوٹ ڈال رہا تھا۔ دو آدمی اسے کھینچ کر باہر نکالنے کی کوشش میں تھے۔۔۔ دوسرے لوگ اس کھینچا تانی کے عمل سے ارد گرد کھڑے محظوظ ہو رہے تھے۔ وہ نہ تو بوڑھے کی طرف داری کر رہے تھے، نہ ان دو آدمیوں کو روک رہے تھے، جو بوڑھے کو بے دردی سے کھینچنے میں لگے تھے اور اسے پنجابی میں سخت سنا بھی رہے تھے۔ لیکن اس نے مضبوطی سے پیپل کی جڑوں کو پکڑا ہوا تھا۔ اور کوشش کے باوجود ان سے باہر نہیں نکل رہا تھا۔ بوڑھے کی رنگت بہت زیادہ سرخ اور سفید تھی، لیکن یہ وہ سرخی نہیں تھی جو خون اور جوان صحت کی نشانی ہوتی ہے۔ بل کہ یہ رنگت نسل اور قوم کا پتہ دینے والی تھی۔۔۔ لوگ اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ ہنس بھی رہے تھے۔۔۔ مجھ

پر اصل حقیقت کا انکشاف ہوا کہ بوڑھا اصل میں انھیں پیپل کاٹنے سے منع کر رہا ہے۔"(۹)

جب ولیم کا گھر اس سے زبردستی چھین لیا اور اسے بڑھاپے میں دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا تو اس کے ذہن میں ایک ہی بات چپک گئی کہ بے گھر ہونا ایک انتہائی تکلیف دہ عمل ہے۔ لہذا جب اس نے دیکھا کہ چند لوگ پیپل کا درخت کاٹ رہے ہیں تو وہ فوراً جا کر اس کی جڑوں سے لپٹ گیا تاکہ وہ درخت نہ کاٹ سکیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ درخت بھی کٹ جانے کے بعد بے گھر ہو جائے گا۔ اور وہ لوگ بجائے اس کے کہ اس کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آتے اس سے کھینچا تانی کر رہے تھے۔ تماشائیوں کی بے حسی تو دیکھیں کہ کیسے سارے واقعے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جیسے وہاں سرکس لگا ہو۔

استحصال زدہ سماج کو تبدیل کرنے اور اقلیتوں کے ساتھ ناروا سلوک کو ختم کرنا چاہیے۔ تاکہ اعتدال پسند سماج وجود میں آسکے جہاں اقلیتوں کے ساتھ بھی بہترین حسن سلوک ہو۔ جہاں ان کے حقوق کا احترام کیا جائے اور انھیں آئینی و قانونی تحفظ حاصل ہو۔ پاکستان میں غیر نمائندہ قوتیں بہت مضبوط ہیں۔ یہ قوتیں اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اقلیتوں کے ساتھ ناروا سلوک کرتی ہیں۔ یہ ناروا سلوک کبھی تو مذہبی انتہا پسندی کی صورت میں ہوتا ہے، تو کبھی عدم رواداری کی صورت میں، کبھی آمرانہ روایات کی صورت میں اور کبھی تنگ نظری کی صورت میں۔ پاکستان میں اقلیتوں سے ناروا سلوک کے متعلق "سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں" میں یوں روشنی ڈالی گئی ہے:

> "پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلا قدم مسائل کی تفہیم ہے۔ دوسرا قدم مسائل کا حل تجویز کرنا ہے۔ تیسرا قدم مجوزہ حل کا نفاذ ہے۔ یہ نفاذ حکومتی سطح پر ہوگا اور سماجی سطح پر بھی۔ اس حوالے سے مختلف سماجی طبقات کی مختلف ذمہ داریاں ہیں۔ سول سوسائٹی اس حوالے سے دو طرح سے بروئے کار آسکتی ہے۔ ایک پریشر گروپ کے طور پر جو حکومت کو ضروری اقدامات پر مجبور کرے۔ دوسری طرف وہ اقلیتوں کے بارے میں عوامی شعور کی تربیت کرے۔"(۱۰)

بہت سے ممالک میں اقلیتوں کے ساتھ محبت کے بجائے حقارت آمیز سلوک کیا جاتا ہے۔ اقلیتوں کو دوسرے درجے کا شہری مانتے ہوئے امتیازی رویہ، امتیازی قوانین اور انتہا پسند نظریات سے دبایا جاتا ہے تاکہ وہ اس ناروا سلوک سے ڈر کر ہمیشہ اکثریت کے ماتحت رہیں۔ نسلی اور لسانی تعصب، سیاسی جبر، امتیازی قوانین ،مادری زبان کے استعمال پر پابندی، حقوق اور آزادیوں کی عدم دستیابی اور ریاستی امور میں جمہوری شراکت کے مواقع کی کمی یہ سب مسائل ناروا سلوک میں ہی آتے ہیں۔ جن کا سامنا اقلیتوں کو کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان میں ولیم کو جس طرح ناروا سلوک کا نشانہ بنایا گیا اس حوالے سے "نو لکھی کوٹھی" میں ولیم کے کردار کے ذریعے ناروا سلوک کی وضاحت کی گئی ہے۔ ولیم کو ہر طرف سے ناانصافی کی ہی توقع ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

> "اس کے بعد کافی دن اسی غور و فکر میں گزار دیے کہ آیا وہ اپنی شہریت کی درخواست پاکستان ایمیگریشن ڈیپارٹمنٹ کو دے یا نہ دے۔ اگر درخواست دینے کے بعد بھی یہی حشر ہوا تو اس کو اس فارم، کوٹھی اور تمام جائیداد سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ ولیم نے سوچا۔ وہ کسی وکیل سے رجوع کرے۔ مگر پھر اس خیال سے کانپ کر رہ گیا کہ یہ وکیل لوگ بھی تو دیسی ہیں۔"(۱۱)

ولیم نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ نو لکھی کوٹھی کے علاوہ اس کا کوئی اور گھر بھی ہے۔ اسے اپنی نو لکھی کوٹھی، اپنے کھیتوں، درختوں اور ان پر اڑتے پرندوں کو دیکھنا اور اس ان کے ساتھ رہنا بہت عزیز تھا۔ لیکن ناروا سلوک، تعصب اور اقلیت ہونے کی وجہ سے جو حالات اس کے ساتھ رونما ہو رہے تھے ان کو دیکھ کر اس نے خاموشی سے زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

آئین میں مذہبی آزادی حتیٰ کہ تبلیغ کی بھی آزادی کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اس ضمن میں بھی اقلیتوں کو ناروا سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مسیحیوں کو چوڑا کہہ کر ناروا سلوک کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اقلیتوں کے ساتھ ناروا سلوک کی شکایات عام ہیں۔ اکثریت اقلیت کے ساتھ ظالمانہ یا ناروا سلوک روا رکھتے ہیں۔ امریکہ جیسی طاقت ور اور اقلیتوں کے ساتھ احسن طرز عمل کا دعوی کرنے والی ریاست میں بھی مسلم اقلیتوں کو ناروا سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ناول" طاؤس فقط رنگ "میں عاقل بیگ کے ساتھ پولیس مجرموں جیسا سلوک کرتی ہے حالاں کہ وہ بے گناہ ہوتا ہے۔

ناول "طاؤس فقط رنگ" سے اقتباس دیکھیں:

"تھوڑی ہی دیر میں ڈیڈ کا فون آ گیا۔ اس وقت ایریزونا میں تھے۔ وہاں کی پولیس نے انھیں تھانے بلایا تھا۔ وہ چیخے یہ سب کیا بکواس ہے۔ مجھے کامن کریمنل کی طرح فنگر پرنٹ دینے پڑے ہیں۔ میرے مگ شاٹ (Mug shot) لیے گئے ہیں۔ مراد باپ کا غصہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس کا دل پتے کی طرح کانپنے لگا۔"(۱۲)

مغرب میں مسلمان امریکی اقلیت سے دشمنی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ امریکی مسلمان اقلیت کو تنگ نظر، اور عدم برداشت کا طعنہ دیتے ہیں جب کہ وہ خود تشدد پسند، برداشت سے عاری اور بدترین سلوک کرنے والے ہیں۔ امریکہ میں مسلم اقلیت کے ساتھ ناروا سلوک ہو رہا ہے وہ یقیناً کسی سے پوشیدہ نہیں۔ محمد اور احمد ناموں کے حامل مسلمانوں پر ویزا اور ملازمت کی پابندی لگانا، نئے نئے سخت امیگریشن قوانین بنانا، سکینگ کے ذریعے مسلمان خواتین اور مردوں کی تلاشی لینا یہ سب ناروا سلوک کے زمرے میں ہی آتا ہے۔ "آزادی اظہار کے نام پر" میں مغرب کے اقلیتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے ناروا سلوک کے متعلق لکھا ہے:

"مغرب کو یہ زعم ہے کہ وہ انتہائی تہذیب یافتہ اور رواداری کا عالمی چیمپین ہے۔ ان دوغلے اور دوہرے معیار اور سلوک کی نہ جانے کتنی مثالیں ہیں جو ان ملکوں میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ جو انسانی آزادی، انسانی حقوق اور آزادی اظہار کے علمبردار کہلاتے ہی نہیں دعویدار بھی بنتے ہیں۔"(۱۳)

دراصل مغرب فکری، سماجی اور تمدنی سطح پر اسلام سے شکست کھا چکا ہے۔ اپنی اس ناکامی کو چھپانے کے لیے وہ مسلم اقلیت کو ناروا سلوک کا نشانہ بناتا ہے۔ یہ مغرب میں موجود مسلمان اقلیت کے لیے لمحہ فکریہ ہے اگر انھوں نے اس ناروا سلوک کے خلاف آواز بلند نہیں کی تو ان کا مغرب میں تحفظ و احترام باقی نہیں رہے گا۔

سماج کا خوف

خوف ایک ایسی ذہنی کیفیت ہے جو کسی نقصان یا خطرے کے پیش نظر رد عمل کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال میں عدم تحفظ کا گماں ہوتا ہے۔ انسان خود کو محفوظ رکھنے کی فکر کرتا ہے۔ خوف کا عنصر انسانی زندگی کے ساتھ ہمیشہ سے موجود ہے۔ سماج کا خوف اقلیتوں کی اخلاقی، سماجی اور ثقافتی اقدار کی پامالی کا سبب بن رہا ہے۔ جو انسانیت کے خلاف اور تہذیب و شائستگی کے بھی برعکس ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اکثریت تعصب، ضد اور دل دکھانے والے رویوں کو چھوڑ کر ان بری عادتوں کا ترک کرنے پر مائل ہوں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اس دنیا کی ساری رونقیں اور چہل پہل بے خوف اور مثبت رویوں ہی کے دم سے ہے۔ اور انسانی سماج کی بنیاد مثبت رویوں ہی کی بنیاد پر قائم ہے۔ اگر خوشی، غم، محبت، اور ہمدردی وغیرہ جیسے جذبات اس دنیا سے ناپید ہو جائیں تو یہاں پر ایک سناٹا چھا جائے۔ نہ گلاب کے پھولوں سے فرحت حاصل ہو اور نہ کانٹوں سے وحشت۔ نہ کسی سے ملنے کا اشتیاق ہو اور نہ کسی سے بچھڑنے کا غم۔ ہر طرف ایک بے تعلقی کا عالم پیدا ہو جائے۔ مادہ پرستی نے ہم پر اس قدر غلبہ پالیا ہے کہ لوگوں میں خلوص کے بجائے ذاتی مفاد، لالچ اور بے خوف انداز مقدم ہو کر رہ گئے ہیں۔ اقلیتوں کو سماج کی طرف سے کئی وجوہات کی بنا پر خوف کا سامنا رہتا ہے۔ جہاں اکثریت بھی سماجی خوف میں مبتلا ہے وہاں اقلیت کو درپیش سماج کا خوف کوئی انہونی بات نہیں۔ ناول "راکھ" میں مسیحی اقلیت برکت مسیح سماج کے خوف سے داماد کے گھر قدم نہیں رکھتا۔ اقتباس دیکھیں:

> "سات کمروں والی کوٹھی کے ڈھیلی چولوں والے پھاٹک کے سائے میں وہ بہت دیر سے اونگھ رہا تھا جب اس کے پوتے نے اسے جھنجھوڑ کر کہا دادا اٹھ صاحب آ گیا ہے۔
>
> تم یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہو۔۔۔ اندر کیوں نہیں گئے۔۔۔ مشاہد جیپ سے اترا اور برکت مسیح کے کندھے پر تھپکی دے کر پیار سے بولا تمہاری بیٹی کا گھر ہے۔"[۱۴]

برکت مسیح اپنی ہی بیٹی کے گھر جانے سے بھی اس لیے ہچکچا رہا تھا کہ وہ مسلمان گھرانے میں رہتی تھی اور وہ خود ایک عیسائی طبقے سے تعلق رکھنے والا۔ اسے یہ خوف لاحق تھا کہ اندر جانے سے کہیں کوئی برا مناتے ہوئے اسے دھتکار نہ دے۔ اس خوف کو دل میں لیے وہ گیٹ کے پاس بیٹھ کر اپنے داماد کے گھر آنے کا انتظار کرنے لگا۔

اقلیتوں کو تو بالخصوص سماج کی طرف سے ہمیشہ خوف کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ جیسا کہ ناول "زینہ" میں ہادیہ اقلیت ہونے کی بنا پر سماج کی جانب سے خوف زدہ ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

"میں خوفزدہ بھی ہوں۔ میرا تعلق اقلیت سے ہے اور اقلیت کو کوئی سہارا نہیں دے سکتا۔ مجھے اس کی آواز میں ارادے کے ساتھ خوف بھی محسوس ہوا۔"(۱۵)

سماجی ناہمواری نے انسانی زندگی مشکل بنا دی ہے۔ غیر یقینی صورت حال میں ہر طبقہ خوف میں مبتلا ہے۔ سماج سے خوف زدہ اقلیتیں تنہائی اور خاموشی کا شکار ہو جاتی ہیں اور یہ بات سماجی روابط میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہے۔ جیسا کہ ناول "زینہ" میں عیسائی اقلیت کو سماج کے خوف میں مبتلا دکھایا گیا ہے۔ اقلیتوں کے ماضی کے قصے بھی انھیں سکھ سے جینے نہیں دیتے کیوں کہ انھیں سماج کی طرف سے دباؤ اور خوف کا سامنا رہتا ہے۔ ناول "زینہ" سے اقتباس دیکھیں:

" وہ کرسچن ہے۔۔۔ اس کا باپ کسی وقت غلط قسم کے کام کیا کرتا تھا۔ شہر میں کافی شور رہا تھا۔ خان زادہ نے بھی اس کی مدد کی تھی۔ اب وہ گھر میں بند رہتا ہے اور لوگ اس کے کردار کے بارے میں بھول چکے ہیں۔ انھوں نے دھمکی دی کہا اگر وہ تعاون نہیں کرے گی تو وہ اس پرانے قصے کو از سر نو تازہ کر دیں گے۔ اب یہ پریشان کن صورت حال ہے۔ وہ خاصی پریشان ہے۔"(۱۶)

ہادیہ ایک جگہ ملازمت کرتی تھی۔ اس کے باس کے دوست کے بارے میں کچھ لوگ معلومات حاصل کرنا چاہ رہے تھے اور ہادیہ کے گھر جا کر اسے ڈرا دھمکا رہے تھے۔ کہ اگر اس نے صحیح معلومات نہ دیں تو اس کے باپ کے پرانے رنگین قسم کے قصے اچھالنا شروع کر دیں گے۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر ہادیہ ایک عجیب سے خوف میں مبتلا تھی۔ سماج کا خوف اقلیتوں کے لیے ایک ایسی کیفیت ہے جو انھیں نفسیاتی طور پر کمزور بنا دیتا ہے۔ جدید سماج میں بہت سی پیچیدگیاں ہیں جن سے سماج بھی مشکل کا شکار ہے۔ گھٹن زدہ ماحول اور نفسا نفسی نے فرد کو الجھا کے رکھ دیا ہے۔ اس صورت حال میں اقلیتیں بھی خوف و ہراس میں مبتلا ہیں۔ مغربی ممالک میں بسنے والی مسلم اقلیتیں سماج کے خوف سے اپنے بچوں کو پاکستانی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے دیکھنا چاہتی ہیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہو پاتا۔

ناول "طاؤس فقط رنگ" سے اقتباس دیکھیں:

"مراد بالکل اپنے باپ جیسی دلچسپیاں رکھتا تھا۔ اس پر ماں کی کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ باپ کی طرح امریکن سپورٹس دیکھتا ہے۔ امریکن کلچر کو پسند کرتا ہے۔ سجیلہ نے بچپن ہی سے کوشش کی کہ وہ پاکستانی بچہ بن جائے۔ نور جہاں، مہدی حسن، لتا کے گانے سنے، کرکٹ کا شیدائی ہو، شادیوں پر شلوار قمیض پہن کر بھنگڑے ڈالے، صوفیانہ کلام کا رسیا ہو، مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ وہ اسے ان سب چیزوں کی طرف کبھی مائل نہ کر سکی۔ جب زیادہ زور دیتی تو اس کا شوہر اپنی بیوی کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہتا تم پڑھی لکھی ہونے کے باوجود کیوں بچوں کو پینڈو عورتوں کی طرح بیک ورڈ بنانا چاہتی ہو۔ یہ امریکن بچے ہیں۔ انھیں اپنے ڈھنگ اور مرضی سے زندگی گزارنے کا پورا حق ہے۔ انھیں آزاد ہو کر جینا سیکھنے دو۔ ہم دیسی لوگوں کا یہی المیہ ہے کہ بچوں کو اپنی ملکیت سمجھ لیتے ہیں اور ان پر اپنی پسند اور ترجیحات ٹھونس دیتے ہیں۔ ہم اپنے بچوں کے ذریعے اپنی زندگی کی نا آسودگیوں کو پورا کرنے کا خواب دیکھتے ہیں۔ وہی گھسی پٹی، بوسیدہ آئیڈیالوجی کو لیے پھرتے ہیں۔ انھیں تنہا چھوڑ دو۔۔۔ یہ امریکن ہیں۔ انھیں امریکن رہنے دو۔ لاہوریئے نہ بناؤ۔

شوہر کے اور اس کے وسیع خیالات کا پاٹ کبھی عبور نہ ہوا اور دونوں الگ الگ دنیاؤں میں سمٹتے ایک دوسرے سے مختلف اور متنفر ہوتے چلے گئے۔۔۔ اکٹھے رہنا عذاب ہو گیا۔"[۱۷]

امریکہ چلے جانے کے بعد بھی سجیلہ نے اپنے بچوں کی اچھی تربیت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن ہمیشہ اس کا شوہر اس کی راہ میں حائل ہو جاتا اور اسے طعنے تشنے دینے لگتا کہ وہ امریکہ آ کر بھی پرانے اور فرسودہ خیالات کی مالک ہے۔ اور بچوں کی تربیت میں خلل ڈال رہی ہے۔ سجیلہ کے شوہر نے بچوں کو آزاد چھوڑ دیا تاکہ وہ اپنی مرضی سے اپنی راہ اور زندگی کا انتخاب کریں۔ اور پھر وہ امریکی تہذیب و ثقافت کے رنگ میں رنگتے چلے گئے اور اپنی اپنی دنیا بسا لی۔ موجودہ دور میں اقلیتیں سماج کے خوف میں اس قدر گھری ہوئی ہیں کہ لاکھ کوششوں کے باوجود اس سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو پاتیں۔ سماج کا خوف اقلیتوں کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ خوف سے فرار قطعاً ممکن نہیں۔ عام مشاہدے کے ساتھ یہ نفسیاتی حقیقت بھی ہے کہ لوگ کیا کہیں

گے۔ اس فقرے کے پیچھے بھی سماج کا خوف پوشیدہ ہے۔ جیسا کہ ناول "کہر" میں عیسائی اقلیت کو سماج کا خوف لاحق ہوتا ہے کہ ان کی شادی پر انھیں تضحیک کا نشانہ بنایا جائے گا۔ کیوں کہ ان کے سٹیٹس میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اقتباس دیکھیں:

> " آپ کہتے ہیں کہ مجھے راہ چلتے دیکھ کر لوگ سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں۔ آپ جب ساتھ ہوں تو سرگوشیاں کرتے ہوں گے میں اکیلی گزرتی ہوں تو جملے کستے ہیں۔ ہر بات سمجھتی ہوں۔ دنیا بھر نے جو سنسنی خیز انجام کی توقع قائم کر رکھی ہے کہ ایک رئیس زادے نے معمولی گھرانے کی عیسائی لڑکی سے شادی کر لی۔۔۔ مجھے خوف ہے کہ میاں بیوی کی حیثیت سے ہماری نہیں نبھے گی۔"[۱۸]

مارگریٹ کا باپ پاکھڑا پہلوان اسے کہتا ہے کہ جب وہ گھر سے باہر قدم رکھتا ہے تو ارد گرد کے لوگ اسے عجیب نظروں سے گھورتے ہیں۔ اور دبی دبی سرگوشیاں کرتے ہیں۔ مارگریٹ نے بھی بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ میں بھی جب گھر سے باہر نکلتی ہوں تو لوگ مجھ پر جملے کستے ہیں۔ سب کو لگتا ہے کہ میں نے دولت کے حصول کے لیے ایک امیر نوجوان ذوالقرنین کو اپنی محبت کی جال میں پھنسایا ہوا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم نے شادی کر بھی لی تو وہ کامیاب نہیں ہو سکے گی کیوں کہ مذہب کے علاوہ بھی ہمارے درمیان زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اور مجھے خوف ہے کہ لوگوں کی کڑوی باتیں اور رویے یہ شادی کبھی کامیاب نہیں ہونے دیں گی۔ سماج کا خوف اقلیتوں کی داخلی و خارجی زندگی پر اس قدر اثر انداز ہوا کہ وہ اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ سماج کے خوف نے اقلیتوں کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر تنہا کر دیا ہے۔ انسان اپنی خواہشات کے لیے تگ و دو کرتا ہے لیکن جب سماج رکاوٹیں کھڑی کر دے تو وہ خود کو تنہا کر لیتا ہے۔ اقلیتیں بھی ہمیشہ سماج کی طرف سے اس خوف کا شکار رہتی ہیں کہ ان کے کسی بھی طرز عمل پر انھیں سماج کی جانب سے طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا جائے گا۔ ان کی کسی بھی جائز خواہش پر بھی انھیں تنقید سہنی پڑے گی۔ انھیں سماج کا خوف لاحق رہتا ہے جس کی بدولت انھیں زندگی میں بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

حب الوطنی کی سزا

حب وطن سے مراد ہے وطن کی محبت۔ انسان جس جگہ پیدا ہوتا ہے اور زندگی کی منازل طے کرتے ہوئے بچپن اور جوانی گزارتا ہے اس جگہ سے اسے بے حد لگاؤ ہوتا ہے۔ اسی سرزمین پر اس کے دیگر عزیز واقارب اور دوست احباب ہوتے ہیں جن کے سنگ رہ کر وہ زندگی کا لطف اٹھاتا ہے۔ اپنی خوشیوں میں انھیں شریک کرتا ہے اور ان کے درد بانٹتا ہے۔ وطن سے محبت کا جذبہ کوئی مصنوعی چیز نہیں بل کہ ایک فطری چیز ہے جو پیدا نہیں کی جاتی بل کہ خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ انسان دنیا میں جہاں مرضی گھوم لے جو سکون اور آرام اسے وطن میں نصیب ہوتا ہے وہ کہیں اور میسر نہیں آ سکتا۔ عربی کا مشہور قول ہے کہ "حب الوطن من الایمان" یعنی وطن کی محبت ایمان کا جزو ہے۔ جو لوگ اپنے وطن سے محبت نہیں رکھتے انھیں وطن میں ٹھہرنے کا حق بھی نہیں ہونا چاہیے اور جو لوگ وطن سے بے وفائی کرتے ہیں انھیں غدار وطن کہا جاتا ہے۔ وطن دراصل صرف زمین کے ایک ٹکڑے یا کچی پکی اینٹوں سے تعمیر شدہ مکانات کے ڈھانچوں، کھیتوں سے گزرتے رستوں اور چمکتی دمکتی گاڑیوں کی قطاروں کا نام نہیں بل کہ وطن سے مراد وہ رشتے ہیں جو احساسات کے سانچے میں ڈھل کر دیگر لوگوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو ہمارے دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں اور جو ہمارے مزاج کو سمجھتے ہیں۔ وہ شفیق مسکراہٹیں وطن سے منسوب ہوتی ہیں جو ماں کے پر نور چہرے سے نکلتی ہیں اور اس طرح وہ مٹی پاک مٹی اور وہ وطن پیارا وطن بن جاتا ہے۔ جہاں سب اپنے بستے ہیں، اپنے بھائی، بہن، اپنے عزیز اور دکھ سکھ کے ساجھے دار۔ یہی وطن ہے مگر اس کے پیچھے ان رشتوں اور وہاں کی مٹی کے درمیان بھی ایک نظریاتی تعلق ہوتا ہے۔ وطن سے محبت کا جذبہ انسان کی سرشت میں ہے اور یہ فطری جذبہ ہے۔ یہ جذبہ انسان کے دل میں بے پناہ جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو اپنے ہم وطنوں کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

وطن سے محبت کی مثال ہمیں ناول "راکھ" میں ملتی ہے۔ بندو کو اپنے وطن سے شدید محبت تھی۔ وہ ہندو مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ فسادات کے نتیجے میں لوگوں نے اس کے گھر کو ملیامیٹ کر دیا۔ صرف گھر کا دروازہ باقی بچا وہ اس دروازے کے باہر چارپائی پر بیٹھا رہتا۔

اسے حب الوطنی کی یہ سزا ملی کہ اپنے گھر بار سے ہاتھ دھونا پڑے لیکن وطن سے محبت کے جذبے کو کوئی بھی مشکل کم نہ کر سکی۔ناول" راکھ "سے اقتباس ملاحظہ کریں۔:

" بندو رام اسی گلی میں ایک ٹوٹی کھٹارا چارپائی پر بیٹھا حقہ پیتا رہتا تھا۔صرف ایک دھوتی میں ملبوس۔۔۔اور بندو رام تم تو ہندو ہو تو پھر ہندوستان کیوں نہیں جاتے۔۔۔ اور وہ اپنے تمباکو کی زردی والے دانتوں کے ساتھ ہنسنے لگتا۔۔۔اوئے یہ میرے گھر کا دروازہ ہے میں تو اس کے اندر بھی نہیں جا سکتا ہندوستان کیسے جاؤں۔۔۔ذرا دھکیل کر دیکھو۔۔۔شاباشے۔"(۱۹)

وہ لوگ جنھیں اپنے وطن سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ ہوتا ہے وہ اپنے وطن میں روکھی سوکھی کھا کر گزارا کر لیتے ہیں مگر وطن کو چھوڑ کر نہیں جاتے۔یہی وہ جذبہ ہے جو اپنے ہم وطنوں کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتا اور اپنے وطن کی حفاظت و بقا کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ایسے ہی لوگوں کا نام تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جاتا ہے۔اور یہی سچے محب وطن ہوتے ہیں۔جو اپنے ملک کی سربلندی کے ضامن ہوتے ہیں۔اور اپنے وطن کے لیے باعث فخر ہوتے ہیں۔بندو بھی وطن سے محبت کے نتیجے میں اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔لیکن اپنے وطن سے ہجرت اور جدائی کو قبول نہیں کرتا۔"راکھ "سے ایک اور اقتباس دیکھیے:

" اور کوئی بچہ آگے بڑھ کر دروازے کو دھکیلتا تو کہیں سے کوئی اینٹ نیچے آجاتی اور وہ پیچھے ہٹ جاتا۔

اس کے پیچھے کچھ نہیں ہے۔۔۔بندو خوش ہو کر کہتا۔۔۔پر میں نے راکھی تو کرنی ہے نا اپنے گھر کی۔

پورے لاہور میں شاید وہ اکیلا ہندو تھا جو اس گلی میں چارپائی پر بیٹھا حقہ پیتا تھا۔۔۔باقی سب جا چکے تھے۔"(۲۰)

بندو رام کو حب الوطنی کی سزا موت کی صورت میں ملتی ہے۔ناول "راکھ "سے ہی ایک اور اقتباس دیکھیں:" بندو رام سبزی کی چھری اپنی پشت پر سجائے بے جان جھکا ہوا تھا ۔"(۲۱)

بندو کا گھر فساد میں لوگوں نے جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ مگر وہ پھر بھی وطن عزیز کی محبت میں اپنے جلے ہوئے گھر کی راکھ کو چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں ہوا تھا۔ وہ دروازے کے باہر چارپائی پر بیٹھا رہتا اور اس اجڑے ہوئے راکھ کے ڈھیر کو دیکھ کر اسے ایک پر سکون سا احساس ہوتا۔ ناول نگار کے نزدیک پورے لاہور میں صرف بندو رام نے ہجرت نہیں کی تھی لیکن بدلے میں اسے بھی شر پسند عناصر نے بابری مسجد کی شہادت کا بدلہ لینے کے لیے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ حب الوطنی کے نتیجے میں اسے قتل کے تحفے سے نوازا گیا۔ وطن سے محبت انسان کے دل سے کبھی ختم نہیں ہوتی وہ جہاں بھی چلا جائے اس کو اپنے وطن کی یاد ستاتی ہے۔ وطن کے ساتھ محبت کا احساس اس کی روح میں بسا ہوتا ہے۔ جس دل میں وطن سے محبت کا جذبہ عنقا ہو وہ دل بے حس اور مردہ ہے۔ "جنید قیصر" اقلیتوں کی حب الوطنی کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

> "پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کی وفاداری اور حب الوطنی کو ہمیشہ شک و شبہات کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ انھیں کافر، غدار اور غیر ملکی ایجنٹ اور نمائندے سمجھا جاتا رہا ہے ان کے لیے ہر شعبے میں بیگانگی اور لاتعلقی موجود رہی ہے۔"(۲۲)

انسان تو انسان حیوان بھی جس سرزمین پر پیدا ہوتا ہے اس سے پیار و محبت اس کی فطرت میں شامل ہے۔ اللہ کی پیدا کردہ تمام مخلوقات جن میں چرند پرند سب اپنے مسکن یعنی وطن سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ وطن سے محبت کی سزا کی مثال ناول "طاؤس فقط رنگ" میں بھی موجود ہے۔ پاکستانی اقلیت کو ان مسائل کا سامنا نائن الیون کے واقعات کے بعد کرنا پڑا۔ اس واقعے کے نتیجے میں پاکستانی اقلیت کو امریکہ میں شدید ذہنی کرب سے گزرنا پڑا۔ انھیں دہشت گرد کے طعنے سننے پڑے۔ نوکریوں سے بے دخل ہونا پڑا۔ نیز نفرت سے بھرپور رویوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ پاکستانی مسلم اقلیت کو نسلی امتیازات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ انھیں بہت سے ایسے جرائم کی سزا بھی کاٹنی پڑی جو انھوں نے کبھی کیے ہی نہیں تھے۔ ان کا سب سے بڑا جرم ان کا محب وطن ہونا تھا۔ وطن سے محبت کا انداز درج ذیل اقتباس "طاؤس فقط رنگ" میں ملاحظہ کریں:

> "اوکے تو پھر آپ لوگ امریکہ آئے ہی کیوں تھے؟ یہ سُپر ایمپائر ہے اور بڑی بادشاہتیں تو ایسے ہی کرتی ہیں۔ آپ نے ہمیں یہاں پیدا کیا ہے۔ اب یہ ہمارا ملک

ہے۔ ہم اس سے پیار نہ کریں تو کس ملک سے کریں۔ آخر ہم کہاں جائیں۔ اس سے وفا اور محبت کرنا ہماری مجبوری ہے۔

I love America میر امرنا جینا یہی ہے۔ امریکہ میری ماں ہے جیسے آپ، اور میں دونوں سے بے حد محبت کرتا ہوں۔"(۲۳)

ناول کا مرکزی کردار مراد امریکہ سے بے پناہ محبت کا اظہار اسے ماں کی مانند قرار دے کر کرتا ہے۔ بلاشبہ اپنے وطن سے محبت ماں سے محبت جیسے ہی ہوتی ہے۔ حب الوطنی کے جذبے کے تحت ہم اپنے ملک کو دوسرے ممالک پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی جبلت ہے جو ہمارے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ یہ ایک اعلیٰ و برتر احساس ہے۔ ہر انسان حب الوطنی کا جذبہ ضرور رکھتا ہے۔ امریکہ جیسے مہذب سماج میں مراد اور اس کے خاندان کو مسلم اقلیت اور محب وطن ہونے کی سزا کاٹنی پڑتی ہے۔ امریکہ کا اصل چہرہ محمد متین خالد "آزادی اظہار کے نام پر" میں ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:

" مسلم اقلیت پوری امریکی قوم کا ہدف نظر آتی ہے۔ نہ صرف امریکہ میں مسلمانوں کی جان و مال کے لیے خطرات بڑھ رہے ہیں، بلکہ امریکہ میں ان کے لیے پر سکون رہائش بھی محال ہوتی نظر آتی ہے۔ یوں تو امریکہ ہر مذہب و ملت اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ حتی کہ امریکی فوج میں سکھ فوجیوں کے لیے سکھوں کی مخصوص پگڑی کو بھی قبول کر لیا گیا ہے، مگر مسلمانوں کی منفرد تہذیب و ثقافت ان کے لیے تاحال قابل قبول نہیں ہو سکی ہے۔(۲۴)

حب الوطنی قومی اتحاد اور سالمیت کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ یہ وطن سے محبت کا احساس ہی ہوتا ہے جو ہمیں اس بات پر ابھارتا ہے کہ ہم اپنے وطن کی ترقی و خوش حالی کے لیے کام کریں۔ یہ وطن کی محبت ہی ہے جو ہماری زندگی میں وطن کے فائدے کو اپنے ذاتی مفاد پر ترجیح دینے کے لیے ایک طاقت ور جذبے کو بیدار کرتی ہے۔

اگر کسی ملک کے عوام محب وطن ہیں تو وہ آپس میں اتحاد سے رہنا پسند کرتے ہیں۔ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اتحاد ان کے وطن کی بہتری کے لیے ہے اور انھیں اس بہتری کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ کسی بھی ملک کی مختلف اکائیوں سے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ایسے کسی نظریے کو قبول نہیں کرتے۔ وہ اپنے

ملک کی سالمیت یا قومیت کے خلاف کسی بھی غیر ملکی پروپیگنڈے سے کسی طور پر متاثر نہیں ہوتے۔ درحقیقت حب الوطنی ایک عظیم طاقت ہے جو کہ عوام کو آپس میں قوم کے طور پر متحد رکھتی ہے۔ سماج میں ایسے سنگ دل لوگ بھی موجود ہیں جو دوسری اقلیتوں کے جذبہ حب الوطنی کو کسی صورت قبول نہیں کرتے۔ ایسی ہی صورت حال کا سامنا ناول "طاؤس فقط رنگ" میں مراد کو بھی کرنا پڑتا ہے۔ مسلم اقلیت ہونے کی بنا پر وطن کے لیے دی گئی ان کی قربانیوں یا ان کی جہد مسلسل کی گوروں کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

> "اس کا آل امریکن بوائے ہونے کا خواب کس بری طرح ٹوٹا تھا۔ ایک نئی حقیقت اس پر آشکار ہوئی تھی کہ وہ گورا نہیں تھا، لہذا اس کو گوروں جیسی ترجیحات نہیں مل سکتی تھیں۔ مگر اب وہ اس مقام پر تھا کہ کسی بھی نئی دنیا میں جا کر بس نہیں سکتا تھا۔ اس کا جینا مرنا امریکہ میں ہی تھا۔"(۲۵)

مراد کا ذہن کئی خانوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ہر وقت برے خیالات امڈتے رہتے۔ کیوں کہ امریکہ کا ایسا سیاہ روپ اس نے کبھی تصور ہی نہیں کیا تھا۔ مگر اب وہ ایک عجیب سی احساس کمتری میں گرفتار ہوتا جا رہا تھا۔ سفید رنگ نہ ہونے کی احساس کمتری۔ اس طرح کے واقعات کے بعد اس کا دل امریکہ سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ کیوں کہ اس نے کبھی خواب میں بھی امریکہ کی اس طرح کی جارحیت کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ مراد کے ساتھ ساتھ اس کا سارا خاندان خوف زدہ تھا نہ جانے اس کے بعد ان سے کیا سلوک روا رکھا جائے گا۔ پورے خاندان کو ہر وقت ایک عجیب سا دھڑکا سا لگا رہتا۔ ساری زندگی امریکہ میں گزارنے کے بعد مراد کسی دوسری جگہ رہائش کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مسلم اقلیت کے ساتھ اس جارحانہ رویے پر "آزادی اظہار کے نام پر " کے مطابق:

> "مسلمان امریکہ کی سب سے بڑی اقلیت ہیں اور اوپر سے نیچے تک امریکی معشیت میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہ مسلم اقلیت کسی بھی طرح امریکہ پر بوجھ نہیں ہے۔ بلکہ امریکہ کو کما کر دے رہی ہے۔ پھر دوسری اقلیتوں کے مقابلے میں سب سے بڑی

> امریکی اقلیت کے ساتھ یہ امتیازی رویہ کیوں ہے۔ یہ محض امریکہ کی تنگ نظری اور تعصب کے سبب ہے۔"(۲۶)

حب الوطنی ایک محرک بھی ہے۔ جذبہ حب الوطنی اپنے ملک و قوم کے لیے محنت پر اکساتا ہے۔ یہ محب وطن لوگوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک کی ترقی کے لیے مل جل کر کام کریں۔ ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں لگن سے کام کریں تو ان کا قومی فرض ادا ہوتا ہے۔ وہ کیسے الگ ہو سکتا ہے اس ملک سے جہاں وہ اپنے والدین، دوست احباب کے ساتھ رہائش پذیر رہا ہو۔ وہ کیسے چھوڑ سکتا ہے اس وطن کو، اس جگہ کو جہاں اس کے اجداد دفن ہوں۔ اور جنھیں وطن سے زبردستی بے دخل کیے جانے کی کوشش کی جائے تو وہ جس ذہنی کرب اور اذیت سے گزرتے ہیں اس کا اندازہ لگانا یقیناً مشکل ہے۔ ایسے ہی صورت حال ناول "نولکھی کوٹھی" کے مرکزی کردار ولیم کے ساتھ پیش آتی ہے۔ جسے اس کے وطن سے زبردستی جلاوطن کیے جانے کے احکامات ملتے ہیں۔ جو اس کے لیے بے پناہ تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔ کیوں کہ وہ وطن کی مٹی میں اپنی روح کو محسوس کرتا ہے۔ ناول "نولکھی کوٹھی" سے اقتباس ملاحظہ کریں:

> "میرے پردادا، میرا دادا اور میرا باپ بڑے خوش قسمت تھے۔۔۔ نہ انھیں وقت نے دھوکہ دیا نہ انھوں نے وہ کرب محسوس کیا جو میرے حصے میں آیا ہے۔ وہ سب اسی ہندوستان کی مٹی میں اپنی مرضی سے رہے، اپنی مرضی سے یہیں دفن ہوئے۔ لیکن میں، جسے ان سب سے زیادہ ہندوستان سے محبت ہے۔ ان سب سے زیادہ میں اس مٹی میں اپنی روح محسوس کرتا ہوں اور ان سب سے زیادہ میری خواہش اس سرزمین پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کی ہے، میرے ہی ہاتھ سے وقت سرکتا جا رہا ہے۔ اس زمین کی مٹی میرے رنگ اور نسل کو اپنے سے علیحدہ کر کے مجھے باہر پھینکنے کی کوشش میں ہے۔ مجھے آئے دن ایسے احکامات وصول ہوتے ہیں۔"(۲۷)

ولیم کو اس مٹی سے، اس علاقے سے حد سے زیادہ محبت تھی۔ لیکن یہاں رہنے کے فیصلے سے اسے ایسے نقصان سے دوچار ہونا تھا جس کی تلافی ممکن نہیں تھی۔ لیکن ولیم تمام نقصان جانتے بوجھتے برداشت کرنے کو تیار تھا۔ مگر یہاں سے جانے کا خیال اس کے دل و دماغ میں بھولے سے بھی نہیں آ رہا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ بات بھی بیٹھ گئی تھی کہ اس کے دادا، پردادا اور ماں باپ بھی اسی سرزمین میں منوں مٹی تلے دفن ہیں۔ تو وہ کیوں اس

سر زمین کو الوداع کہے اس کے دل و دماغ پر ایک ہی سوچ سوار تھی کہ چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے وہ نو لکھی کوٹھی کو چھوڑ کر کبھی برطانیہ نہیں جائے گا۔ ولیم کو ہر لمحہ یہ احساس ہوتا تھا جیسے اس سر زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ لہذا وہ کبھی اس سے جدا نہیں ہو گا۔ لیکن اس کے خیال اور اس کے یہاں رہنے کی سوچ نے اسے تمام رشتوں سے محروم کر دیا اور وہ یہاں کی محبت کے عالم میں سب کچھ سہہ گیا۔ اس کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا" جنید قیصر "جبری جلاوطنی اور اقلیتوں کی آزادی سلب کرنے پر یوں رائے قائم کرتے ہیں:

"اقلیتیں ایک معاشرے میں شامل ہوتے ہوئے اپنی علیحدہ مذہبی، ثقافتی، لسانی اور دیگر علاقائی نسلی پہچان بھی رکھتی ہیں۔ آزادی کا مطلب تنوع ہے۔ جبر کے ذریعے دنیا بھر میں یکسانیت قائم کرنے کی تمام کوششیں بری طرح ناکام ہوئی ہیں۔ اقلیتوں کے حقوق ان تمام لوگوں کے نزدیک اہم ہیں جو انسانی آزادیوں کی قدر کرتے ہیں۔"[۲۸]

جن لوگوں میں وطن پر مر مٹنے یا جان نچھاور کرنے کا جذبہ موجود ہو ان کے انگ انگ میں وطن کی محبت رچی بسی ہوتی ہے۔ انھیں جتنی تکلیفیں اور اذیتیں سہنی پڑیں، ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے جائیں، انھیں جتنی ہول ناک اور سخت سزائیں دی جائیں، اتنی ہی وطن کی محبت ان کے دلوں میں پختہ ہوتی جاتی ہے۔ انھیں اپنے خطے کے باغات، کھیت، نہریں وہاں کے لوگوں سے محبت و عقیدت کے جذبے کو کسی قیمت پر مٹایا نہیں جا سکتا۔ ناول" نو لکھی کوٹھی" ہی میں ولیم کو بھی اپنے وطن اور وطن سے وابستہ ہر چیز سے بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ وہ اپنے وطن، اپنے علاقے کو چھوڑ کر جانے کے لیے کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ کوئی بھی چیز اس کے قلب سے وطن کی محبت جدا نہیں کر سکتی۔ حب الوطنی کی سزا انتہائی کسمپرسی کی حالت میں اس کی موت کی صورت میں ہوتی ہے۔ وطن سے محبت و عقیدت سے لبریز اقتباس "نو لکھی کوٹھی" سے ملاحظہ کریں:

"یہ جگہ، یہ خطہ، یہ نو لکھی کوٹھی، یہ نہریں، یہ باغات اور نہروں کی کچی پکی روشیں۔ کھیتوں میں اگتے ہوئے آلو، مکئی، گندم، گنا اور برسن کے ٹھنڈے ٹھنڈے لمس، ان باغات اور نہروں کے مضاف میں رہنے والے لوگ، ان کے معصوم سادہ اور عزت و آبرو بخشنے والے چہرے، یہ سب میری زندگی ہے۔ میں نے تمھیں پہلے کہا ہے، مجھے نہ کسی اور زمین سے غرض ہے، نہ میں نے میں نے کبھی دہلی، لکھنؤ یا کلکتہ کو پسند کیا۔ حتیٰ

کہ آگرے کا تاج محل اس نو لکھی کو ٹھی کے عوض حقارت سے ٹکرادوں۔۔۔ کبھی میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ کبھی نہیں جاؤں گا۔۔۔ میں یہیں پیدا ہوا ہوں یہیں مروں گا۔"(۲۹)

تقسیم کے موقع پر بھی ہندوستان میں مسلم اقلیتوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے اور پاکستان میں بھی ہندو اقلیتوں کو جذبہ حب الوطنی کی سزا دی گئی۔ حب الوطنی میں اجتماعیت کا رنگ ہونا چاہیے اس میں ہندو ازم اور مسلمان ازم جیسی کوئی تفریق نہیں ہونی چاہیے۔ اپنے وطن سے ہجرت قطعاً آسان نہیں ہوتی۔ اگرچہ تقسیم برصغیر کے موقع پر تاریخ کی ایک بڑی ہجرت دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن ان لوگوں کو بھی یقیناً وطن کی یاد نے ہمیشہ بے چین کیے رکھا ہو گا۔ وہ ہجرت مجبوری کے پیش نظر کی گئی تھی۔ ہجرت نہ کرنے والوں کو حب الوطنی کی سزا سہنی پڑی جس کی بہترین ترجمانی ہمیں ناول "کہر" میں ملتی ہے۔ جہاں خان اکبر کا بیٹا محب وطن اقلیتی ہندوؤں کے ساتھ وہی بہیمانہ سلوک کرنے کی بات کرتا ہے جو کہ ہندوستان میں مسلم اقلیت کو حب الوطنی کی سزا کے طور پر برداشت کرنا پڑا۔ ناول "کہر" سے اقتباس دیکھیے:

" جب تک یہ لوگ یہاں ہیں ہماری دال نہیں گلے گی۔ اور پھر لاکھوں کے کاروبار وہاں ہمارے لوگ بھی اسی طرح چھوڑ کے آرہے ہیں۔ وہ متروکہ املاک کن کے حصے میں آئیں گی۔ انھوں نے صدیوں سے ہماری قوم کے لوگوں کا خون نچوڑ کر بے پناہ دولت اکٹھی کی ہے۔ یہ سب کچھ ہمارا ہے۔ یہی قدرت کا نظام ہے۔ انقلابات میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ وہاں ان کے بھائی بند ہمارے لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے ہیں تو یہ کیسے ہمارے لاڈلے ہو گئے۔ سب کچھ چھنتا نظر آیا ہے تو نسلوں کے واسطے دینے لگے ہیں۔"(۳۰)

خان بہادر کے بیٹے اکبر نے باپ سے کہا کہ وہ بھی اسی ادارے سے قانون کی ڈگری حاصل کر کے وکالت کر رہا ہے۔ جس سے دیوان کے دونوں بھائیوں نے بھی ڈگری لی ہے۔ لیکن ان کے مقابلے میں میری پریکٹس صفر ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کو مارنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ان کے مرنے کے بعد ہی میری ترقی کی راہ ہموار ہو گی۔ انسانوں کے میل جول سے سماج وجود میں آتا ہے۔ سماج کا وجود ہزاروں سال پرانا ہے۔ سماج کی ترقی اور تنزل کا دارومدار انسانوں کے طرز عمل پر ہوتا ہے۔ تاریخ میں ملکوں اور قوموں نے ترقی کے مراحل بھی طے

کیے ہیں اور وہ شکست کے عمل سے بھی گزرے ہیں۔ جب انسانوں نے مثبت سوچ کے ساتھ سماج کے نظم وضبط کی خاطر قوانین مرتب کیے اور شہریوں نے اس پر بلا امتیاز عمل کیا تو وہ سماج ترقی کرتا گیا۔ جب قانون کا احترام ختم ہو گیا تو نفسا نفسی دیکھنے میں آئی اور وہ سماج صدیوں تک زوال پذیر رہا۔ ہندو اقلیتوں کی حب الوطنی کی ایسی سزاؤں کے حوالے سے احمد سلیم "پاکستان اور اقلیتیں" میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"سب سے سنگین بات یہ ہوئی کہ اس دور نے پاکستانی معاشرے کو اقلیت اور اکثریت میں تقسیم کر دیا۔ تقسیم کا یہ عمل یہیں پر نہیں رکا بلکہ تقسیم در تقسیم کے عمل نے معاشرتی دھاگے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ غیر مسلم اقلیتوں کو سب سے زیادہ خراب حالات سے گزرنا پڑا۔"(۳۱)

ہندو اقلیت کو حب الوطنی کی سزا موت کی صورت میں ملی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی تمام جائیدادوں پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ انھیں جان ومال سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ناول "کہر" سے اقتباس ملاحظہ کریں۔

"پناہ کے طلب گار ابھی کچھ سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ انھیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر بپھرے ہوئے دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔۔۔ دکانیں، مکان، حویلی اور دیگر جائیدادوں کے علاوہ مندر بھی لوٹ لیے گئے۔۔۔ شاہ صاحب کو قتل وغارت اور لوٹ مار کے کھیل سے بہت صدمہ ہوا تھا۔ وہ ٹھنڈی آہیں بھرتے اور کہتے کہ ہم لوگ کب اپنے آپ کو سچے مسلمان ثابت کریں گے۔ اگر سرحد کے پار یہ سب کچھ ہوا تو یہاں وہی قبیح کھیل کیوں کھیلا گیا۔ کیا فرق رہ گیا؟ کاش ہم نے اپنی پناہ میں رہ جانے والے بے بس لوگوں کے جان ومال اور آبرو کی حفاظت کی ہوتی تو کہہ سکتے تھے کہ ہم سچے ہیں۔ ان میں اور ہم میں واضح فرق ہے۔"(۳۲)

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جذبہ حب الوطنی نعمت خداوندی سے کم نہیں ہے۔ اور اس جذبے کے تحت ہی انسان اپنے وطن سے محبت کرتا ہے اور ایک دن اپنی جان تک اس پر وار دیتا ہے تاکہ اس کی سلامتی ہمیشہ برقرار رہے۔ پاکستانی ناولوں میں اقلیتوں کی حب الوطنی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حب الوطنی کی جو اقلیتوں کو سزا ملی اس کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ وہ اقلیتیں خواہ مسلم ہوں، ہندو ہوں یا عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والی ہوں سب کی ترجمانی کی گئی ہے۔

طاقت وروں کے ظلم و ستم

طاقت کی کہانی ہر دور میں ایک ہی سمت سفر کرتی رہی ہے۔ جس میں طاقت ہوتی ہے اسے زیادہ سے زیادہ طاقت کا حصول یقینی بنانے کی فکر لاحق رہتی ہے۔ یہ معاملہ لالچ کا بھی ہے اور مجبوری کا بھی۔ لالچ یوں کہ زیادہ سے زیادہ طاقت کا مطلب ہے کہ وسائل پر زیادہ اختیار اور ایک ایسا معیار زندگی یقینی بنانا جس کا دوسرے یعنی کمزور صرف خواب دیکھا کرتے ہیں۔ جس شخص میں طاقت ہوتی ہے وہ قابل رشک انداز سے جیتا ہے اور جس ریاست میں طاقت ہوتی ہے وہ بھی ادھر ادھر ٹانگ اڑانے کی عادی ہوتی جاتی ہے تاکہ زیادہ وسائل بٹور کر ایک ایسا معیار زندگی یقینی بنائے جسے دوسرے حسد سے دیکھیں۔ اور مجبوری یوں کہ جب کوئی فرد یا معاشرہ اپنے آپ کو زیادہ طاقت ور بنانے کی راہ پر گامزن ہوتا ہے تو وہ کمزوروں کے حقوق اور وسائل پر ڈاکے ڈالتا جاتا ہے۔ ہر طاقت ور دراصل کمزوروں کو لوٹ کر، ان کا استحصال کر کے ہی اپنا الو سیدھا کرتا آیا ہے۔ یہ کوئی آج کل کا قصہ نہیں صدیوں بل کہ ہزاروں برس سے چلی آ رہی داستان ہے۔ ہر طاقت ور کو یہ خوف بھی لاحق رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جنھیں ایک مدت تک کچلا گیا ہے وہ سر اٹھائیں اور متحد ہو کر استعمار و استحصال کا بازار بند کرنے کے لیے محاذ بنائیں اور بدلہ لینے پر تل جائیں۔ یہی سبب ہے کہ طاقت ور معاملات کو انتقام تک پہنچنے سے روکنے کے لیے کمزور کو مسلسل لوٹتے رہتے ہیں تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہی نہ ہو سکیں۔ طاقت ور کے لیے لازم ٹھہرتا ہے کہ اپنی طاقت میں اضافے کے لیے کوشاں رہے۔ اس کے لیے وہ ظلم و ستم کی راہ پر چلنے سے بھی گریز نہیں کرتا کیوں کہ اس کے سوا اس کے تئیں کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ ہر دور کی تاریخ کمزوروں کو کچلنے کی داستانوں سے عبارت ہے یہ سلسلہ آج تک جاری ہے کبھی دھونس دھمکی سے، تو کبھی ظلم و ستم کا بازار گرم کر کے، تو کبھی قتل و غارت کے ذریعے۔ مظلوموں پر طاقت وروں کا ظلم و ستم صدیوں سے ایک گھناؤنے کھیل کی صورت میں جاری ہے۔ طاقت وروں کے ظلم و ستم کی عکاسی پاکستانی ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں کی ہے۔ جیسا کہ ناول بھاگ بھری میں ہندو اچھوت اقلیت بھاگ بھری کو ساری زندگی اقلیت اور کمزور ہونے کی بنا پر طاقت ور وڈیروں کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔

ناول "بھاگ بھری" سے اقتباس ملاحظہ کریں:

"اگلے ہی روز وڈیرے نے ایک اچھوت مزدور سے جو بھاگ بھری کے باپ سے بھی بڑا تھا اس کے پھیرے پھروا دیے۔

ان اچھوت مزدوروں کی لغت میں "نہ" کے لفظ کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ طاقت وروں کا حکم بجالانا ہی ان کا دھرم تھا۔۔۔کچھ ماہ بعد بھاگ بھری نے ساون کے مہینے میں رم جھم برسات کے دوران ایک بیٹے کو جنم دیا۔۔۔اچھوت مزدوروں کی برادری میں زمیندار کے لیے مفت میں کام کرنے کے لیے ایک اور بچے کا اضافہ ہو گیا تھا۔"(۴۳)

ناول نگار نے کمزور اور طاقت ور کی ترجمانی کی ہے۔ بھاگ بھری کی اپنی زندگی تو جبر مسلسل سے عبارت تھی ہی اب اس کا بیٹا بھی طاقت وروں کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے کے لیے دنیا میں قدم رنجہ فرما چکا تھا۔ بھاگ بھری کی کہانی پاکستان کے صوبہ سندھ کے سماج کے ارد گرد گھومتی ہے۔ پاکستان میں طاقت وروں، جاگیرداروں، وڈیروں کے ظلم و جبر کے حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی کا "پاکستانی معاشرہ" میں کہنا ہے:

"جاگیردار اور قبائلی سرداری نظام کا خاتمہ مشکل نظر آتا ہے۔ ان کی موجودگی میں معاشرہ پسماندہ اور پچھڑا ہوا رہے گا۔ کیوں کہ یہ ان کی مفاد میں ہے کہ یہ لوگ جاہل رہیں، اور غربت و مفلسی کی حالت میں ان کے محتاج رہیں۔ اس لیے یہ لوگ روایت کے نام پر عورتوں کو قتل بھی کرتے ہیں، ان کے حقوق کچلتے ہیں اور اپنے علاقوں کو زیادہ سے زیادہ پسماندہ رکھتے ہیں۔"(۴۴)

طاقت ور کمزوروں کے ساتھ ایسا رویہ رکھتے ہیں جیسے وہ انسان نہیں جنگلی جانور ہوں یا ان کی ذاتی جاگیر ہوں۔ انھیں دبانے اور دبوچنے کی خاطر وہ اپنے علاقوں کو پسماندہ رکھتے ہیں تاکہ وہ کبھی بھی اپنے حق کے لیے آواز بلند نہ کر سکیں۔ مظلوم طبقات یا کمزور طبقات اس نظام کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں وہ نظام کو دوش دے کر اپنی محرومی کو بدلنے کی ذمہ داری سے خود کو مبرا کرنا چاہتے ہیں۔ طاقت ور اور کمزور کی شکلیں ان کے دماغ میں گڈ مڈ ہو جاتی ہیں۔ بھاگ بھری کے بیٹے ساون کو بھی اپنی ماں کی طرح طاقت ور وڈیروں کی جانب سے شدید ذہنی، جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

ناول "بھاگ بھری" سے اقتباس ملاحظہ کریں:

> "دور کر دو! اس حرام زادے پلید نسل کو! اس کو مویشیوں کے باڑے میں جانوروں کے ساتھ باندھ دو۔ اس خبیث کو تین دن تک کھانے پینے کے بغیر ہاتھ باندھ کر رکھنا! تاکہ اس کے کان کھل جائیں اور حکم عدولی اس کے خون سے نکل جائے۔۔۔ بھاگ بھری چھوٹے وڈیرے کے قدموں میں بیٹھ کر اس سے اپنے بیٹے کی جان بخشی کی بھیک مانگنے لگی۔ اس نے بھاگ بھری کو ٹھوکر سے پیچھے ہٹایا اور اٹھ کر بڑے وڈیرے کے پیچھے حویلی کی طرف چل پڑا۔ وڈیرے کے مسلح آدمی ادھ موئے ساون کو اٹھا کر جانوروں کے باڑے کی طرف گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔۔۔ انھوں نے اس کے ہاتھ کمر کے پیچھے موڑ کر مضبوطی سے ایک لمبی سی رسی سے باندھ دیے اور اسی کے دوسرے سرے کو اس کی ٹانگوں سے لپیٹتے ہوئے جانوروں کے کھونٹے سے باندھ دیا۔"[۳۵]

کمزور طبقے کے ساتھ اس سے بدتر سلوک اور کیا ہو گا۔ کہ جب جی چاہے ان کا کھانا پینا بند کر دو۔ جیسے جی چاہے ان کے ساتھ جانوروں کی طرح کا سلوک کرتے ہوئے انھیں جانوروں کے کھونٹے کے ساتھ باندھ دو۔ اس سے بڑھ کر انسانیت کی تذلیل اور کیا ہو گی۔ سندھ میں وڈیرا راج ہے۔ وڈیرے وہاں طاقت کے بل بوتے پر اقلیتوں کو یوں ہی قدموں تلے روندتے ہیں۔ پاکستان میں جاگیرداری طبقے کے حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی "پاکستانی معاشرہ" میں لکھتے ہیں:

> "پاکستان میں جاگیردار اور قبائلی سردار طاقتور اور بااثر ہیں، ان کی طاقت اور اثر و رسوخ کی وجہ قدیم روایات اور رسم و رواج ہیں کہ جن کے ذریعے انھیں اتھارٹی ملتی ہے۔ یہ اپنے علاقوں میں تمام اختیارات رکھتے ہیں اور ریاست اور اس کے قوانین ان کی حدود میں بے معنی ہو جاتے ہیں۔"[۳۶]

طاقت ور بے بس کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتا ہے کیوں کہ اسے طاقت ور ہونے کا احساس تبھی ہوتا ہے جب کوئی بے بس اس کی مقتدر حیثیت کے سامنے بے یار و مددگار تڑپ رہا ہو۔ طاقت ور ہونے کا یہ احساس اس قدر نشہ آور ہوتا ہے کہ انسان اس کی خاطر ازل سے ایمان بیچتا، مال چھینتا، کھوپڑیاں اڑاتا اور نسلیں اجاڑتا آیا ہے۔ طاقت ور اور کمزور طبقے کی کہانی ہمیں ناول "طاؤس فقط رنگ" میں بھی ملتی ہے جہاں

امریکہ جیسی طاقت ور ریاست میں مسلم اقلیت کو کمزور طبقے کی حیثیت سے ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس ناول کی کہانی میں بھی بھاگ بھری کی طرح ایک مجبور ماں کی بے بسی ہے جو طاقت ور کے سامنے گڑگڑانے اور التجا کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتی۔ ناول "طاؤس فقط رنگ" سے اقتباس دیکھیں:

> "پلیز آفیسر، میرے بچے امریکن ہیں۔ یہیں پیدا ہوئے ہیں۔ میرا بیٹا مذہبی فناٹک یا ٹیررسٹ نہیں ہے۔۔۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی طریقے سے اپنے بیٹے کو بچا لے۔۔۔ ہم تو صرف تمھیں حوالات میں بند کرنے کے لیے لے جا رہے ہیں۔ گیٹ اپ۔ اٹھو اور ہمارے ساتھ چلو۔ دوسرے پولیس والے نے مراد کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں اور چلنے کو کہا۔ دونوں پاؤں بندے ہوئے ہوں تو کیسے چلا جا سکتا ہے۔۔۔ اس کے سامنے اس کے جگر کا ٹکڑا، اس کا بیٹا، اس کا قیمتی اثاثہ، آنکھوں کا تارا، پاؤں میں بیڑیاں پہنے برف میں قدم جماتا دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ ہتھکڑیوں میں بندی لوہے کی زنجیر کا ایک سرا پولیس افسر نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا تھا۔ سجیلہ کو لگا اس وقت اس کا بیٹا ایک کتے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ مراد مڑ مڑ کر ماں کو یوں دیکھتا تھا جیسے وہ سمندر میں ڈوب رہا ہو اور ماں اس کا کنارہ ہو۔"(۳۷)

طاقت ور ریاستیں جو ہمیشہ اس بات کا پرچار کرتی ہیں کہ ان کے ہاں اقلیتوں کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ یہ محض زبانی دعووں اور دکھاوے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ ریاستیں ہمیشہ کمزور کو اپنے مظالم کا نشانہ بناتی ہیں اور اقلیتوں کو ہر جگہ تقریباً ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس حوالے سے " آزادی اظہار کے نام پر" میں یوں لکھا ہے: "امریکہ اور مغربی ممالک میں فرد کی آزادی اظہار محض ڈھونگ اور منافقانہ عمل ہے۔"(۳۸)

طاقت ور جس روپ میں بھی ہو ہر صورت میں اپنی طاقت لامحدود حد تک بڑھا لینا چاہتا ہے۔ کیوں کہ یہ وہ نشہ ہے جو کبھی پورا نہیں ہوتا۔ اپنی اس بے لگام توسیع پسندانہ خواہش کے باعث وہ کمزور پر ظلم ڈھاتا ہے۔ اس کے حقوق سلب کرتا ہے۔ سازشیں کرتا ہے۔ استحصال کرتا ہے۔ ہر سماج میں طاقت ور اور کمزور طبقہ بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ طاقت ور کمزور کے خون کا آخری قطرہ بھی چوس لینا چاہتا ہے اور کمزور کے پاس کوئی جائے پناہ نہیں جہاں وہ اپنی دادرسی کے لیے جا سکے۔ یہ سماج مکمل طور پر طاقت ور کا سماج بن چکا ہے۔

ناول "راکھ" میں ہندو اقلیت کو نظر آتش کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی طاقت ور حاوی اور کمزور طبقہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے ۔اقلیت اور کمزور ہونے کے سبب اور بے بسی کی تصویر بنے اگلے جنم سدھار جاتے ہیں۔ناول "راکھ" سے اقتباس دیکھیں:

"ہندو شاہ عالمی دروازے کو مکمل طور پر بند کر کے محصور ہو چکے تھے اور اس علاقے کے اندر بقول کسے چڑیا بھی نہیں جا سکتی تھی لیکن ایک جاں باز مجسٹریٹ محمد غنی چیمہ نے جان پر کھیل کر چند مزید جاں بازوں کو شاہ عالمی کے زیر زمین گندے نالے کے ذریعے اندر پہنچایا انھوں نے اطمینان سے سکونت پذیر کافروں کے مکانوں اور دکانوں کو آگ لگادی۔شاہ عالمی کئی ہفتوں تک جلتا رہا۔اور کئی مہینوں تک سلگتا رہا۔"(۳۹)

ناول میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح طاقت ور کے ہاتھوں کمزور ہندو اقلیت مرغ بسمل کی مانند تڑپتے رہے اور یوں ہی تڑپتے تڑپتے آگ میں جھلس جھلس کے مر گئے۔ غیر مسلموں کے اقلیتوں کے ساتھ اس وقت متعصبانہ طرز عمل کے حوالے س"ڈاکٹر مبارک علی"یوں اظہار حیال کرتے ہیں:

"پاکستان کو ایک نظریاتی ملک بنانے کا یہ نتیجہ نکلاہے کہ آزادی کے بعد یہ قومی ریاست نہیں بن سکا۔کیوں کہ قومی ریاست میں ہر مذہب، فرقہ، نسل اور ذات کے لوگوں کو قوم کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ان کے درمیان فرق نہیں کیا جاتا۔۔۔جب غیر مسلموں کو یہ احساس ہوا کہ ان کے حقوق برابر کے نہیں اور ان کے ساتھ متعصبانہ رویہ اختیار کیا جارہاہے تو اس کے نتیجے میں ان میں احساس محرومی پیدا ہوا۔"(۴۰)

جو جتنا طاقت ور ہے اس کا ظلم اتنا ہی زیادہ ہے۔ جب سماج میں طاقت وروں کے سامنے جھکنے اور کمزوروں پر ظلم کرنے کی روش عام ہو جائے تو بربادیوں کی داستان رقم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔یہ بھی امر واقعی ہے کہ کوئی آدمی کسی سے جسمانی اعتبار سے طاقت ور ہوتا ہے، کسی کو مال، کسی کو جاہ و منصب، اور کسی کو حکومت و کرسی کی طاقت ملتی ہے۔ایسے میں کچھ لوگ اپنی طاقت کا استعمال دوسروں کو نفع پہنچانے میں کرتے ہیں۔جب کہ اکثر لوگ قوت و طاقت کا استعمال کمزوروں پر زیادتی کی صورت میں کرتے ہیں۔ ظلم و زیادتی کرنے والوں پر طاقت کا نشہ اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ انھیں یہ شعور ہی نہیں ہوتا کہ ان سے بھی بڑا طاقت ور ہے۔ ایک ایسی قوت ہے جو عظیم الشان کائنات پر حاوی ہے۔انھیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ ان کے پاس

موجود طاقت خواہ وہ مال ہو، اسلحہ و بارود ہو، عہدہ ہو، منصب ہو یا حکومت ہو، سب قادر مطلق کی طرف سے ہے اور فانی ہے۔ناول "جانگلوس " میں بھی طاقت ور اور کمزور کا تصادم دکھایا گیا ہے۔ جہاں مسیحی اقلیت عنایت کو اس کی محنت کے برابر اجرت نہیں دی جاتی۔ اور اس کی وجہ محض اس کا کمزور طبقے سے تعلق ہونا ہے۔ ناول "جانگلوس"(جلد سوم) سے اقتباس دیکھیے:

"منشی نے عنایت مسیح کا نام پکارا۔ وہ اٹھا اور جھٹ منشی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ منشی نے رجسٹر میں انگوٹھے کا نشان لگوایا اور دو روپے آٹھ آنے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ عنایت معاوضے کی رقم ہاتھ میں لیے چند لمحے گم سم کھڑا رہا۔ پھر اس نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔ سیئں منشی یہ تو بہت کم ہیں۔ اس بار تو میں نے زیادہ ہی محنت کی ہے۔ دہاڑی بھی اتنی ہی ہونی چاہیے۔"(۴۱)

عنایت مسیح کے گھر بیٹے نے جنم لیا تھا۔ مگر وہ بھی اپنے گھر والوں کی طرح بد قسمتی سے ان لوگوں کے ظلم و ستم کے زیر اثر زندگی کے دن پورے کرے گا۔اس کی پیدائش پر گھر میں راشن نہ ہونے کی وجہ سے ماں بھوکی تھی جس کی وجہ سے بچے کو دودھ نہیں پلا سکتی تھی۔ اور اس حالت میں بھی وہ پورا ہفتہ محنت مزدوری کرتی رہی۔ اور بچہ بھی بھوک کی وجہ سے مسلسل روتا رہا تھا۔اس لیے عنایت مسیح نے منشی سے اپنی کمائی کے حساب سے بات کی لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی وہ دل مسوس کر رہ گیا کیوں کہ وہ خون کے گھونٹ پینے کے علاوہ اف تک نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے حق کے لیے آواز تک بلند نہیں کر سکتا تھا۔طاقت ور یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ ضعف و کمزوری کے مقابلے میں قوت و طاقت ہے۔اور اللہ ہی سارے جہاں میں سب سے زیادہ طاقت ور ہیں۔پس ماندہ اقلیتوں کو اپنی زیر نگرانی رکھنے کے لیے انھیں بلاوجہ دبانا، انھیں کم اجرت دینا اور حق کے لیے آواز بلند کرنے پر تشدد کا نشانہ بنانا ایک عام سی بات بن کر رہ گئی ہے۔ڈاکٹر مبارک علی "پاکستانی معاشرہ" میں لکھتے ہیں:

"جہاں امیر و غریب کا فرق ہو، جہاں صاحب اقتدار اور محروم طبقوں کے درمیان دوری ہو، ایک ایسے معاشرے میں طاقت ور اور صاحب اقتدار اپنے سے کم تر لوگوں کی روز بے عزتی کرتا ہے۔ان کی غیرت و حمیت کا خاتمہ کرتا ہے۔"(۴۲)

طاقت ور کی کمزور اقلیتوں کی عزت نفس مجروح کرنا بھی ظلم عظیم ہے۔ کمزوروں کو غلام کی حیثیت سے زیر تصرف رکھنا، انھیں کچل کر اپنی طاقت میں اضافہ کرنا طاقت وروں کا شیوہ ہے۔ اس صورت حال کو انسانیت سوز قسم کی طرز زندگی کہہ سکتے ہیں۔ ہر دور کی تعریف کمزوروں کو کچلنے کی داستانوں سے عبارت ہے۔ ناول "جانگلوس "(جلد سوم) میں عنایت مسیح کو اجرت طلب کرنے پر بدترین تشدد کا بنایا جاتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"عنایت اب گڑ گڑانے لگا۔ پیشگی اس دفعہ کم کاٹ۔۔۔ سیئں تجھے پتہ ہے میری ذال نے کل ہی نکاجنا ہے۔ مجھ سے پوچھ کر جنا ہے؟ منشی نے اسے ڈانٹا۔ خاماخا کی ٹر ٹر نہ کر ۔۔۔ اس نے مڑ کر حنیف ڈوگر کو دیکھا جو ہاتھ میں چمڑے کا چھتر دبائے کھڑا تھا۔ منشی نے اسے ہشکارا۔۔۔ چھتر اٹھایا اور سڑاک سڑاک عنایت کی کمر پیٹ کر مارنے لگا۔"(۴۳)

وہ اینٹیں بنانے میں اپنے کمزور اور لاغر جسم پر محنت و مشقت کی ہواؤں کے تھپیڑے سہہ رہا تھا۔ لیکن ظالم اور لالچی منشی پھر بھی ان کی کمائی کا آدھا حصہ بے ایمانی سے ہڑپ کر جاتا تھا۔ اور وہ بے بسی سے دیکھتا رہ جاتا۔ کیوں کہ اسے پتہ تھا کہ اگر کبھی بھی اس نے اپنا حق مانگا تو مارے غصے کے آپے سے باہر ہو جائے گا۔ اور اپنی توہین کا بدلہ لینے کے لیے کوڑے تک مروانے سے باز نہ آتا۔ کیوں کہ وہ طاقت کے نشے میں چور تھا اور اسے اپنے مالک کا خاص آدمی ہونے پر گھمنڈ تھا۔ آج جب عنایت مسیح نے صرف اتنا ہی کہا کہ دہاڑی تو بہت تھوڑی ہے تو اس پر انھوں نے اس پر اذیت ناک تشدد کی انتہا کر دی۔ طاقت ور اتنے مضبوط اور با اختیار ہیں کہ مظلوم ظلم سہہ تو لیتے ہیں لیکن ان کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرات نہیں کر سکتے کیوں کہ وہ جانتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو قانون کی زد سے بھی باہر ہیں۔ اس حوالے سے "ڈاکٹر مبارک" علی لکھتے ہیں:

"معاشرے میں جب قانون کی بالادستی نہیں ہو گی۔ اور اہل اقتدار طبقہ اور امراء کے لوگ اس سے باہر ہوں گے تو کمزور اور زیر دست لوگوں پر ظلم و اذیت روکنے والا کوئی نہیں ہو گا"(۴۴)

انسان جب حقیقتوں اور تلخ حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتا یا جب انسان کو معاشی و سماجی مسائل گھیر لیتے ہیں تو وہ فرار کے راستے تلاش کرتا ہے۔ اس کے اعصاب شل ہونے لگتے ہیں۔ اور ایک وقت

ایسا آتا ہے کہ وہ ایسی جگہ تلاش کرتا ہے جو اسے سکون اور آرام پہنچ سکے۔ پاکستانی ناول نگاروں نے اپنے اپنے انداز میں طاقت ور طبقے کا اقلیتوں پر ظلم و تشدد کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے طاقت کے ذریعے کمزور اقلیتوں کا استحصال پیش کیا ہے۔ کمزور اقلیتوں کی بے بسی کی تصویر کشی کی ہے۔ طاقت کے بل بوتے پر کمزور اقلیتوں کو ان کے حق سے مرحوم کرنے پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔

سماجی جبر کے خلاف باغیانہ رویے

جبر ایک ایسا تصور ہے جس کے مطابق انسان اپنے ارادے، اعمال اور افعال میں آزاد نہیں۔ اس تصور کے تحت انسانی ارادے کی باگ ڈور کسی اور طاقت کے ہاتھ میں ہے۔ جبر کا عمومی تصور یہ ہے کہ انسان مکمل آزاد نہیں۔ آج دنیا بھر میں زبان، نسل، مذہب اور رنگ کے اختلافات نے ایک فساد برپا کر کے رکھ دیا ہے۔ ان بے معنی لیکن فتنہ انگیز امتیازات کی وجہ سے انسانی دنیا گروہوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کا دل خواہشات کا منبع و مرکز ہے۔ انسان کے دل میں بہت سی تمنائیں اور خواہشات پیدا ہوتی ہیں۔ جن کی تکمیل کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ اس کی ہر خواہش پوری ہو۔ انسان کو اپنی بعض خواہشات ختم کرنا پڑتی ہیں۔ مگر کچھ خواہشات ایسی ہوتی ہیں کہ جن کو ترک کرنا اور اپنے دل سے نکالنا انسان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ ایسی ہی کسی خواہش کے پورا نہ ہونے کا انسان کو بڑا دکھ اور صدمہ ہوتا ہے۔ اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور وہ زندگی سے مایوس ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی خستہ حالی، ناداری اور جہالت دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔ اپنے اوپر ڈھائے جانے والے ظلم اس کے دل میں کانٹا بن کر کھٹکتے رہتے ہیں۔ اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کا دل و دماغ باغیانہ خیالات کا آماجگاہ بن جاتا ہے اور وہ بغاوت پر اتر آتا ہے۔ اور ظالموں کی مخالفت میں ہر حد سے گزر جانے سے دریغ نہیں کرتا۔ کیوں کہ لوگ انھیں ذہنی اور جسمانی طور پر دکھ اور تکلیفیں پہچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ سماج میں کچھ ادارے ایسے ہوتے ہیں جہاں انسان اختیاری طور پر کام کرتا ہے لیکن کچھ اداروں میں اسے جبراً کام کرنا پڑتا ہے۔ سماجی جبر میں خارجی عوامل شامل ہوتے ہیں۔ اس میں انسان خود بے قصور ہوتا ہے۔ سماج نے فرد کو پابندیوں کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ ایسی صورت حال میں پاکستانی ناول نگاروں نے سماجی جبر کے خلاف باغیانہ رویے کو موضوع بنایا ہے۔ ناول ''بھاگ بھری'' میں سماج کے جبر کا شکار ساون باغیانہ رویے سے کام لیتے ہوئے وڈیرے کے نوکر پر

ہاتھ اٹھالیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اسے تشدد کا نشانہ بننا پڑتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے اندر بغاوت جنم لیتی ہے۔ ناول "بھاگ بھری" سے اقتباس ملاحظہ کریں:

"تو نے میرے آدمی پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت کیسے کی؟

وڈیرے نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ بھاگ بھری کانپ کر رہ گئی۔

ساون سر جھکائے خاموشی سے کھڑا رہا۔ اس نے اپنی ماں سے بچپن سے ایک ہی سبق سیکھا تھا کہ وڈیروں اور ان کے بچوں کے سامنے کبھی بھی سر نہ اٹھانا اور نہ کبھی ان سے آنکھیں ملانا۔۔۔

تو زبان کھول حرام زادے۔۔۔

شاید ایسا وڈیرے کی زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا کہ کوئی نوکر اس کا حکم بجالانے سے انکار کر رہا تھا۔ یہ انکار کسی آزاد انسان کی طرف سے نہیں بل کہ ایک اچھوت غلام ماں کے غلام اور حرام زادے بیٹے کی طرف سے تھا۔ اب وڈیرے کا صبر جواب دے چکا تھا، وہ کرسی سے اٹھا اور اس نے دھان پان سے ساون کو اپنی ٹھوکروں سے مارنا شروع کر دیا۔۔۔

اگر میرے ہاتھ میں یہ ہتھیار ہوتے تو میں وڈیرے کو اس کے خاندان سمیت بھون ڈالتا۔ زمین پر گھٹنے پیٹ میں گھسائے لیٹے ساون نے دل ہی دل میں سوچا۔"[۴۵]

ان دکھوں اور تکلیفوں کو ساون بڑے حوصلے، صبر اور استقامت کے ساتھ برداشت کرتا رہا۔ مگر وڈیروں کی طرف سے ایذا رسانی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ساون کے ساتھ ان کی طرف سے زیادتی اقلیت ہونے کے علاوہ بغض اور کینے کی وجہ سے بھی ہے۔ ان جابر وڈیروں کو آزادی کا کوئی جذبہ پسند نہیں۔ وہ ان اقلیتوں کی غلامی کی زندگی گزارنے پر خوش ہیں۔ ساون کے لیے یہ بات بھی بہت تکلیف دہ تھی کہ ان پر ہر طرح کے ظلم و ستم ڈھانے کے باوجود وہ پوری طرح ان کی خدمت گزاری میں مصروف تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وڈیروں کا خوف اس کے دل سے دور ہوتا گیا۔

اب اس کے دل میں خوف وہراس کے بجائے باغیانہ جذبات نے غلبہ پالیا تھا۔ اس حوالے سے "ڈاکٹر مبارک علی"یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"جب ریاستی ادارے لوگوں کی جان ومال کی حفاظت نہ کر سکیں تو اس کی وجہ سے ریاست کی عزت واحترام کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور لوگ اس پر مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے تحفظ کے لیے کسی گروہ یا مافیا کی حمایت حاصل کریں اور اس کے ساتھ وفاداری کا اظہار کریں۔ یہ صورت حال اس وقت ہمارے معاشرے میں ہے۔ جس کی وجہ سے یہ گروہ بہت زیادہ طاقت ور ہو رہے ہیں جب کہ ریاست ان کے مقابلے میں کمزور ہو رہی ہے۔"(۴۶)

سماج انسانی کردار کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔اقلیت سخت اضطراب میں ہیں۔اور یہ اضطراب ان کی پریشانی کی پیداوار ہے۔جو ایک غیر مطمئن،ناآسودہ،بے مصرف زندگی گزار رہے ہیں۔کیوں کہ غیر یقینی حالات بے مقصد زندگی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔نوجوان اقلیت کے سامنے کوئی سمت نہیں،کوئی منزل نہیں اور کوئی نصب العین نہیں۔گھریلو زندگی میں بھی وہ محبت اور شفقت سے محروم ہوتے ہیں اور گھر سے باہر بھی انھیں اپنا تاریک مستقبل واضح دکھائی دیتا ہے۔اس لیے پھر ان میں باغیانہ رویے،وحشت اور تشدد کا رجحان بڑھتا چلا جاتا ہے۔وہ جن دشوار گزر مراحل سے گزرتے ہیں اس سے ان میں حوصلہ شکنی،بے ہمتی اور مایوسی پیدا ہوتی ہے۔کیوں کہ انسان ایک ایسی ہستی بنایا گیا ہے جس کی فطرت میں آزادی اور خودمختاری رکھی گئی ہے۔وہ ذی عقل اور ذی شعور ہے۔اسی طرح سماج کا طاقت ور طبقہ جو اقلیتوں کو ہمیشہ اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ایک دن انھیں بھی باغیانہ رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جیسا کہ ناول "بھاگ بھری"میں خالد خراسانی عرف ساون میں سماجی جبر کے خلاف باغیانہ رویہ پیدا ہوتا ہے۔اقتباس ملاحظہ کریں:

"کیا میں ایک کلاشنکوف کو اپنے پاس رکھ کر سو سکتا ہوں؟

ہاں ہاں کیوں نہیں۔۔۔اسلحہ مجاہدوں کا زیور ہے۔

خالد نے ایک کلاشنکوف کو بستر میں رکھا اور خود برابر میں لیٹ گیا۔

وہ سوچنے لگا کہ:

گاؤں کا وڈیرا دو رائفلوں اور دو محافظوں کے ذریعے سارے گاؤں کو خوف زدہ رکھتا ہے۔۔۔اور آج اس کے کمرے میں ہتھیاروں کا انبار لگا ہوا ہے۔۔۔اس کے دماغ میں گاؤں کی زندگی، ماں پر ظلم اور وڈیرے کی دہشت کے مناظر یکے بعد دیگرے آتے رہے اور یوں وہ نیند کی آغوش میں جہاں پہنچا۔"(۴۷)

وڈیروں نے اپنے بنائے ہوئے قانون کو اندھے کی لاٹھی کی طرح بے دریغ استعمال کیا۔اور ظلم و تشدد اور جبر و ستم کی وہ خوف ناک داستانیں رقم کیں کہ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کی بربریت کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ہندو اقلیت مجبور و مقہور، بے بسی اور بے کسی کی تصویر بنے وڈیروں کے غیض و غضب کا شکار بن رہے ہیں۔اقلیت اپنی اس حالت سدھارنے سے اس حد تک مایوس ہو چکے ہیں کہ مدت تک ان کے دلوں میں اپنی اس پستی اور ذلت کا احساس بھی پیدا نہ ہو سکا اور اپنی غلامی کو انھوں نے اپنا مقدر سمجھ کر قبول کر لیا۔مگر ساون کی برداشت سے یہ سب باہر ہوتا جا رہا تھا اور باغیانہ خیالات اس کے دل و دماغ میں امڈتے چلے آ رہے تھے۔سماجی جبر سے بچاؤ کے لیے ریاست اہم کردار ادا کرتی ہے۔اور بالخصوص اقلیتوں کو ساری دنیا میں سماجی جبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اقلیتوں کو جب طاقت ملتی ہے تو وہ مشتعل ہو جاتے ہیں۔ان میں خوف کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں۔اور وہ سماجی جبر کے خلاف باغیانہ رویہ اپناتے ہیں۔"ڈاکٹر مبارک علی" کے نزدیک:

"اس میں وہ لوگ شریک ہوتے ہیں کہ جو مجبور و بے بس ہوتے ہیں، جو دھتکارے ہوئے ہوتے ہیں جن کا معاشرے میں کوئی مقام نہیں ہوتا۔جو غربت اور مفلسی کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔اس لیے جب مجمع کی شکل میں انھیں طاقت ملتی ہے تو وہ اہل اقتدار اور صاحب جائیداد لوگوں کی ہر شے کو تباہ کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔"(۴۸)

پاکستانی ناول نگاروں نے بھی اپنے ناولوں میں سماجی جبر اور پھر اس کے خلاف بغاوت کی عکاسی کی ہے۔انھوں نے سماجی جبر کا تجزیہ کیا ہے۔ناول نگاروں نے حیات سے لے کر موت تک کا سماجی جبر اور اس کے خلاف باغیانہ رویوں کو پیش کیا ہے۔

جیسا کہ ناول" طاؤس فقط رنگ" میں بے گناہ مراد کو مسلم اقلیت ہونے کی بنا پر جب مجرم قرار دیا جاتا ہے تو وہ باغیانہ رویے کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملک سے بھاگ جانے کی بات کرتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

"ڈیڈ، مام میں آپ کو بتا رہا ہوں اگر انھوں نے مجھے دھر لیا اور مجھے رہائی نہ ملی تو میں بھاگ جاؤں گا۔ یہ لوگ مجھے گوانتاموبے بھیج دیں گے۔ وہاں سے کبھی بھی کوئی بچ کر نہیں نکل سکتا۔ میں وہیں گل سڑ کر مر جاؤں گا۔ میں پکڑا نہیں جانا چاہتا۔ میں امریکہ سے بھاگ جاؤں گا۔ مراد بچوں کی طرح ضد کرنے لگا۔۔۔

سن لیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں ڈیڈ۔ اگر مجھے سزا ہو گئی تو میں میکسیکو کے راستے بارڈر کراس کر جاؤں گا۔ پاکستان پہنچ جاؤں گا۔ کچھ بھی کر گزروں گا میں جیل نہیں جاؤں گا۔ میں نے جیل میں نہیں سڑنا۔"(۴۹)

سماج میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو بے گناہ لوگوں پر جبر کے ذریعے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جیسا کہ مراد کو جبراً مجرم ٹھہرایا جاتا ہے۔ سماج کی بنیادیں جب کھوکھلی ہو جائیں تو جبر کے ذریعے ناانصافی انسان کا مقدر بن جاتی ہے۔ اقلیتیں تو ایسی طاقت ور ریاستوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی کی حیثیت رکھتی ہیں جسے جب چاہیں اپنے اشاروں پر نچا سکتی ہیں۔

اقلیتی عورت کا جنسی استحصال

مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اگر یہ دونوں پہیے درست حالت میں ہوں گے تو ہی زندگی کی گاڑی صحیح سمت میں محو سفر رہے گی۔ اگر ان میں سے ایک بھی پہیہ کسی خرابی کا شکار ہو جائے تو یہ گاڑی ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتی۔ جب کہ سماج میں عورت کو متعدد مسائل کا سامنا ہے اور اقلیتی عورت تو مختلف مسائل میں گھری ہوئی ہے۔ جس میں ایک مسئلہ ان کا جنسی استحصال بھی ہے۔ ناول نگاروں نے ان کے جنسی استحصال کی نشان دہی کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انھیں مسائل میں جکڑے ہوئے اور سسکتے ہوئے دکھایا ہے۔ اقلیتی عورت کے ساتھ امتیازی سلوک کی جڑیں بہت پرانی اور گہری ہیں۔ عورت کے ساتھ منفی رویے دراصل ہمارے سماجی اقدار کے عدم توازن کی پیداوار ہیں۔ اقلیتی عورت کو کٹھن مراحل اور دشوار حالات کا سامنا ہے۔ اقلیتی عورت مختلف ادوار میں جبر اور بربریت کا شکار ہوتی رہی ہے۔ ناول نگار اس اقلیتی عورت کو دکھانا چاہتے ہیں جو اپنے دور کے ظالمانہ سماجی شکنجوں میں جکڑی دکھائی دیتی ہے۔ آزادی اور

حقوق نسواں کے باعث عورتوں کو ان کے حقوق کے حوالے سے تحفظ مل گیا تھا۔ اسلام نے عورت کو جائز مقام دیا ہے اور اس کے حقوق کو بھرپور تحفظ فراہم کیا ہے۔ اس کے باوجود پاکستانی سماج میں اقلیتی عورت کو مشکل حالات کا سامنا ہے اور ان کے مقام کے حوالے سے صورت حال حوصلہ افزا نہیں ہے۔ پاکستانی سماج میں عورتوں کے جنسی استحصال کے بارے میں صحیح حقائق اور معلومات حاصل کرنا ایک مشکل امر ہے۔ کیوں کہ لوگ اپنی عزت کی تشہیر کرنا پسند نہیں کرتے اور تمام ایسی معلومات بے عزتی سمجھتے ہوئے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ ان معاملات میں خواتین کی خاموشی سے برداشت کرنے کے عمل کو سماجی پسندیدگی بھی حاصل ہے۔ صفدر زیدی نے ناول "بھاگ بھری" میں انسانیت سے محروم ان لوگوں کی تصویر کشی کی ہے جو سماجی ناہمواری کا شکار ہیں اور اخلاقی قدروں کا احترام کرنے کے بجائے دنیاوی لذتوں کی خواہش میں انسانی رشتوں کے تقدس کو بھی فراموش کر چکے ہیں۔ بھاگ بھری کی عمر ۱۳ برس تھی جب وہ چھوٹے وڈیرے جعفر شاہ کی درندگی کا شکار ہو گئی۔ اور جب اس کی ماں روتی دھوتی اپنی فریاد لے کر بڑے وڈیرے کے پاس گئی تو اس نے بھاگ بھری کی ماں کو ڈرا دھمکا کر اپنا منہ بند رکھنے کو کہا اور الٹا اس کی بیٹی بھاگ بھری پر الزام لگا دیا کہ وہ پتہ نہیں کہاں کہاں اپنا منہ کالا کرتی پھرتی ہے اور الزام ہم جیسے شریف لوگوں پر لگا رہی ہیں۔ ناول "بھاگ بھری" سے اقتباس پڑھیے:

> "وڈیرے کے چھوٹے بھائی جعفر شاہ کی آنکھیں ہر وقت اس پر ٹکی رہتی تھیں۔ ایک روز وہ اصطبل میں گھوڑوں کی لید کو ہاتھ گاڑی میں بھر رہی تھی کہ وڈیرے نے اسے ایک درندے کی طرح جھنجوڑ کر اپنی ہوس مٹا ڈالی۔ یوں تو وہ اچھوت تھی اس کو چھونا منع تھا لیکن کچھ دیر کے لیے وہ اچھوت نہ رہی تھی۔ چاہے کچھ لمحوں کے لیے ہی سہی، لیکن اس کی ذات وڈیرے کی ذات کے برابر آ ہی گئی تھی۔ وہ روتی پیٹتی اپنی کٹیا میں آئی اور ماں کی آغوش میں سسک سسک کر اپنے درد کا مداوا ڈھونڈنے لگی۔ کچھ ماہ بعد اس کی ماں کو یقین ہو گیا کہ اس کی پھول سی بچی پیٹ سے ہو چکی ہے۔ سہمی ہوئی ماں فریاد لے کر وڈیرے کے پاس گئی۔
>
> سائیں! میری بیٹی کے ساتھ چھوٹے سائیں نے ظلم کیا ہے ہم کہیں کے نہیں رہے، بھاگ بھری کی ماں نے چادر وڈیرے کے پاؤں میں رکھ کر فریاد کی۔

تم لوگوں کی ذات کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اِدھر اُدھر منہ کالا کراتی پھرتی ہو اور الزام ہم شریفوں پر رکھتی ہو! وڈیرے نے اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔

دیکھ! یہ الزام اگر دوبارہ تیری زبان پر آیا تو تیری زبان کو نکلوا کر اپنے کتوں کے آگے ڈلوادوں گا۔

اس نے گرجدار اواز میں کہا۔

ماں کے حلق سے خوف کے مارے آواز نکلنا بند ہو گئی۔"(۵۰)

اور دوسرے ہی دن بعد بھاگ بھری کی شادی اس کے باپ سے بھی بڑی عمر کے ایک مفلس ترین آدمی سے کر دی گئی۔ کیوں کہ بھاگ بھری ایک بے بس طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور طاقت ور وڈیروں کے سامنے انتہائی کمزور حیثیت کی مالک تھی۔ اس لیے آسانی سے ان کے ظلم اور ناانصافی کا شکار ہو گئی "جنید قیصر "اس معاملے پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"غریب غیر مسلم لڑکیاں اور خواتین مذہبی نفرت اور تعصب کا شکار ہوتے ہوئے اپنی عزت و عظمت سے محروم ہو چکی ہیں اور آج بھی انصاف کی تلاش میں بھٹک رہی ہیں۔"(۵۱)

عورت کوئی بھی ہو وہ محبت کے جذبے سے سرشار ہوتی ہے اور وہ بے بسی اور تکلیف دہ زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔ لیکن بعض اوقات اسے طرح طرح کے دکھ اٹھانے پڑتے ہیں اور غربت میں پروان چڑھنے کے ساتھ ساتھ جاگیر داروں کے ہاتھوں استحصال کا نشانہ بھی بنتی ہے۔ بھاگ بھری جاگیر دارانہ سماج کے وضع کردہ اصولوں اور ضابطوں میں جکڑی ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اقلیت ہونے کے ساتھ ساتھ پیٹ کا جہنم بھرنے کے لیے خاموشی سے ان کے ظلم و ستم سہتی ہے۔ بھاگ بھری ایک مجبور، بے بس اور ستم رسیدہ عورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماں بھی ہے۔ جس کو جاگیر دارانہ نظام میں ایک پالتو جانور سے بھی کم اہمیت دی جاتی ہے۔ صفدر زیدی نے سماج کی ان خرابیوں کی نشان دہی کی ہے جو صدیوں سے مضبوط جڑیں رکھتی ہیں اور ان خرابیوں کی پرورش کرنے والے جاگیر دار طاقت ور اور ہر طرح سے مضبوط اور اثر رسوخ والے ہیں۔ صفدر زیدی نے بھاگ بھری کے ساتھ ہونے والے ظالمانہ سلوک اور حالات و واقعات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری کی توجہ شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔

خالد فتح محمد نے ناول "زینہ" میں بڑی ہی فن کارانہ چابک دستی سے اقلیتی عورت کے مسائل اور حالات پیش کیے ہیں۔ اپنے ناول کے ذریعے سے سماجی بگاڑ، ناانصافیوں اور عدم مساوات پر مبنی سماج کو نشانہ بنایا ہے۔ مارتھا عیسائی عورت ہے اور ایک سرمایہ دار اور سیاسی طور پر مضبوط چودھری ظفر نے اسے بغیر شادی کے اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے اور اب اس عورت کے گھر بچے کی پیدائش بھی ہونے والی ہے۔ چودھری ظفر ناول کے مرکزی کردار فہیم سے کہتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "جو عورت تم نے یہاں دیکھی ہے جو میری بیوی نہ ہوتے ہوئے بھی بیوی ہی ہے وہ مسیحی ہے۔ اس کے پیٹ میں سے پیدا ہونے والے بیٹے کو کیا کہا جائے گا۔۔۔ میرے بدن میں کپکپی دوڑ گئی یہ کیا آدمی تھا اور کیا باتیں کرتا تھا۔"(۵۲)

ظفر چوں کہ ایک بااثر آدمی تھا اور بظاہر کسی بھی محلے کے آدمی اور مولوی نے بھی اس طرف توجہ نہیں دی تھی اس نے ان لوگوں کو بھی دے دلا کر اپنے زیر احسان کیا ہوا تھا۔ لہٰذا اس کے خلاف آواز اٹھانے کی کوئی جرات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اقلیتی عورت طبقاتی نظام، جنسی استحصال، ناانصافی اور امتیازی سلوک کا شکار ہو رہی ہے۔ ایسی عورت سماج میں نظام کا ہر ظلم اور زیادتی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے، اور بے بسی کی تصویر بنے ہوئے ساری زندگی نمناک آنکھوں میں اچھے مستقبل کے خواب لیے گزار دیتی ہے۔ کیوں کہ انھیں اچھی طرح اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا کوئی بھی وسیلہ نہیں ہے۔ وہ بے وسیلہ ہیں۔ فاخرہ تحریم "عورت کا المیہ" میں اس معاملے پر اس انداز سے لکھتی ہیں:

> "عورت کسی کے گھر میں ملازمت کر رہی ہو، کھیتوں میں کام کرنے کے لیے نکلے، دفتر میں کسی کی سیکرٹری ہو، فیکٹری میں مزدوری کر رہی ہو، ہسپتال میں نرس ہو، ڈاکٹر ہو، ایئر ہوسٹس ہو، کہیں بھی اپنے آپ کو محفوظ تصور نہیں کرتی۔۔۔ کبھی اسے الفاظ کے ذریعے کبھی اشاروں سے، کبھی چھو کر اسے ایک الگ مخلوق ہونے کا احساس دلایا جاتا ہے۔ یہاں تک ہی نہیں بل کہ جو خواتین مردوں کے ساتھ دیر تک کام کرتی ہیں وہاں خواتین کو مختلف طریقوں سے ورغلانے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان میں سے کئی خواتین جنسی تشدد کا نشانہ بھی بنتی ہیں۔"(۵۳)

ایک عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ معلومات عامہ پر بھی دسترس رکھے تاکہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق اپنی زندگی گزار سکے۔ اگر اس کی حالات پر نظر ہے اور معلومات عامہ میں اضافہ ہو تا رہے تو اس کا اثر اولاد کی تربیت پر بھی پڑتا ہے۔ اور وہ اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے مفید فیصلے کر سکتی ہے۔ اور اپنے بچوں کے کامیاب مستقبل کے لیے مثبت قدم اٹھا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ فنی تعلیمی بھی حاصل کرے۔ اسے دست کاری کے علوم اور نرسنگ وغیرہ کے علوم پر دسترس حاصل ہونی چاہیے۔ تاکہ وہ اپنے گھر کے افراد اور دیگر عورتوں تک ان علوم کو پہنچا کر انھیں کامیاب زندگی گزارنے کے قابل بنا سکے۔ لیکن افسوس کا مقام کہ جنسی استحصال کا شکار یہ عورتیں اقلیتی ہونے کی وجہ سے ان تمام چیزوں سے بے خبر ہیں۔ انھوں نے تو سکول کا منہ بھی نہیں دیکھا ہوتا اور نہ کبھی اس کے قریب سے بھی گزری ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ اپنے بچوں کی تربیت بھی کرنے سے قاصر ہوتی ہیں۔ اور وہی ازل سے جاری مکروہ کھیل میں ان کے بچے بھی غلام بن کر سسکتے سسکتے زندگی گزار دیتے ہیں۔ ظفر مارتھا کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ اس نے میرے ساتھ ایک باعزت زندگی گزاری ہے۔ اور گزار رہی ہے۔ میں نے اسے ہر سہولت فراہم کی ہے۔ اگر یہ عیسائی خاندان میں ہوتی تو مفلسی کی زندگی گزار رہی ہوتی یہ سنتے ہی مارتھا پر وحشت سوار ہو گئی اس کی آنکھوں میں شدید غصہ تھا اور اس نے کھا جانے والی نظروں سے چودھری ظفر کو گھورا اور بولی۔ ناول "زینہ" سے اقتباس ملاحظہ کیجیے۔:

> "میں نے کیا پایا ہے؟ جتنی میں بدنام ہوئی اتنا کون ہوا ہے؟ میں ایک عزت والی زندگی اس لیے گزار رہی ہوں کہ ایک عزت والا آدمی اپنی مایوسی میرے اندر پھینکتا رہا ہے اور مجھے گندا کرتا رہا ہے۔ میں اندر سے گندی اور باہر سے صاف ہوں اور بدنام بھی بہت ہوں۔ چوہڑے مجھے اپنا نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے آپ کو بیچ دیا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ میں بکی نہیں کیوں کہ میں نے اپنا مذہب نہیں چھوڑا۔ میں ابھی تک ان کی ہوں گو میں رہ یہاں رہی ہوں۔"(۵۴)

عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک ایک مصیبت کی شکل میں ہمیشہ سے رہا ہے۔ سماجی و معاشی استحصال کا شکار عورتیں کسی نہ کسی شکل میں ہوتی رہی ہیں۔ تمام سماجی طبقات، معاشروں اور نسلوں سے تعلق رکھنے والی خواتین اپنے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے خطرے سے دوچار ہیں۔ پوری دنیا میں ان کا یہی حال ہے۔ ایسی خواتین کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی بھر بے حس سماج میں بے وقعت زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی

ہیں۔ اور ان مظلوم عورتوں کی زندگی کبھی معمول کے مطابق نہیں آتی۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ایسی خواتین جبر اور امتیازی سلوک کی وجہ سے نہ دین کی رہتی ہیں اور نہ دنیا کی۔ سرمایہ دارانہ رسوم کو ختم کیا جانا چاہیے جو عورتوں پر جبر اور ناروا سلوک کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اور ان کی عصمت دری کرتے ہیں۔ عورتوں کی راہ میں حائل ان مسائل پر قابو پانا ہو گا کیوں کہ عورتیں ہی نسل کی پرورش کرتی ہیں۔ یہ عورتیں بہت مضبوط بھی ہیں اور بہت کمزور بھی۔ اگر طاقت ور عورتوں کو دیکھا جائے تو ہمارے ملک کی خواتین فوج سے لے کر ایوانوں تک، تعلیم و تدریس سے لے کر بیورو کریسی کے عہدوں پر براجمان ہیں۔ جن کے ماتحت کئی سو افراد کام کرتے ہیں۔ اور اگر کمزور عورت کی بات کی جائے تو ہمارے ملک کی وہ عورتیں جو گھریلو تشدد سہتی ہیں، جنسی استحصال کا شکار ہوتی ہیں، دن رات کولہو کے بیل کی طرح کام کرتی ہیں اور زندگی کی بنیادی سہولیات کو ترستی ہیں۔ اس حوالے سے روبینہ سہگل "عورت اور مزاحمت (محنت کش عورتوں سے مکالمہ)" میں لکھتی ہیں:

> "عورت ایک انتہائی مضبوط ہستی ہے جو ظلم، تشدد، ناانصافی اور بربریت کے باوجود مستقل مزاجی سے حالات کا مقابلہ کرتی ہے اور وہ ایک غیر متحرک اور بیچاری ہستی نہیں ہے۔"(۵۵)

مفلسی ہزار برائیوں کو جنم دیتی ہے۔ اور پھر مفلسی اور جہالت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تمام پاکستانی مرد حضرات ظالم اور بے راہ روی کا شکار نہیں ہیں۔ ہمارے سماج میں اقلیتی خواتین اور اکثریتی خواتین دونوں کو عزت دی جاتی ہے۔ ہجوم میں عورت کو گزرنے کا راستہ بنا کر دیا جاتا ہے۔ پبلک ٹرانسپورٹ میں عورت کھڑی ہو تو فوراً کوئی بھی مرد اس کے لیے نشست خالی کر کے اسے بیٹھنے کے لیے جگہ دیتا ہے۔ کہیں اگر کسی لائن میں کھڑے ہوں تو عورت کو پہلے بھیج دیا جاتا ہے مثلاً بینک وغیرہ میں۔ اس طرح کے مردوں کے ساتھ کثیر تعداد ان مردوں کی بھی ہے جو چودھری ظفر اور وڈیرے جعفر شاہ کی سی خصلت رکھتے ہیں۔ اور سماج کے ماتھے پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں میں عورت کو انسان نہ سمجھنے والی سوچ بہت گہری ہو چکی ہے۔

اقلیتوں کی حمایت پر حوصلہ شکنی

مادہ پرستی کے اس دور میں اگر کسی شخص میں کچھ انسانی اور اخلاقی قدریں موجود بھی ہوں تو بعض لوگوں انھیں ان کی برائیاں بنا کر ایک دوسرے کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ عبادت گزار شخص کو ریاکار اور دھوکہ دینے والا قرار دیا جاتا ہے، جھوٹ سے پرہیز اور سچائی پر عمل پیرا ہونے والے کو بے وقوف کہا جاتا ہے۔ سچی بات منہ پر کہہ دینے والے کو منہ پھٹ اور بد تمیز کے لقب سے پکارا جاتا ہے، اپنے کام سے کام رکھنے اور دوسروں کے معاملات میں بلا وجہ ٹانگ نہ اڑانے والے کو مغرور اور خود سر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ ہم دوسروں کے ایسے کاموں کو جو اپنے اندر خیر اور اچھائی کا پہلو رکھتے ہوں، ان پر بھی شک کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اسے شر اور برائی کی طرف لے آتے ہیں۔ اگر کوئی نیک آدمی نیک نیتی سے کوئی کام کرتا ہے اور اس میں بھلائی کا پہلو واضح اور نمایاں طور پر نظر بھی آتا ہے پھر بھی ہم اخلاقی بد دیانتی سے کام لیتے ہوئے اس کی نیت میں سو سو کیڑے نکالتے ہیں۔ شک و شبہے سے کام لیتے ہوئے اس میں شر کا پہلو تلاش کرتے ہیں۔ حالاں کہ اچھے لوگوں کے بارے میں ایسا رویہ اختیار کرنا نہ صرف پورے سماج میں نیک نیتی سے کام کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کے مترادف ہے بل کہ گناہ بھی ہے۔ ناول "زینہ" کا اقتباس ملاحظہ کریں:

> " ہمارے ہاتھ میں ایک پوسٹر پکڑا ہوا تھا جس کی تحریر کچھ ایسے تھی۔ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ہمارا ساتھ دیں۔ لوگ ہمارے پاس سے گزرتے رہے، کچھ دیر ٹھہرتے بھی رہے، ہمارے پوسٹر کو پڑھتے بھی رہے۔ چند ایک تعریفی نظر سے دیکھتے اور اکثریت کی نظر میں تضحیک ہوتی جیسے وہ جو دیکھ رہے تھے اسے دیکھنا نہیں چاہیے تھا کیوں کہ انھیں یہ مناسب نہیں لگتا تھا۔ ہم دو گھنٹے وہاں کھڑے رہے اور کسی نے ہمارے ساتھ بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ "[۵۶]

ناول "زینہ" میں فہیم اور اس کے ساتھی عیسائی عورت مارتھا کو اس کا حق دلوانے کے لیے انسانیت کے ناطے اس کے ساتھ کھڑے ہو گئے لیکن ان کا اقلیتوں کے لیے آواز اٹھانا چند شر پسند عناصر کو ناگوار گزر رہا تھا۔ وہ لوگ احتجاج کر رہے تھے لیکن کسی نے بھی ان سے بات کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا انسان اگرچہ ہر شعبہ حیات میں ترقی کی انتہائی منزلوں کو چھو رہا ہے اور سائنسی ایجادات کے باعث ہر قسم کی سہولتوں سے بہرہ ور ہو رہا ہے۔ آج کا انسان ترقی یافتہ انسان کہلاتا ہے۔ دنیا کے ہر خطے کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہاں

قانون کی عمل داری ہے۔ جمہوری قدریں رائج ہیں۔ ہر جگہ انسانیت کی عظمت کے دعوے کیے جاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آج کا انسان انسانیت سے اس قدر دور ہو چکا ہے کہ اس کے دل میں محبت کی جگہ نفاق نے لے لی ہے۔ وہ دوسروں کی خوشیاں چھیننا اور اپنے آنگن کو مسرتوں سے مہکانا چاہتا ہے۔ انسانوں کی تذلیل اس طرح کی جاتی ہے کہ یوں لگتا ہے کہ انسان کل بھی جنگل میں تھا اور آج بھی جنگل میں ہے ہیں۔ "احمد سلیم" کے مطابق:

> "پاکستان میں انسانی حقوق کی گمبیر صورت حال، ریاستی جبر اور سماجی دباؤ کے باوجود ہندو اور مسیحی اقلیتوں کے بہت سے نمائندے اور کارکن انسانی حقوق کی جدوجہد کی تحریک کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔"(۵۷)

انسان اپنے مقصد کی تخلیق کو سمجھے، اخوت اور محبت کو اپنا اشعار بنائے، اپنے فرائض کو پہچانے اور دوسروں کے حقوق کو تسلیم کرے۔ خود کو اخلاقی قانون اور مذہب کی حدود میں پابند رکھے اور خدا کی زمین پر خدا کا بندہ بن کر اس کی مخلوق سے محبت اور پیار کرے۔ حق اور صداقت کے علمبر دار ہر دور اور ہر سماج میں پائے جاتے ہیں۔ ایسے عظیم انسان بڑی سے بڑی قربانی دے کر بھی حق کہنے سے نہیں ہچکچاتے۔ ایسے سچے اور کھرے لوگ ہمیشہ دنیا میں ناپسند کیے جاتے ہیں۔ کیوں کہ کوئی بھی شخص اپنی خامیوں اور خرابیوں کے بارے میں سننا پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ سچی اور کھری بات کہنے والوں کو ہمیشہ ناقابل بیان مصیبتوں اور دکھوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ عدل کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ مظلوم کو نہ صرف ظالم کی چیرہ دستیوں سے بچایا جائے بل کہ ظالم کے غرور، طاقت کو اس طرح توڑا جائے کہ وہ ایک مہذب سماج میں کسی پر ظلم کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ ناول "زینہ" میں اقلیتوں کے حق میں آواز اٹھانے کی سزا کے حوالے سے اقتباس دیکھیں:

> "اب کچھ لوگ ہمیں ان مذہبی گروہوں کے بارے میں اطلاع دیتے جو ہمارے مخالف ایک اتحاد بنانے کا سوچ رہے تھے، جس میں اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں آواز اٹھانا انھیں قبول نہیں، ملک نے انھیں رہنے کے لیے ذرائع دیے ہیں اور وہ انہی حدود کے اندر زندگی گزاریں اور اگر انھیں محسوس ہوا تو ہم پر حملہ بھی کر دیں گے۔"(۵۸)

لوگ اقلیتوں کے حق میں بولنے اور ان کی مدد کرنے سے پہلے یقین کرنا ضروری خیال کریں گے کہ کہیں ایسا کرنے سے اکثریت کی تضحیک کا نشانہ تو نہیں بن جائیں گے۔ یا انھیں مالی طور پر نقصان تو نہیں برداشت کرنا پڑے گا۔ وہ ہچکچائیں گے اور سوچیں گے کہ ایسا کرنے سے کہیں ان کی زندگی کو خطرہ تو نہیں ہو گا۔ وقت تو ضائع نہیں ہو گا۔ بل کہ انھیں دوسرے لوگوں کو بھی ضمانت فراہم کرنا ہو گی تب جا کر وہ انھیں قائل کر سکے گے۔ ایسے میں اعتماد بحال کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ انھیں بعض لوگوں کی طرف سے انفرادی حیثیت میں بھی مخالفت کا سامنا ہو گا۔ وہ ان کے منصوبوں کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس لیے وہی منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہو گا جو بے باکی اور خوف کی زد میں آئے بغیر حل کیا جائے گا ۔ایسے لوگوں کی خوبیاں ان ظالم و جابر لوگوں کے دوغلے رویے کی نظر ہو جاتی ہیں۔ڈاکٹر مبارک علی "پاکستانی معاشرہ" میں اس حوالے سے یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> "پاکستان جس صورت حال سے دوچار ہے، اس میں نہ تو ملک میں سیاسی استحکام ہے، نہ معاشی خوش حالی ہے، نہ قانون کی بالادستی اور نہ لوگوں کی جان و مال کا تحفظ۔ حکمران طبقے ریاست کے اداروں کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کر رہے ہیں، اور قومی مفادات کے نام پر لوگوں کے بنیادی حقوق پامال کر رہے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نظریہ کے نام پر ہر اس تحریک کو دبا دیا جاتا ہے کہ جو قدامت پرستی، اور انتہا پسندی کے خلاف ہیں۔"(۵۹)

پاکستانی عیسائی اور ہندو اقلیتوں کے حق میں آواز اٹھانے والے کو اکثریت کی حمایت حاصل ہونی ضروری ہے۔ یعنی ہر فرد انھیں فخر اور تحسین کی نگاہ سے دیکھے۔ جب انھیں ہر عام و خاص کا بھرپور تعاون حاصل ہو گا تو ان کی تحریک کامیابی کی ضامن بنے گی۔

حوالہ جات

۱۔ خالد فتح محمد، زینہ، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص۲۹۶

۲۔ سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں، ادارہ تعلیم و تحقیق، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص۴۴

۳۔ خالد فتح محمد، زینہ، ص۳۶۲

۴۔ سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں، ادارہ تعلیم و تحقیق، ص۹

۵۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص۴۰۳

۶۔ جنید قیصر، پاکستانی اقلیتوں کا نوحہ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص۲۱

۷۔ خالد فتح محمد، زینہ، ص۳۴۸،۳۴۹

۸۔ سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں، ادارہ تعلیم و تحقیق، ص

۹۔ علی اکبر ناطق، نو لکھی کوٹھی، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص۴۲۱

۱۰۔ سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں، ادارہ تعلیم و تحقیق، ص۶

۱۱۔ علی اکبر ناطق، نو لکھی کوٹھی، ص۳۹۰

۱۲۔ نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۲۴۴

۱۳۔ محمد متین خالد، آزادی اظہار کے نام پر (ترتیب و تحقیق)، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۹۲

۱۴۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، ص۴۴۵

۱۵۔ خالد فتح محمد، زینہ، ص۲۸۴

۱۶۔ ایضاً، ص۲۹۹

۱۷۔ نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، ص۱۹۰،۱۹۱

۱۸۔ محمد الیاس، کہر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص۲۳۵

۱۹۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، ص ۱۰۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۲۱۔ ایضاً، ص ۵٦۵

۲۲۔ جنید قیصر، پاکستانی اقلیتوں کا نوحہ، ص

۲۳۔ نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، ص ۲۳۹

۲۴۔ محمد متین خالد، آزادی اظہار کے نام پر (ترتیب و تحقیق)، ص ۵۰۵

۲۵۔ نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، ص ۲۱۳

۲٦۔ محمد متین خالد، آزادی اظہار کے نام پر (ترتیب و تحقیق)، ص ۵٦٦

۲۷۔ علی اکبر ناطق، نو لکھی کوٹھی، ص ۳۵۵

۲۸۔ جنید قیصر، پاکستانی اقلیتوں کا نوحہ، ص ۳۳

۲۹۔ علی اکبر ناطق، نو لکھی کوٹھی، ص ۳۵۷

۳۰۔ محمد الیاس، کہر، ص ۱۴

۳۱۔ احمد سلیم، پاکستان اور اقلیتیں، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۵۱۰

۳۲۔ محمد الیاس، کہر، ص ۱۵،۱٦

۳۳۔ صفدر زیدی، بھاگ بھری، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۲۲

۳۴۔ مبارک علی، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۵۳

۳۵۔ صفدر زیدی، بھاگ بھری، ص ۲۹

۳٦۔ مبارک علی، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ، ص ۵۲

۳۷۔ نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، ص ۱۹۹

۳۸۔ محمد متین خالد، آزادی اظہار کے نام پر (ترتیب و تحقیق)، ص ۱۰۸

۳۹۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، ص ۴۷

۴۰مبارک علی، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ، ص ٦٧

۴۱۔ شوکت صدیقی، جانگلوس (جلد سوم)، رکتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۲۱ء، ص ۴۵۱

۴۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر پاکستانی معاشرہ، ص ۳۷

۴۳۔ شوکت صدیقی، جانگلوس، جلد سوم، ص ۴۵۲

۴۴۔ مبارک علی، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ، ص ۸۴

۴۵۔ صفدر زیدی، بھاگ بھری، ص ۲۸، ۲۹

۴۶۔ مبارک علی، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ، ص ۲۱

۴۷۔ صفدر زیدی، بھاگ بھری، ص ۲۷

۴۸۔ مبارک علی، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ، ص ۴۵

۴۹۔ نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، ص ۲۰٦، ۲۰۷

۵۰۔ صفدر زیدی، بھاگ بھری، ص ۲۱

۵۱۔ جنید قیصر، پاکستانی اقلیتوں کا نوحہ، ص ۳۷

۵۲۔ خالد فتح محمد، زینہ، ص ١٦٨

۵۳۔ فاخرہ تحریم، عورت کا المیہ، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۵۸، ۵۹

۵۴۔ خالد فتح محمد، زینہ، ص ۲۰۸

۵۵۔ روبینہ سہگل، عورت اور مزاحمت، (محنت کش عورتوں سے مکالمہ) مشعل، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ٦

۵٦۔ خالد فتح محمد، زینہ، ص ۳۴۷

۵۷۔ احمد سلیم، پاکستان اور اقلیتیں، ص ۳۹۱

۵۸۔ خالد فتح محمد، زینہ، ص ۳۵۰

۵۹۔ مبارک علی، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ، ص ٦

باب چہارم

پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے مذہبی مسائل کی عکاسی

مذہب کا انسانی زندگی کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔اس کرہ ارض پر کوئی ایسا شہر نہیں ہے جس میں کسی مذہب کے ماننے والے نہ ہوں۔ دنیا میں موجود تمام مذاہب اللہ رب العزت تک رسائی کا ذریعہ ہیں۔ مذہب انسانی فطرت میں شامل ہے یہی وجہ ہے کہ ہر انسان فطری طور پر مذہب کو اپنی زندگی کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ ہر مذہب کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہیں۔ اچھائی اور برائی کے واضح احکامات ہر مذہب کا حصہ ہیں۔ البتہ تضادات مذاہب کے پیروکاروں کے رویوں میں ہے۔ مذہبی اخلاقیات کا ایک پہلو انصاف کا ہے، انصاف کے معنی برابری کے ہیں۔ ہر ایک مذہب انصاف کا درس دیتا ہے۔ اگر انصاف نہیں ہو گا تو دنیا کا نظام درست نہیں چل سکے گا۔ ہر طرف بدامنی پھیل جائے گی اور لوگ اپنے حقوق کو ترسیں گے۔ میثاق مدینہ، آئین پاکستان اور اقوام متحدہ کا اقلیتوں کے حق میں خصوصی آئین اور ول کیملیکا کے نظریات مذہب کے معاملے میں اقلیتوں کے ساتھ عدل و انصاف کا درس دیتے ہیں۔ ہر مذہب کے ماننے والے اپنے مذہب پر فخر کرتے ہیں اور مرتے دم تک اپنے مذہب پر قائم رہتے ہیں۔

ہر مذہب کے ماننے والوں کے زندگی گزارنے کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ جو اس مذہب کے ماننے والوں کی پہچان ہوتے ہیں۔ ناول ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں زندگی کی حقیقی معنوں میں عکاسی ہوتی ہے۔ناول میں زندگی سے متعلق ہر طرح کے موضوعات کو سمویا گیا ہے۔ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے لیکن اس کو انسانوں کے درمیان بہت اہمیت حاصل ہے۔ پاکستانی اردو ناول میں اقلیتوں کے ان تمام مذہبی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ جو مذہب کے نام پر اقلیتوں کو درپیش ہیں مثلا توہم پرستی، نفرت انگیز گفتگو، عبادت گاہوں پر حملے، جبری تبدیلی مذہب وغیرہ۔ ظلم برداشت کرنا اور اس کے خلاف آواز بلند نہ کرنا بہت سے مذہبی مسائل کو جنم دیتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ اقلیت بھی اپنے مذہبی حقوق کی پہچان رکھیں اور ان کی حفاظت اور حصول کو یقینی بنانے کی کوشش کریں۔

توہم پرستی

وہم، شک، گمان پر یقین رکھنے والے، غیر حقیقی اشیا پر بھروسہ کرنے والے کو توہم پرست کہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ بغیر کسی فطری دلیل کے اپنے خیالات باطل سے واقعات کو یقین کا درجہ دیتا ہے۔ انسان دنیا میں کچھ خیالات و تصورات اور روایات کے تحت زندگی گزارتا ہے اور انھی تصورات و خیالات کے نتیجے میں وہ اپنے آپ کو کسی خاص عادت اور رسم و رواج کا پابند سمجھتا ہے اور اپنی عادات و تصورات کو مذہب سے تعبیر کرتا ہے۔ ابتدا میں لوگ دنیا کو روحوں اور بدروحوں سے مامور تصور کرتے تھے۔ اور فطرت کی اس ہم آہنگی سے مذہب پروان چڑھے۔ اور دور حاضر میں بھی لوگ توہم پرستی میں پیچھے نہیں وہ بھی اس کا شکار ہیں۔ موجودہ صدی کو سائنس، عقل اور علم کی صدی مانا جاتا ہے۔ جدید دور کا انسان ہر چیز کو علم و شعور سے جاننا چاہتا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود توہم پرستی کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ دنیا کی ترقی یافتہ اقوام میں بھی توہم پرستی کے اثرات نمایاں ہیں۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں مختلف توہم پرستی رائج ہے۔ ایمانی جذبہ یعنی توحید میں جب کمزوری ہوتی ہے تو جھوٹے اعتقادات اور توہمات پر یقین مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔ انسان ظاہری اشیاء کی طرف پہلے خوف سے مائل ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر جلد اس پر یقین کر کے ایمان لے آتا ہے۔ محمد الیاس کے ناول "کہر" میں زرینہ بیگم چودھویں کی رات کو مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد کسی وظیفے میں مشغول ہو گئیں۔ اور اس وظیفے کو مکمل کرنے کے لیے زرینہ بیگم کو عشاء کی نماز تک جائے نماز پر بیٹھنا تھا۔ زرینہ بیگم کا اکلوتا بیٹا ذوالقرنین اور عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والی مارگریٹ ہم عمر تھے اور اکٹھے صحن میں کھیل رہے تھے۔ ذوالقرنین اور مارگریٹ کو نہ جانے کیا سوجھی کہ نہانے والے صابن کی دو ٹکیوں کے بہت باریک باریک ٹکڑے کیے۔ ایلومینیم کے لوٹے میں اسے خوب گھول کر لئی سی بنائی اور نلکے کی ٹونٹی پر ہاتھ کی کیف بنائی اور سارا محلول اندر انڈیل دیا۔ دونوں بچے اس کام سے فارغ ہو کر حویلی کی چھت پر چلے گئے اور چاندنی کا نظارہ کرنے لگے۔ توہم پرستی پر ناول "کہر" سے اقتباس دیکھیں:

> "زرینہ بیگم وظائف اور عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر اٹھی اور باہر آکر ہلکے سے نلکے کی ہتھی چلائی تو پہلے مرحلے پر سفید دودھ جیسا محلول نکلا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے تک خشوع کے ساتھ ایک طویل وظیفہ اور عبادت کر کے نکلی تھی۔ کچھ ذہنی کیفیت ایسی تھی گویا اعجاز و تصرف کی منزل تک آن پہنچی ہو۔ فوراً یقین کر بیٹھی کہ نلکے کا پانی دودھ بن گیا

ہے۔ بڑی بلند اور لرزیدہ آواز میں کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگی۔ خان اسلم دوڑ کر باہر آیا تو بیوی کو دیکھا کہ کلام پاک کے ورد کے ساتھ بڑے احترام اور دھیرج سے نلکے کی ہتھی چلا رہی ہے جب کہ ٹونٹی سے سفید محلول خارج ہو رہا ہے۔ خان اسلم بھی بلند آواز میں کلمہ پڑھنے لگا۔ ذوالقرنین اور مارگریٹ چھت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔۔۔ پھر مارگریٹ کو نہ جانے کیا خیال آیا، سرگوشی میں ذوالقرنین سے کہا اوئے اکو! بتانا نہیں کہ ہم نے صابن گھول کر ڈالا ہے ورنہ سخت پٹائی ہو جائے گی۔۔۔ مارگریٹ گھر جانے کے لیے سیڑھیاں اتر کر نلکے کے قریب سے گزری تو اس وقت تک محلول کی سفیدی کافی کم پڑ چکی تھی اور پھر صاف پانی بہنے لگا۔ زرینہ بیگم نے باور کر لیا کہ اچھی بھلی کرامت کی منزل نصیب ہو گئی تھی لیکن اس نجس لڑکی کی وجہ سے چھن گئی۔ اس نے قدرت کی جانب سے اسے ایک واضح اشارہ جانا کہ فلاح چاہتی ہو تو اس غیر مسلم خاندان سے دور رہو۔"[1]

کئی دفعہ آدمی کسی بھی چیز کو اپنے لیے نیک تصور کر لیتا ہے اور کئی دفعہ برا۔ یعنی فلاں چیز میرے پاس ہے اس لیے میرا کام ہو گیا یا فلاں کے نصیب سے ملا۔ یا میں اتنا نیک اور عبادت گزار ہوں کہ اللہ رب العزت نے مجھے کرامت نصیب کی۔ یا کسی کے منحوس قدم کی وجہ سے میرا کام ہوتے ہوتے رہ گیا۔ یہ تمام باتیں توہم پرستی کا نتیجہ ہیں۔ جس طرح زرینہ بیگم نے فوراً ہی سوچ لیا کہ مارگریٹ کی نحوست کی وجہ سے اللہ پاک نے دودھ کو پانی میں تبدیل کر دیا جو اس بات کا صاف اور واضح اشارہ ہے کہ تم جیسی نیک اور عبادت گزار خاتون کو عیسائی خاندان سے کوئی تعلق واسطہ نہیں رکھنا چاہیے۔ ورنہ ان کی نحوست کی وجہ سے تم پریشانی اور مصیبتوں میں گھر جاؤ گی۔ اتفاق سے یہ عجیب واقعہ بھی رونما ہو گیا۔ زیادہ عبادت و ریاضت اور وظائف کا اثر یہ ہوا کہ زرینہ بیگم کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس میں کچھ روحانی قوتیں بیدار ہونے لگی ہیں اور کشف و کرامات کا کوئی روزن وا ہونے کو ہے۔ چاند کی چودھویں رات تھی اور آسمان صاف۔ جب زرینہ بیگم کو صابن کا محلول دودھ لگا اور وہ توہم پرستی کی انتہا کو پہنچ گئی۔ مارگریٹ جو کہ اقلیت تھی تو اس وجہ سے زرینہ بیگم نے اسے فوراً منحوس سمجھ لیا۔

توہم پرستی صرف سادہ اور ان پڑھ معاشروں میں نہیں ہے بل کہ آج کے ترقی یافتہ سماج میں بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی "تاریخ اور معاشرہ" میں اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "موجودہ صورتحال میں پاکستانی معاشرہ۔۔۔ اپنی معیشت، سیاست اور کلچر کو پسماندہ رکھے ہوئے ہے اس کے حل کے لیے ضروری ہے کہ پاکستانی قوم کی تشکیل سیکولر اور جمہوری بنیادوں پر کی جائے۔ جس میں ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگوں کے برابر حقوق ہوں اور جو برابری کی بنیاد پر ایک قوم بن سکیں۔"(۲)

اتحاد و اتفاق کی وجہ سے کائنات میں توازن اور اعتدال ہے اور اسی اتحاد و اتفاق کو کائنات کی تقریباً ہر شے ظاہر کرتی ہے مثلاً دریا، سمندر، لہریں اور چشمے، آبشاریں اور بارش کا پانی یہ سب اتحاد و اتفاق کا ہی مظہر ہے۔ اگر پانی کے ننھے قطروں میں اتحاد نہ ہو تو ان قطروں کا وجود شبنم کے قطروں کی طرح بے معنی و بے وقعت ہو کر رہ جائے کیوں کہ شبنم کے قطروں سے سیلاب نہیں آتے۔ اسی طرح جب کاغذ کے بے شمار اوراق کو جوڑا جاتا ہے تو ایک کتاب وجود پذیر ہوتی ہے اور اگر کتاب کو متحد رکھنے والے تعلق کو توڑ دیا جائے تو اوراق پریشان ہو جائیں گے۔ اسی طرح شہد کی مکھیاں انفرادی طور پر باغ کے مختلف پھولوں سے رس چوستی ہیں اور پھر مل کر شہد کا چھتہ تیار کرتی ہیں۔ یہ مکھیوں کے اتحاد و یگانگت کا ہی نتیجہ ہوتا ہے کہ ہمیں دنیا کی شیریں ترین اور شفا بخشنے والی چیز میسر آتی ہے۔ اگر تمام مکھیاں آپس میں لڑتی جھگڑتی رہیں تو شہد کے ذخیرے کا حصول ناممکن ہو جائے۔ ہمارے گھروں کی مثال لیں تو پورے مکان کی بنیاد دیواروں پر ہوتی ہے اور یہ دیواریں ننھی منی اینٹوں سے مل کر بنتی ہیں۔ اگر یہ اینٹیں اتحاد و اتفاق اور ایک خاص ترتیب حاصل نہ کریں تو مکان کسی صورت بھی نہیں کہلائیں گی۔ اسی طرح کی بے شمار مثالیں موجود ہیں جو ہمیں اتحاد و اتفاق کا درس دیتی ہیں اور اقلیتوں کے حوالے سے توہم پرستی اور انتشار پسندی سے محفوظ رہنے کا اشارہ کرتی ہیں۔ انسانی زندگی میں عروج و زوال اور مشکلات و مصائب انسان کو توہمات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ مفلسی، سماجی تفریق، ذہنی اضطراب وغیرہ بھی توہم پرستی کا سبب بنتے ہیں۔ ہمارا سماج مختلف اعتبار سے ناہمواری اور عدم توازن کا شکار ہے۔ صفدر زیدی کے ناول "بھاگ بھری" میں ایک بزرگ سوبیدار کھڑک سنگھ نے جب بھاگ بھری کی تعظیم میں گردن جھکائی تو یہ سب دیکھ کر اس نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ اسے یوں روتا دیکھ کر جب صوبیدار نے اس سے پوچھا کہ

پتری اس جان لیوا قحط میں ہم سب کو خوشی کا یہ لمحہ میسر ہوا ہے اور تم خوش ہونے کے بجائے رو رہی ہو تو بھاگ بھری نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔ اقتباس دیکھیے:

> "بابا جی! یہ خوشی کے آنسو ہیں آپ نے مجھ اچھوت عورت کو اتنے دل سے عزت دی ہے۔ ایک ایسی عورت کو کہ جس کا ہاتھ کسی کو لگ جائے تو وہ نہانے چلا جاتا تھا۔ جو گاؤں کے سب باسیوں کے لیے سر سے پیر تک پلید تھی۔"(۳)

طبقاتی تفریق انسان کو توہم پرست بنا دیتی ہے اور یہی توہم پرستی انسان کے ذہن، شعور، اخلاق اور کردار کو متاثر کرتی ہے اور عملی برائیوں کو جنم دینے کا باعث بھی بنتی ہے۔ بھاگ بھری کو اقلیت ہونے کی بنا پر پلید سمجھا جاتا تھا کیوں کہ وہ ہندو خاندان کی ایک نچلی ذات سے تعلق رکھتی تھی۔ اس وجہ سے گاؤں کے لوگ اس کے قریب سے گزرنے سے بھی پرہیز کرتے تھے تاکہ ان کا جسم اور کپڑے ناپاک نہ ہو جائیں۔ اور وجہ صرف اور صرف وہی توہم پرستی تھی۔ جو اقلیت ہونے کے سبب عروج پر تھی۔ "روبینہ سہگل" اس مسلئے پر یوں خامہ فرسائی کرتی ہیں:

> "متوسط طبقوں کے لوگوں میں تعصبات کافی زیادہ ہیں اور اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ ان سے بو آتی ہے یہ صاف نہیں ہوتے اور ان سے کسی قسم کے تعلق سے انسان ناپاک ہو جاتا ہے کیونکہ یہ پلید سمجھے جاتے ہیں۔"(۴)

اور جب زندگی میں پہلی بار کسی نے اس کو عزت دی تو وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکی اور بے اختیار رونے لگی۔ کیوں کہ جو سلوک اس کے ساتھ لوگوں نے روا رکھا تھا اس کے بعد بھاگ بھری کے وہم و گماں میں بھی نہیں تھا کہ کبھی اس کی زندگی میں ایسا وقت بھی آئے گا جب اسے بھی عزت و توقیر دی جائے گی۔ ہمارے سماج میں توہم پرستی کی ایک بڑی وجہ ناخواندگی بھی ہے۔ ناخواندگی دور کرنے کے لیے تعلیم بالغاں کا اہتمام کرنا چاہیے۔ تعلیم کی عدم فراہمی کی وجہ سے لوگ مذہب سے دور ہو جاتے ہیں اور توہم پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اچھی تعلیم اور بہترین تربیت کی وجہ سے سماجی برائیوں کو روک تھام میں مدد ملے گی۔ اقلیتوں کے لیے ہمیشہ نیک گمان رکھنا چاہیے اور ان کے لیے خود سے آراء اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ عقائد سے درست تفہیم انسان کو توہمات، نفسیاتی الجھنوں اور اخلاقی بگاڑ سے نجات دلانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

بعض لوگوں نے توہم پرستی کو مذہب کا درجہ دیا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ثواب اور عذاب کا تصور وابستہ کیا جاتا ہے اور عہد حاضر میں بھی اس طرح کے واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انسانی شعور میں موجود توہمات ہمیشہ اس کے تصور پر حاوی رہتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے ناول "راکھ" سے توہم پرستی کا اقتباس دیکھیے:

> "بیگم صاحبہ کے لیے چائے لے آؤ۔ پہلے ان چوڑوں کو چائے پلائی جو پھاٹک کے ساتھ بیٹھے بی بی جی کا انتظار کر رہے ہیں۔ پھر ان کے جوٹھے برتن کلمہ پڑھ کر پاک کیے ہیں اور اب.... یہ بیگم صاحبہ مسلمان ہیں۔" (۵)

مشاہد جب اپنے ملازم کو فاطمہ کے لیے چائے لانے کا کہتا ہے تو وہ فاطمہ کے بلاؤز اور سکرٹ کو مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے اور اسے اقلیت سمجھتے ہوئے مشاہد سے پوچھتا ہے کیا یہ مسلمان ہیں؟ اس سے پہلے اس نے برگیتا (مشاہد کی بیوی جو عیسائی تھی) کے خاندان والوں کو چائے بنا کر دی اور ان برتنوں کو کلمہ طیبہ پڑھ کر پاک کیا۔ اس کے دماغ میں یہ وہم تھا کہ مسلمانوں کے برتنوں میں جب چوڑے (عیسائی) کھائیں پئیں تو وہ ناپاک ہو جاتے ہیں اور استعمال کے قابل نہیں رہتے جب تک کلمہ پڑھ کر ان پر پھونک نہ ماری جائے۔ "روبینہ سہگل" اس حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتی ہیں:

> "انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ان کے لیے بے عزتی سے لفظ چوڑا استعمال کیا جاتا ہے۔ انہیں کمتر سمجھا جاتا ہے اور ان کے خلاف عموما بے شمار مذہبی اور دیگر تعصبات ہوتے ہیں۔ مسلمان مالکان اور ان کے مسلمان ملازم بھی اکثر ان کے ساتھ مل کر کھانا کھانے میں اپنی ہتک محسوس کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اکثر گھروں میں ان کے برتن علیحدہ ہوتے ہیں بل کہ مذہبی تعصبات کی وجہ سے ان سے برا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔" (۶)

برتن کے پاک یا ناپاک ہونے کا حکم اس برتن میں کھانے والی چیز سے متعلق ہوتا ہے اگر کسی برتن میں کوئی ایسی چیز ڈالی جائے جو ناپاک ہو مثلاً شراب یا سور کا گوشت یا کوئی اور حرام چیز وغیرہ ہو تو برتن ناپاک ہو جاتا ہے۔ اور جب تک اس کو شرعی اصول کے مطابق پاک نہ کیا جائے تو وہ پاک نہیں ہوتا۔ اگر کوئی اقلیت کسی برتن کو استعمال کرتا ہے اور وہ کھانے پینے کی چیز پاک ہے تو برتن پاک رہے گا اور اس کا استعمال جائز ہو

گا۔ اقلیتوں کے ساتھ کھانے پینے میں امتیاز سے متعلق "سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں" میں یوں روشنی ڈالی گئی ہے:

> " ہمارے ہاں اکثریت کا عمومی رویہ۔۔۔ غیر مسلم کے ساتھ کھانا اور ان کے برتنوں تک کو استعمال میں لانا برا سمجھا جاتا ہے۔ یہ مقامی کلچر کا اثر ہے جسے مذہبی رنگ دے دیا جاتا ہے۔ مذہب اسلام کی تعلیمات میں اس قسم کی کسی ممانعت کا کوئی ذکر نہیں۔ بلکہ دین کے دعوتی نقطہ نظر کے تحت غیر مسلموں کو کھانے میں شریک کرنا، خود ان کے ہاں کھانوں میں شریک ہونا، ایک مطلوب رویہ ہے۔ انسانیت کا یہی احساس غیر مسلم کے دل کو فتح کرنے کی کنجی ثابت ہو سکتا ہے۔"(۷)

اس کارخانہ سود و زیاں میں ہر چیز اتفاق سے اور اتحاد سے قائم اور برقرار ہے۔ اس اتحاد و اتفاق کی وجہ سے کمزور چیزوں میں بھی بے پناہ قوت آ جاتی ہے۔ پانی کا قطرہ اپنی انفرادی حیثیت سے بالکل غیر اہم شے ہے مگر جب یہی قطرہ سمندر کی طوفانی موجوں کا حصہ بنتا ہے تو لاکھوں من وزنی جہاز اس کے تھپیڑوں سے پناہ مانگتے ہیں اور چٹانیں اس کے سامنے سر بہ خم ہو جاتی ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر ہم اتفاق و اتحاد کے ساتھ رہیں تو زندگی کی حقیقی خوشیوں کے مزے سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

پاکستانی اقلیتوں کو سماج میں امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اکثر اقلیتوں کو اپنی ذات کے بارے میں غیر اخلاقی القاب سننے پڑتے ہیں جیسے کہ مشاہد کے ملازم نے انھیں چوڑوں کے نام سے پکارا اور ان کے استعمال شدہ برتنوں کو اپنی سوچ کے مطابق کلمہ پڑھ کر پاک کیا۔ تا کہ ان کی ناپاکی برتنوں کے ذریعے کہیں انھیں نہ منتقل ہو جائے۔ توہم پرستی کی کوئی حیثیت نہیں بل کہ یہ ان برائیوں میں سے ہے جس سے آزاد کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" کو بھیجا تھا۔ پرانے زمانے میں لوگ طرح طرح کے خیالات اور توہمات کو سینے سے لگائے ہوئے تھے کہ اگر کالی بلی راستہ کاٹے تو یہ نحوست کی علامت ہے اور اگر خرگوش راستے سے گزرے تو خوش بختی کی علامت ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے پیچھے سے آواز دینے کو بھی برا خیال کیا جاتا تھا۔ جب بیٹی کی رخصتی ہو رہی ہوتی ہے تو قرآن پاک کو اس کے سر پر رکھتے ہوئے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی قسمت مزید اچھی ہو جائے گی۔ دھوپ میں اگر بارش شروع ہو جائے تو جو دعا مانگو تو وہ قبول ہو جاتی ہے اس طرح کی بے شمار توہمات ہیں جنھیں ہم آج بھی سینے

سے لگائے ہوئے ہیں۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جن سے آزاد کروانے کے لیے "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" آئے تھے۔ اور ہم بد قسمتی سے اور لاعلمی کی وجہ سے دوبارہ انھی چیزوں کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ انسانی شعور میں موجود توہمات ہمیشہ اس کے تصور پر حاوی رہتی ہیں اور نتیجے کے طور پر انسان بے بنیاد اور خیالی باتوں کو شعوری سمجھنے لگتا ہے۔ اور اس طرح ان کو مذہبی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ زمانہ قدیم ہو یا دور جدید توہم پرستی پر مبنی عقائد و نظریات کی بنیاد من گھڑت واقعات ہوتے ہیں اس سے یہ تاثر پختہ ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر مذہب اور اس کے زیر اثر سماج میں فطرت سے متاثر ہونے کا عمل زیادہ رہا ہے کہ وہ غیر مری چیزوں اور معاملات پر جلدی یقین کر لیتا ہے۔

ہماری ذمہ داریوں میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ہم اپنے طور پر ایسے اعمال سر انجام دیں جن سے اقلیتوں کی دل آزاری کا کوئی بھی پہلو نہ نکلتا ہو۔ بل کہ فلاح اور خیر کی روشنی خارج ہوتی ہو جو تمام نوح انسانی کے ظلمت کدوں کو منور کرتی ہو۔ ہماری ذمہ داریوں میں شامل ہے کہ ہم انفرادی طور پر ایسے کردار کے حامل ہوں جو قدیم توہمات کے اسباب کے خاتمے میں معاون ہو سکے۔" سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں" میں لکھا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "ہمارے ہاں غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ سماجی روابط رکھنے سے عمومی طور پر گریز کیا جاتا ہے۔ ان کی کسی مذہبی تقریب میں شرکت پر بھی مختلف سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ ایسی تقریبات میں شرکت سے عام لوگ تو گریز ہی کرتے ہیں اگر کوئی سیاسی شخصیت کسی تقریب میں شریک ہو جائے تو مختلف قسم کے اعتراضات سامنے آجاتے ہیں۔ یہ رویہ بھی نظر ثانی کا تقاضا کرتا ہے۔ لازم ہے غیر مسلموں کو بھی اجنبیت کا احساس نہ ہو۔ اکثریت انہیں اپنی تقریبات میں شریک کرے اور خود بھی ان کی تقریبات میں شریک ہو۔ اس سے قربت بڑھتی ہے جو غلط فہمیاں پیدا ہونے سے روکتی ہے۔"(۸)

یہ جذبہ اگر پوری قوم میں بیدار ہو جائے تو اقلیتوں کے بارے میں جو توہمات لوگوں کے ذہنوں میں ہیں وہ دور ہو جائیں گی۔ اگر ہمارے پاکستان کے تمام لوگ اس جذبے کی اہمیت کو محسوس کریں اور اپنے اپنے علاقے کے اقلیتوں کے کو سچے دل سے قبول کریں تو ہمارا ملک بھی جنت نظیر بن سکتا ہے۔ لہذا ہمیں چاہیے کہ

بڑھ چڑھ کر اس اصلاحی تحریک میں حصہ لیں۔ اس سے نہ صرف پاکستان میں رہنے والے ہندو اور عیسائیوں کو ہر قسم کی سہولتیں میسر آ سکتی ہیں بل کہ ہمارے ملک کی اقتصادی حالت بھی بہتر ہو سکتی ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے دل میں ٹھان لیں اپنے ملک میں بسنے والی اقلیتوں کا خیال رکھیں گے۔ کیوں کہ ہمارے سماج میں لوگ بعض اوقات جھوٹی انا اور شان و شوکت کی وجہ سے اقلیتوں سے برا سلوک کرتے ہیں۔ ان کا دل دکھایا جاتا ہے اور انھیں حقیر سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اپنے اپنے علاقوں میں اپنی مدد آپ کے جذبے کے تحت اقلیتوں کے حقوق کے لیے خود انصاری کا ذوق پیدا کیا جائے۔

شناخت کا مسئلہ

بچپن بہت خوب صورت اور سہانا ہوتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز دل فریب نظر آتی ہے۔ چاروں اطراف قوس و قزح کے حسین رنگ بکھرے محسوس ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر انسان پھولے نہیں سماتا۔ انسان کو بے فکری کی دھن میں ہر چیز مسرور و شادماں نظر آتی ہے کیوں کہ یہ عمر عقل اور شعور سے بیگانہ ہوتی ہے۔ کچھ انسان بدقسمتی کی وجہ سے جب اپنے سہانے بچپن کو خدا حافظ کہہ کر جوانی میں قدم رکھتے ہیں تو تصویر کا ایک ایسا رخ ان کے سامنے آتا ہے جو ان کے دمکتے ہوئے چہرے سے معصومیت اور سارے رنگ چھین لیتا ہے۔ اور وہ رخ ہے ان کی شناخت کا مسئلہ۔ مثلاً اس کا باپ کون ہے؟ اس کا اپنا ملک کون سا ہے؟ وغیرہ۔ پھر ان کے اندر کا کھوکھلا پن ارد گرد کے حسین مناظر کو دھندلا کر دیتا ہے۔ روشنی میں بھی انھیں مایوسی اور اندھیرا ہی نظر آتا ہے۔ یہ مایوسی اور تاریکی انھیں زندگی سے بیزار کر دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی صورت حال ہے جو انسان کی سوچ اور فکر کو تباہی و بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیتی ہے۔ شدید ذہنی دباؤ اور الجھن کی وجہ سے ان کے سوچنے اور سمجھنے کی ساری صلاحیتیں دم توڑ دیتی ہیں۔ اور وہ اپنے آپ کو تنہائی کے حصار میں قید کر لیتے ہیں۔ کیوں کہ اصل حقیقت عیاں ہونے کے بعد وہ سماج کے ساتھ ساتھ چلنے کی جسارت نہیں کر پاتے۔ وہ ساری زندگی دربدر بھٹکتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔ ایک عجیب سی کش مکش انھیں چین اور اطمینان نصیب نہیں ہونے دیتی۔ ان کے خواب ان کی خوب صورت آنکھوں میں چکنا چور ہو کر ان کو چبھتے ہیں۔ جیسے وڈیرے کی تکبری اور انا پرستی نے ہندو اقلیت بھاگ بھری کے بیٹے ساون کو ناجائز اولاد قرار دیا۔ حالاں کہ وہ حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ وہ اس کی اپنی ناجائز اولاد ہے۔

ساون کی شکل و صورت ہو بہو وڈیرے سے ملتی تھی۔ اس حوالے سے ناول "بھاگ بھری "سے اقتباس دیکھیے:

" چھوٹے وڈیرے جعفر شاہ نے بھاگ بھری کو دیکھ کر اپنے مونچھوں کو بل دے کر اسے اپنی مردانگی اور حاکمیت کا احساس دلایا۔ بھاگ بھری نے اپنے اور وڈیرے جعفر شاہ کی ناجائز اولاد ساون کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر شاید اسے اس کے ظلم کا احساس دلانا چاہا۔ ساون جیسے جیسے بڑا ہوتا جارہا تھا اس میں چھوٹے وڈیرے کی مشابہت نمایاں ہوتی جارہی تھی۔ "(۹)

پاکستانی وڈیرے ہر طرح کی برائی میں بری طرح دھنسے ہوئے ہیں۔ جو اپنے قائم کردہ سماج میں صرف اپنی شان و شوکت کو برقرار رکھنے کے لیے غریب اور لاچار ہندو اقلیت کے بچوں کے ناجائز باپ تو بن جاتے ہیں مگر انھیں ہمیشہ حقارت اور قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اور مظلوم ہندو اقلیت ان کے ظلم کے خلاف اف تک نہیں کرسکتی۔ کیوں کہ ان کے علاقے میں صرف اور صرف ان کا راج اور ان کی حکومت ہوتی ہے۔ زندگی کے ہر پہلو میں برائی ان پر غالب ہوتی ہے۔ جو کہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ ان کے علاقوں میں ان کے اثر و رسوخ کی وجہ سے مکھی بھی ان کی اجازت اور مرضی کے بغیر پر نہیں مار سکتی۔ ان کی سیاست، اخلاق اور تعلیم خواہ وہ دینی ہی کیوں نہ ہو برائی کے زیر اثر ہے۔ ان کے علاقوں میں ہندو اقلیت اور ان کے درمیان مفادات کا تضاد اور حقوق کا تصادم برقرار رہتا ہے۔ اس تضاد اور تصادم کی وجہ سے لاقانونیت، بے اصولی میں تمام حقوق سے دستبردار ہو کر ان کے بنائے ہوئے حقوق اور قوانین کو قبول کرنا لازم ہوتا ہے۔ میثاق مدینہ کے مطابق ایک ایسے سماج کا قیام اس کی بقا اور ترقی ہے جو نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو اور وہ مفاد پرستانہ عناد میں مبتلا نہ ہو بل کہ اخلاقی جدوجہد کرنے والے روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو تاکہ فرائض کی بجا آوری پر اصرار سے حقوق میں تصادم پیدا نہ ہو۔ پاکستانی اقلیتی افراد کو ہر قسم کی خوف و غم سے محفوظ رکھنا اور ان افراد کو سلامتی مہیا کرنا تاکہ شناخت کے طلب گار افراد اور سماج کے درمیان تضاد نہ ابھر سکے اور سماج ہر قسم کے خوف سے محفوظ رہے۔ ایسا کرنا ہمارا اولین فریضہ ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر مبارک علی "تاریخ اور معاشرہ" میں شناخت کے متعلق لکھتے ہیں:

> "دنیا میں رہنے والے تمام انسان، انسانی گروہ یا جماعتیں ایک جیسی نہیں ہیں بل کہ یہ مختلف نسلوں، ذاتوں اور قوموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک کی علیحدہ شناخت ہے۔ لہذا شناخت کو برقرار رہنا چاہیے۔"(۱۰)

اس طرح کے لوگ اپنی ساری زندگی شناخت اور عدم شناخت کی کش مکش میں گزار دیتے ہیں۔ وہ زندگی کی حقیقت کو مانتے بھی ہیں اور اس سے انکار بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنی شناخت کو تلاش کرتے کرتے زندگی کے ہچکولے کھاتے رہتے ہیں۔ ان کی بے بسی انھیں ایک عجیب سے خوف میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو خوش گوار بنانے کے لیے سو جتن کرتے ہیں مگر کوئی بھی موڑ ان کی زندگی میں ایسا نہیں آتا جو کرب ناک حالات کی بازی پلٹ دے اور وہ نارمل اور پر سکون زندگی گزاریں عام انسان کی طرح۔ مگر ان کا یہ خواب کبھی بھی حقیقت کا روپ نہیں دھارتا۔ شناخت کے لیے بے چین فرد خوب سوچ وبچار کرتا ہے۔ کئی ارادے باندھتا ہے اور بہترین زندگی گزارنے کے لیے ایک مثبت لائحہ عمل تیار کرتا ہے لیکن اگلے ہی لمحے وہ لائحہ عمل سوکھی مٹی کی طرح ہوا میں بکھر کر رہ جاتا ہے۔ اس کی تمام کوششیں بے سود جاتی ہیں۔ کیوں کہ شناخت نہ ہونے کی بد قسمتی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ جس کی وجہ سے وہ مایوسیوں کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ اسے زمین و آسمان گھومتے محسوس ہوتے ہیں۔ اور وہ لاکھ کوشش کے باوجود قسمت کی لکیروں کو اپنی پسند کے مطابق نہیں ڈھال سکتا۔ اور نہ ہی اپنی ادھوری خواہشات کے مطابق چلا سکتا ہے۔ جب اپنی ادھوری شناخت کی بابت انھیں پتہ چلتا ہے تو انھیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان کی وجود پہ بجلی گر گئی ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے ذہنی طور پر مفلوج ہو گئے ہیں۔ یہ خوف ناک حقیقت ان کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے۔ ناول "زینہ" سے شناخت سے متعلق اقتباس ملاحظہ کریں:

> "مارتھا کا بیٹا کہیں خود ہی تو پرواز نہیں لے گیا تھا؟ کیا اسے اپنی اصلیت سے شرمندگی تھی؟ وہ ایک کونے میں بیٹھا خاموشی سے ایک ہی تاثر کے ساتھ سامنے دیکھتا رہتا تھا۔ جو کبھی کبھار اس کی ذہنی صحت کے معمول کے مطابق نہ ہونے کی غمازی کرتا۔"(۱۱)

مارتھا کے بیٹے پر جب اپنی حقیقت منکشف ہوئی تو اسے اپنے پیروں کے نیچے سے زمین کسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسے لگا کہ آسمان اس کے سر پر آگرا ہے۔ کیوں کہ اس کی ماں اور باپ دونوں شادی کے بغیر کئی سالوں سے ساتھ رہ رہے تھے۔ باپ مسلمان اور ماں عیسائی طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ اور لوگ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ شناخت کا مسئلہ ایسے فرد کو قریبی اور خونی رشتوں سے بھی جدا کر دیتا ہے۔ دوسروں کی نفرت بھری نگاہیں دن رات انھیں اپنے جسم میں چبتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ لوگوں سے فاصلے بڑھا دیتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں خوب صورت زندگی گزارنے کے جو خواب سجے ہوتے ہیں وہ انھیں اپنی تکلیف دہ حقیقت معلوم ہونے پر ایک جھٹکے سے بکھرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ انھیں اپنی ذات سے بھی وحشت محسوس ہونے لگتی ہے۔ دن کی روشنی بھی انھیں رات کے تاریک اندھیروں کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ حالات کی بے رحمی اور بے بسی جب ان پر عیاں ہوتی ہے تو ان کی چھٹی حس انھیں خبردار کر دیتی ہے کہ ان کی پوری زندگی سماجی بے راہ روی کی وجہ سے تباہ و برباد ہو چکی ہے۔ انھیں سماج میں نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے جو اس قدر جان لیوا ہوتا ہے کہ وہ اپنی شناخت چھپانے کے لیے گمنامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ عام آدمی کی طرح ان کے لیے ترقی کی راہ میں ان کی شناخت ہمیشہ رکاوٹ بنتی ہے۔ سماج کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ اس طرح کے لوگ خوف کی وجہ سے کرب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کی غلطی نہ ہونے کے باوجود انھیں طعنے تشنے دیئے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ لوگ ہمہ وقت ایک خوف کی کیفیت میں گھِرے رہتے ہیں۔ "ڈاکٹر مبارک علی" اس معاملے پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> "اس صورت میں کمزور گروہ، قوم عدم تحفظ کے احساس سے مستقل خوف اور ڈر کی حالت میں رہتی ہے، اپنی بقا کے لیے یہ کبھی ہجرت کا سہارا لیتی ہے، کبھی سازش کا، کبھی حیلہ و فریب سے خود کو اکثریتی جبر سے محفوظ رکھتی ہے۔"(۱۲)

سماجی رویوں کی بدولت وہ اپنے آپ کو گمنام کر لیتے ہیں۔ تاکہ کوئی ان کی تلخ حقیقت کی وجہ سے انھیں حقارت کی نظر سے نہ دیکھ سکے۔ ان کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے اور ان کے اپنے (خاص کر ماں) ان کی راہ تکتے ہی رہ جاتے ہیں مگر ان کی واپسی ناممکن ہوتی ہے۔ اس طرح کے لوگوں کی اہم علامات تنہائی کی تلاش ہے۔ یہ دوسروں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے۔ کیوں کہ یہ لوگوں سے ملنے سے اور ان کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں۔ اور اگر کسی سے ملنا جلنا بھی چاہیں تو عدم شناخت کی وجہ سے ان کے منہ سے الفاظ نہیں

نکلتے۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی ہمیں ذلیل و خوار نہ کر دے یعنی کسی بھی طرح انھیں ذہنی تسکین حاصل نہیں ہوتی۔ ایسے افراد کم گو اور خاموش فطرت کے ہوتے ہیں۔ وہ ہر وقت اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور ظلم و ستم کے متعلق سوچتے رہتے ہیں اور زندگی کو اپنے لیے ایک مصیبت سمجھتے ہیں۔ اپنی حالت زار پر کبھی ہنستے ہیں اور کبھی روتے ہیں اور یوں ہی ساری زندگی عدم شناخت کے بھاری بوجھ تلے دب کر گزار دیتے ہیں۔ ایسے لوگ ملنسار، باتونی اور دوستوں کے شیدائی بالکل بھی نہیں ہوتے اور نہ ہی سماجی تقریبات میں شامل ہوتے ہیں۔

انسان کی شخصیت اس کی ورثاء اور ماحول کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ماحول سے مراد وہ تمام حالات اور تعلقات ہیں جن سے فرد مسلسل دوچار رہتا ہے۔ اور جو اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ماحول بھی انسان کی شخصیت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انسان ناساز حالات میں بھی حالات کا مقابلہ کرتا ہے۔ ماحول سے مطابقت میں وہ خود کو بھی بدلتا ہے اور کچھ حالات کو بھی بدلتا ہے۔ امریکی مسلمان اقلیت اپنی شناخت چھپانے کے لیے سجدہ تک ڈر کے مارے نہیں کر رہے تھے کہ کہیں دوبارہ کوئی نیا مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔ ناول " طاؤس فقط رنگ " سے شناخت کے حوالے سے اقتباس دیکھیے:

> "چند منٹوں بعد پولیس مین آیا اور مراد کے ہاتھوں اور پاؤں کی بیڑیاں کھول دیں۔ سحیلہ کے دل میں آئی کہ فوراً خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جائے، اس کا شکر ادا کرے، مگر پھر یہ سوچ کر رک گئی کہ اس جگہ پر اپنے مسلمان ہونے کا مزید مظاہرہ نہ ہی کرے تو بہتر ہے۔ اسے پتہ تھا، کسی نے کچھ کہہ دیا یہ اس کی طرف متعصبانہ جملہ پھینکا تو وہ اور مراد، اس کا ڈیڈ تو کچھ نہ کر سکیں گے۔ امریکہ میں مسلمانوں کے خوف زدہ رہنے کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ "[۱۳]

امریکی مسلمان اقلیت کو ان کے جذبات اور خیالات کے متعلق رائے قائم کرنے پر شرمندگی اور خوف محسوس ہو رہا تھا۔ انھیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگ ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کی عزت نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ انتہائی تکلیف دہ حالت میں لب سیئے کھڑے تھے۔ جب انسان اپنی پریشانی کو دور کرنے کے لیے کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا تو یہ کش مکش اور زیادہ ذہنی پریشانی کا باعث بن جاتی ہے اور کش مکش انسان کو پست ہمت بنا دیتی ہے۔ اور وہ رفتہ رفتہ حوصلہ ہار

دیتا ہے۔ مراد اور اس کے خاندان نے امریکہ میں روشن مستقبل کی خاطر مسلسل جدوجہد کی۔ امریکہ کو اپنا ملک سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس سے بہت محبت کی مگر اس کے باوجود ان کی زندگی میں سکون نام کی کوئی چیز نہیں تھی وہ خود کو امریکی باشندوں سے کمتر محسوس کر رہے تھے۔ اور یہ ایسا احساس ہے کہ جس کی بدولت انسان اپنی ذات میں شناخت کی کمی کو شدید طریقے سے محسوس کرتا ہے۔ اور اسے چھپانے کے لیے مخصوص رد عمل کا اظہار کرتا ہے۔ وہ سماجی رویوں کی وجہ سے تھکا تھکا سا رہنے لگتا ہے۔ اس میں کچھ کر گزرنے کی خواہش کم ہو کر سستی نمودار ہو جاتی ہے۔ وہ بیزار اور چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ اسی مرحلے پر اس کے ذہن میں سماج سے بغاوت اور دوسرں سے حسد پیدا ہونے لگتا ہے۔ سماج میں بدنیت لوگوں کی وجہ سے وہ اپنی شناخت کھو دیتا ہے۔ جو آگے جا کر اس کے لیے نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔ اس حوالے سے "آزادی اظہار کے نام پر" میں یوں لکھا ہے "مغرب کے اپنے پیمانے اور دوہرے معیارات ہیں۔ وہ مسلمانوں کے لیے نہایت متعصبانہ رویہ رکھتا ہے۔" (۱۴)

جب انسان حالات کا مقابلہ نہیں کر پاتا تو اسے ناکامی ہوتی ہے تو اس کا فوری نتیجہ احساس محرومی کا پیدا ہونا ہے۔ اور یہ محرومی فرد میں ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ ہیجان احساس کی شدید شکل ہے جس میں وقتی طور پر فرد کا ذہنی اور جسمانی توازن بگڑ جاتا ہے۔ غصے کی حالت میں انسان ذہنی کرب محسوس کرتا ہے اور اس کے ہاتھ پیر بھی اکڑ جاتے ہیں۔ ایسی کیفیت کے دوران انسان میں کچھ وقت کے لیے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ مندرجہ بالا تمام کیفیت امریکی مسلمان اقلیت کی تھی۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی بھی طریقے سے اپنی مسلمان ہونے کی شناخت کو کچھ عرصے کے لیے چھپالیں۔ وہ ایک انتہائی کرب ناک ذہنی اذیت سے گزر رہے تھے جو نائن الیون کے بعد انھیں مسلمان ہونے کی وجہ سے بھگتنا پڑ رہی تھی۔ وہ اپنی ناکامی اور احساس کمتری کو بھلانا چاہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ خود کلامی کے ذریعے خود کو جھوٹی تسلیاں دے کر اور ناکامی کے جواز میں دلائل پیش کر کے شناخت چھپانے کے احساس کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ مگر امریکی سماجی رویے انھیں سب کچھ دوبارہ یاد کروا دیتے تھے۔ اور پھر وہ پہلے والی تکلیف دہ حالت میں لوٹ آتے تھے۔

امریکی مسلمان اقلیت کی شناخت کے متعلق اذیت کے معاملے پر ایک اور اقتباس ناول "طاؤس فقط رنگ" سے ملاحظہ کیجیے:

"اس کے والدین کچھ مطمئن تو ہوئے مگر سر پر حجاب اور کپڑوں پر عبایا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ بیٹے پر پہلے ہی مسلم ٹیررسٹ ہونے کا الزام لگ رہا ہے۔ اب بیٹی بھی بنیاد پرست حلیے میں آگئی۔ کہیں پولیس اور ایف۔ بی۔ آئی ان دونوں باتوں کی آپس میں کڑیاں ملانے نہ بیٹھ جائیں۔ سب بہت ڈر گئے تھے۔ ذرا سا کھٹکا ہوتا تو لگتا پولیس آگئی ہے۔ درواز کھولتے ہوئے وہ جھجکتے کہ کہیں کوئی آفت باہر کھڑی انتظار نہ کر رہی ہو۔ زندگی عجیب سی ہو گئی تھی۔ کچھ صحیح نہ رہا تھا۔ اپنا ملک اپنا نہ رہا تھا، کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو جانے کا ڈر لگا رہتا تھا۔"(۱۵)

مسلمان ہونے کی شناخت چھپانے کی وجہ سے انھیں کچھ عجیب سی محرومی محسوس ہو رہی تھی وہ اس محرومی سے تنہائی اور بیگانگی کا شکار ہو رہے تھے۔ انھوں نے بڑے بڑے خواب سجائے ہوئے تھے۔ لیکن ان کی تکمیل اور تعبیر ہوتی ہوئی نظر نہیں آرہی تھی۔ جس سماج میں ایک طاقت ور اور دوسرا کمزور مقابل آجائے تو ظالم اور مظلوم کے مقابلے اور جنگ میں ہمیشہ جیت ظالم ہی کی ہوتی ہے۔ جب کہ مظلوم ہارنے کے بعد اپنی ذات سے لڑنا شروع کر دیتا ہے۔ کیوں کہ جب سماج میں طاقت ور اور مظلوم آمنے سامنے ہوں تو مظلوم بے بس اور لاچارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مراد اور اس کا خاندان اپنے ساتھ اذیت ناک ہونے والے ظلم وستم سے مزید بچنے کے لیے اپنی شناخت چھپانا چاہتے تھے۔ اس وحشت ذدہ ماحول نے انھیں شناخت چھپانے کی خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ ایک بے یقینی کے عالم میں ادھر ادھر خالی خالی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کہ شاید یہ کوئی ڈراونا یا بھیانک خواب ہو اور جب وہ جاگیں تو سب کچھ پہلے کی طرح نارمل اور حسین ہو۔ اس صورت حال میں اپنے ہونے اور نہ ہونے کا گمان سا لگتا ہے۔ وہ طے نہیں کر پاتے کہ کریں بھی تو کیا کریں۔ کیوں کہ وہ امریکہ کی دی ہوئی شناخت کے محتاج تھے اور جواب ان سے زبردستی چھینی جارہی تھی۔ اب وہ مڑ کر پیچھے جا سکتے تھے اور نہ بھاگ کر آگے۔ آگے کنواں اور پیچھے کھائی والا سین تھا۔ عجیب سے دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیا تھا انھیں ان کی شناخت نے۔ اور وہ اس بھنور سے نکلنے کے لیے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کو بھی کھو بیٹھے تھے۔ انھوں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا جو انھیں کہاں اور کسی موڑ پر لے جائے انھیں بھی کچھ اتہ پتہ نہیں تھا۔

"آزادی اظہار کے نام پر" اس معاملے پر یوں خامہ فرسائی کی ہے:

"جب ایک یہودی داڑھی رکھتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس کے مذہب کا حصہ ہے۔ لیکن ایک باریش مسلمان کو انتہا پسند اور دہشت گرد گردانا جاتا ہے۔ کوئی سکھ پگڑی پہنے تو اسے تہذیب کی علامت کہا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی مسلمان عمامہ پہنے تو اس سے شدت پسندی کی علامت گردانا جاتا ہے۔ ایک عیسائی راہبہ جب اپنے سر کو کپڑے سے ڈھانپتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو خداوند کے لیے وقف کر دیا ہے۔ لیکن جب ایک مسلمان خاتون سکارف لیتی ہے تو مغرب اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔"(۱۶)

شناخت کا مسئلہ امریکی مسلمان اقلیت کے وجود سے نہیں بل کہ زندگی کی ہر پہلو سے جڑا ہوا ہے۔ جو ان کی داخلی و خارجی زندگی کے حالات و واقعات کا باعث بنتا ہے۔ اور اس کا براہ راست اثر ان کی زندگی پر ہوتا ہے۔ اس طرح کے تلخ واقعات کی وجہ سے ان کی زندگیاں بھی تلخ ہوتی جا رہی ہیں۔ حالات انھیں جس طرف لے جاتے ہیں وہ اسی طرف مڑ جاتے ہیں کیوں کہ شناخت جیسے مسئلے سے چھٹکارا پانا آسان نہیں۔ وہ ہجوم میں بھی خود کو تنہا اور اکیلا، مجبور اور بے بس محسوس کرتے ہیں۔ انھیں اپنا آپ اس ملک میں اجنبی اجنبی سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ اور یہ وہ تلخ حقیقت ہے جس سے وہ آنکھیں نہیں چرا سکتے اور نہ ہی انکار کر سکتے ہیں۔ انھیں یہ احساس ہی مار ڈالتا ہے کہ ان کی شناخت کے بغیر زندگی کتنی خالی اور ادھوری سی ہے۔ یہ احساس کمتری انھیں دیمک کی طرح اندر ہی اندر کھانا شروع کر دیتی ہے۔

دوسرے وہ پاکستانی اقلیتی ہندو اور عیسائی افراد جو زبردستی ظلم و ستم کی وجہ سے بنا باپ کی شناخت کے اس دنیا میں آتے ہیں وہ خود کو ذلت کے گڑھے میں گرا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ جب کہ ذلت کے گڑھے میں تو وہ لوگ گرے ہوتے ہیں جو ان کو اس دنیا میں لانے کا سبب بنتے ہیں۔ ان لادینیوں کو احساس گناہ پریشان نہیں کرتا بل کہ اس گناہ کے نتیجے کے طور پر جو اس دنیا میں وارد ہوتے ہیں وہ احساس گناہ محسوس کرتے ہیں اور یہی بات انھیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ایک عجیب سی کوفت ان کے اعصاب پر سوار رہتی ہے۔ کیوں کہ ان کی ذات اور شخصیت کو نام دینے والا کوئی نہیں ہوتا اور یہی وہ لمحہ ہے جب وہ بے بسی کی انتہا پر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس طرح کی اذیت کا شکار پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں سے مروت، خلوص اور حسن اخلاق سے پیش آنا چاہیے۔ تاکہ وہ حوصلہ نہ ہاریں بل کہ اپنے اندر مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کریں۔ انھیں بھی باقی

عوام کی طرح یکساں زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن ان کے لیے یہ دنیا بے رونق ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس طرح کی مصیبت کے شکار پاکستانی، ہندو اور عیسائی اقلیت اور امریکی مسلمان اقلیت سے خصوصی ہمدردی کرنی چاہیے۔ کیوں کہ ہمدردی ایک ایسا جذبہ ہے جس کے تحت ایک شخص دوسرے کی مدد کرتا ہے۔ ہمدردی میں محبت اور خلوص شامل ہوتا ہے۔ ہمدردی اتحاد اور ہم خیالی کا ذریعہ بنتی ہے اور فرد کو وسیع النظر بناتی ہے۔ ہمدردی انسانی سماج کا اہم عنصر اور تمام مذاہب کی قدر مشترک ہے۔

نفرت انگیز گفتگو

اللہ تعالیٰ نے کائنات کو خوب صورت بنایا ہے۔ کہیں بڑے بڑے پہاڑ، کہیں بلند و بالا درختوں کے جھنڈ، کہیں دریاؤں اور سمندروں کی منہ زور لہروں کا جال بچھا دیا، اور کہیں ریگستانوں کے فرش بچھا دیے۔ اسی طرح دنیا میں مختلف مذاہب اور عقیدے کے لوگ بھی پیدا کیے۔ لیکن نسل، مذہب، قومیت، زبان یا رنگ کی حیثیت ثانوی رکھی۔ مختلف عقیدہ لوگوں کو باہمی اتفاق سے رہنے اور نفرت انگیز گفتگو سے بچنے کی تلقین کی۔ اچھی اور اخلاقی گفتگو کے ذریعے ہر انسان دشمن کو بھی دوست بنا سکتا ہے۔ غیروں کو اپنائیت کا احساس دلا سکتا ہے۔ لوگوں کو سیدھا راستہ دکھا سکتا ہے اور ملک میں امن و امان کی فضا قائم کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس سب کے حصول کے لیے ہر فرد کو اپنی گفتگو کے دوران کڑواہٹ کی جگہ شیریں زبان کا استعمال کرنا چاہیے۔ انھیں اپنی گفتگو کے ذریعے یہ احساس نہیں دلانا کہ وہ مذہبی لحاظ سے کم تر ہیں۔ ان باتوں کا خیال رکھنے سے اکثریت اور پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت دونوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا۔ اس لیے تمام پاکستانی عوام کو چاہیے کہ وہ ہر اس بات سے اجتناب کریں جو اقلیتوں کو ناگوار گزرتی ہو۔ اور ہر اس بات سے پرہیز کریں جو ان کی دل آزاری کا سبب بنے۔ ان سے ہمیشہ اچھے اخلاق سے ملنا چاہیے تاکہ وہ بھی نفسیاتی اور ذہنی طور پر تازگی محسوس کریں۔ کیوں کہ نفرت بھرے الفاظ بولنے کے بعد ہمیں یاد بھی نہیں رہتے جب کہ سننے والے کو یہ الفاظ کئی برسوں تک دکھی کرتے رہتے ہیں۔ نفرت انگیز گفتگو کے حوالے سے محمد الیاس کے ناول "کہر" سے اقتباس دیکھیے:

> "خان اسلم کا گھریلو ملازم کرامت اللہ سودا لینے آیا تو مارگریٹ کو دیکھ کر برا سا منہ بنایا اور بولا۔ حافظ صاحب! آپ کی دکان سے مسلمان سودا لیتے ہیں۔ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں لیکن پاک پلید اور حلال حرام کی تمیز تو کرنی چاہیے۔ اندر ہر چیز کھانے پینے کی رکھی ہوئی ہے، اگر آپ احتیاط نہیں کریں گے تو پھر مجبوراً سودا کسی دوسری دکان

سے لیں گے۔ مار گریٹ میں آج وہ پہلے کا ساطنطنہ دکھائی نہیں دیا۔ ورنہ وہ کرامت اللہ کے خوب لتے لیتی۔ وہ آج بجھی بجھی سی تھی۔ "(۱۷)

جس طرح موسم بہار کی رنگینیاں اور رعنائیاں ہر چہرے کو ہشاش بشاش کر دیتی ہیں اسی طرح محبت اور خلوص سے بات کرنے سے اقلیتوں کے دلوں میں نیا جوش، نیا خون گردش کرنے لگتا ہے۔ انھیں اپنے چاروں اطراف بہاروں کا موسم اور خوب صورت رنگینیاں بکھری محسوس ہوتی ہیں۔ کیوں کہ اخلاق اور اچھی زبان کی خوشبو سے دماغ معطر ہو جاتا ہے اور دل کو تسکین ملتی ہے۔ ہر شخص خواہ وہ اکثریت ہو یا اقلیت نفرت سے انگیز گفتگو سے جو ذہنی تکلیف اٹھاتا ہے وہ الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ شگفتہ مزاجی سے پیش آنے سے اقلیتوں کو بھی اپنی طبیعت میں ایک فرحت انگیز اور روح پرور تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ نرمی سے کی ہوئی باتیں دل و دماغ کو مسرت اور سکون کی نعمت عطا کرتی ہیں۔ جس سے طبیعت کا جمود اور مایوسی کی کیفیت دور ہو جاتی ہے۔ نفرت پر مبنی بڑھتے ہوئے واقعات کی روک تھام کے لیے موثر اقدامات کی ضرورت ہے۔ "ول کیملیکا" کا اس بارے میں نظریہ ہے کہ نسلی قومی اقلیتی گروہوں کے ارکان امتیازی گفتگو اور تعصب سے محفوظ نہیں ہیں۔ پاکستانی سماج کے ہر فرد کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ اقلیتوں کی عزت نفس بھی ہمارے لیے بڑی قیمتی چیز ہے۔ اخلاق سے گری ہوئی بات چیت ناقابل معافی عمل ہے۔ اس انداز کی گفتگو پر پابندی اشد ضروری ہے۔ اس طرح کی گفتگو کے مرتکب لوگوں کو کڑی سے کڑی سزا دی جانی چاہیے۔ ارباب اختیار کا فرض ہے کہ وہ اقلیتوں کی عزت نفس اور انھیں تحفظ فراہم کرنے کا بندوبست کریں۔ اس طرح کی تجاویز پر عمل درآمد کرنے سے کافی حد تک کمی واضح ہو سکتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی" تاریخ اور معاشرہ" میں کہتے ہیں:

"پاکستان میں قوم کی تعمیر و تشکیل ان سیکولر بنیادوں پر کی جائے کہ جن میں ہر شہری کے برابر کے مساوی حقوق ہوں اور کسی کو مذہب، زبان، رنگ و نسل کی بنیاد پر کوئی فوقیت نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جب ہی ممکن ہے جب ہم لبرل جمہوریت اور سیکولرازم کی بنیاد پر اپنے معاشرے کو ڈھالیں گے۔ اس دائرے میں رہتے ہوئے ہر جماعت و گروہ اپنے مذہب، اپنی زبان اور اپنی صوبائی شناخت کو بھی برقرار رکھ سکے گا اور ساتھ ہی اس میں ایک اور قوم کا تشخص بھی مضبوط ہو گا۔ "(۱۸)

یہ سب کرنے کا مقصد کسی ملک، قوم یا نظریے کی مخالفت نہیں بل کہ یہ اتحاد امن وعالم کے لیے باعث تقویت اور نوع انسانی کے لیے وجہ سلامتی ہے۔ انسان کے اخلاق حسن معاشرت اور باعمل ہونے کو فوقیت ہونی چاہیے۔ پاکستانی ہندو عیسائی اقلیت کے حوالے سے لسانی وعلاقائی اور مذہبی تعصبات کو ہوا دینے سے گریز کرنا چاہیے۔ کیوں کہ صبر کی زبان اتنی طاقت ور ہوتی ہے کہ ستانے والے کی بنیادوں کو بھی ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ اسلام میں بھی ایسی گفتگو سے جو کسی کے دل دکھانے کا سبب بنے اس سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ انھیں ایسے الفاظ نہ کہے جائیں جن سے ان کے مذہبی جذبات مجروح ہوں۔ اور ان کی دل آزاری ہو۔ ملک دشمن عناصر نفرت انگیز گفتگو کے ذریعے معاملات کو متنازعہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہ لوگ بھی اپنے ملک سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انھیں بھی سماجی رویوں پر شکایت ہوتی ہے۔ اگر پاکستانی سماج کا ہر فرد اپنے اوپر مندرجہ بالا قواعد وضوابط لاگو کرلے تو سماج میں ہر طرف امن وسکون ہو گا اور راوی چین ہی چین لکھے گا۔ ہر فرد کے اپنے ذاتی اختیار میں ہے کہ حسن سلوک کا راستہ اختیار کرے یا دوسروں کی دل آزاری کا سبب بنے۔ کیوں کہ جو بھی راستہ وہ اختیار کرے گا اس کا ذمہ دار وہ خود ہو گا اور اس کی منفی یا مثبت سوچ۔

امریکہ میں رہائش پذیر مسلمان اقلیت کی حالت زار پر نظر دوڑائی جائے تو اندازہ ہوتا ہے یہ امریکہ جیسے لبرل ملک میں رہتے ہوئے ان کے ہاتھوں کس قدر ذہنی اذیت برداشت کر رہے ہیں۔ نائن الیون کے بعد مسلمان اقلیت کا امریکہ میں رہنا انتہائی دشوار ہو گیا ہے۔ " طاؤس فقط رنگ " ناول کے مرکزی کردار مراد کا وہاں رہائش کا مسئلہ ناقابل برداشت ہوتا گیا۔ اسے زندگی گزارنا انتہائی کٹھن اور مشکل محسوس ہو رہا ہے۔ اسے صرف ایک جھوٹی فون کال کی بنا پر پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر جیل منتقل کر دیا گیا۔ امریکن زندگی کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ لوگ نمود و نمائش، مصنوعی زندگی، بے تکلف عادات و اطوار کے دلدادہ ہیں۔ مسلمان اقلیت نے بھی وہاں جاکر اپنی ضروریات زندگی کو بہت زیادہ بڑھالیا ہے جس کی وجہ سے وہ معاشی مسائل میں گھرے رہتے ہیں۔ اس طرز معاشرت نے مسلمان اقلیت کو بھی حقیقی اور قدرتی زندگی سے بالکل علیحدہ کر دیا ہے۔ مسلمان اقلیت فطری عادات اور فطرت سے بہت دور جاچکے ہیں۔ اسی چیز نے ان کے دلوں میں دوریوں اور رنجشوں کو مزید جگہ دے دی ہے۔ امریکہ میں پولیس اور قانون نافذ کرنے والے دیگر اداروں کا بہت بہترین انتظام ہے۔ جس کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کو اپنا احساس تحفظ رہتا ہے مگر مسلمان اقلیت عدم تحفظ کا شکار ہے۔ ذرا سی جھوٹی سی شکایت پر بغیر چھان بین کے نائن الیون کا بہانہ کر کے وہیں پیدا ہونے والے

مسلمانوں کو انتہائی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مراد کی جائے پیدائش امریکہ تھی اور اسے اس بات کا انتہا کا فخر محسوس ہوتا تھا۔ جب اسے صرف مسلمان ہونے کی بنیاد پر دہشت گردی کے جھوٹے الزام میں گرفتار کر لیا تو اسے امریکہ سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی۔ اور رہی سہی کسر نفرت انگیز گفتگو نے پوری کر دی۔ نیلم احمد بشیر کے ناول "طاؤس فقط رنگ" سے اس حوالے سے اقتباس دیکھیے:

"مام یہاں کچھ قیدیوں نے مجھے دہشت گرد پکار کر چھیڑنا، مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا۔ آتے جاتے مجھے مسلم ٹیررسٹ کہہ کر تھپڑ جڑ دیتے۔ میں نے کہا کہ میں تو بارن امریکن ہوں تو انھوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ پھر گارڈز نے آکر مجھے چھڑوایا۔ مراد اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھملا رہے تھے۔"[۱۹]

نائن الیون کے حادثے کے بعد امریکہ میں رہائش پذیر مسلمان اقلیت پر عرصہ حیات تنگ ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کر کے سارا الزام وہاں کی مسلمان اقلیت پر لگا دیا۔ امریکہ شفٹ ہونے کے بعد مسلمان اقلیت اپنی جھوٹی انا کو برقرار رکھنے کے لیے بعض ناجائز رسوم و رواج کو انجام دینا احسن خیال کرتے ہیں۔ جیسے مراد کی فیملی جس میں اس کے والد، والدہ اور اکلوتی بہن سب الگ تھلگ رہتے تھے وہاں کے رواج کے مطابق۔ وقت ایک ایسا بیش قیمت خزانہ ہے جو ایک بار کھو جانے پر دوبارہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ جس طرح دریا کا گزرا ہوا پانی اور ہوا کا جھونکا واپس نہیں آسکتا اسی طرح گزرے ہوئے وقت کو واپس لانا بھی ناممکن ہے۔ وقت مٹھی میں بند اس ریت کی مانند ہے جو لمحہ بہ لمحہ ہاتھ سے پھسلتی جا رہی ہے۔ اور جب مٹھی کھلتی ہے تو وہ بالکل خالی ہوتی ہے اور انسان موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ اگر امریکی مسلمان اقلیت نے وقت پر آنکھیں نہ کھولیں اور ہوش کے ناخن نہ لیے تو ان کے پاس سوائے پچھتاوے کے کچھ بھی نہیں بچے گا۔ جس طرح مراد کی ماں، باپ، بہن اور خود مراد ۔ امریکہ نے ان کے خاندان کو کیا دیا صرف ایک کھوکھلی زندگی۔ "آزادی اظہار کے نام پر "س معاملے پر یوں لکھا ہے:

"مغرب جو آزادی اظہار، آزادی رائے، آزادی تقریر و تحریر، حقوق انسانی، امن وآشتی، روشن خیالی، علم و شعور، وسعت نظر، تحمل، برداشت، عدم تشدد، مذہبی رواداری، شہری آزادی، فہم و تدبر، جمہوریت، حقوق نسواں اور دنیا بھر میں سب سے زیادہ مہذب ہونے کا پرچارک اور بلاشرکت غیرے چیمپین بننے کا دعویدار ہے۔ یہاں

ہر رنگ، ہر نسل، ہر قوم کے افراد رہتے ہیں۔ جنھیں یکساں حقوق حاصل ہیں۔ مگر مسلمانوں کے ساتھ اسلام دشمنی کی آڑ میں نفرت انگیز اور متعصبانہ رویہ رکھا جاتا ہے۔"(۲۰)

امریکن شہری مسلمان اقلیت کے معاملے میں بالعموم متعصب اور تنگ نظر ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں ان کے خیالات، نظریات اور عقائد وسعت نظر سے محروم ہوتے ہیں۔ اور مسلمان اقلیت اس ملک کو چھوڑنے کے بجائے سارا الزام تقدیر کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انھیں سخت مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ ہر وقت عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا رہتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے خصوصی منشور نمبر چار میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ ریاست جہاں ضروری ہو ایسے اقدامات کرے کہ اقلیتی گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے تمام انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔ بغیر امتیازی سلوک کے اور قانون کی نظر میں برابری کی سطح پر۔ الغرض بے شمار مسائل ہیں جن کا تعلق انسانی زندگی سے اس طرح جڑا ہوا ہوتا ہے کہ ان کا جدا ہونا مشکل لگتا ہے۔ انسان کی خواہشات جب اس کی استطاعت سے بے قابو ہو جائیں تو اسے منہ کے بل گرنے میں دیر نہیں لگتی۔ ناول " طاؤس فقط رنگ " سے ایک اور اقتباس دیکھیے:

"دو اور ملزم پولیس کے ہمراہ مراد کے قریب سی گزرے اور اسے چھیڑ کر کہنے لگے دیکھو مسلم ٹیررسٹ کی ماں بھی آئی ہوئی ہے۔ تم لوگ اپنے ملک واپس کیوں نہیں چلے جاتے۔

Hey you we hate you

سجیلہ اور مراد ضبط کر کے رہ گئے۔ کچھ کہتے تو وہ قیدی مار پیٹ کر سکتے تھے۔۔۔۔۔ اس لیے مراد خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔"(۲۱)

امریکہ میں رہنے والے مسلمان اکثریت کی زندگی جہاں کچھ روشن پہلو رکھتی ہے۔ وہاں تاریک پہلو بھی موجود ہیں۔ وہاں کے لوگوں کی زندگی دنیاوی زندگی کے چکر میں بہت مصروف روپ دھار چکی ہے۔ پاکستانی مسلمان اقلیت اپنے بچوں کو روشن مستقبل دینے کی خاطر امریکہ کو پیارے ہوئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ وہاں کی سہولتیں اور آسائشوں نے انھیں بری طرح جکڑ لیا لیکن آہستہ آہستہ جب حقیقت عیاں ہوتی گئی تو پھر وہ خالی ہاتھ ملتے رہ گئے۔ مراد جسے امریکی ہونے پر نہایت خوشی تھی اب حسرت بری نگاہوں سے

ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اور امریکہ جیسے پسندیدہ ملک سے نکل بھاگنے کے لیے پناہ گاہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ جب تک اس کو اس طرح کی نفرت انگیز گفتگو سننے کو نہیں ملی تھی وہ بہت مسرور اور شادمان تھا مگر اب وہی شادمانی اس کے لیے زحمت بن چکی تھی۔ اس کی امریکن بارن خود اعتمادی آہستہ آہستہ احساس کمتری میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ ہر طرف اسے اپنے لیے جال بچھا ہوا نظر آرہا تھا۔ اب اسے امریکہ میں سکون کے لمحات کم ہی میسر آرہے تھے اور پھر اس طرح کے دل دکھا دینے والی اور بد ظن کرنے والی گفتگو کی وجہ سے بار بار کوفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اسی حوالے سے "آغا ضمیر حسین" رقم طراز ہیں: "برسوں سے وہاں رہنے والے پاکستانی اچھوت بن کر رہ گئے۔ ہر بستی، بلاک، بازار اور دفاتر میں پاکستانیوں کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔"(۲۲)

امریکہ نے سائنس کی بدولت زمان اور مکان کے نظریات یک لخت تبدیل کر دیے ہیں۔ راکٹ اور میزائلوں کے ذریعے ستاروں پر کمندیں ڈال چکا ہے۔ چاند کو تسخیر کر چکا ہے۔ بے شمار آسائشیں حاصل کر کے جسمانی کیف میں محو ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کے باسی مسلمان اقلیت ذہنی سکون اور اطمینان قلب سے کوسوں دور ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد مسلمان اقلیت نے امریکہ کے خوب صورت چہرے سے نقاب ہٹنے کے بعد اس کی اصلیت اور روشن خیالی کا چہرہ واضح طور پر دیکھا لیا ہے۔ امریکہ نے اپنے سیاہ چہرے پر جو سیکولرازم اور جمہوری اقدار کا سیاہ نقاب چڑھایا تھا وہ ایک جھٹکے میں اتر گیا۔ نفرت کی ہوا کے جھونکوں سے مسلمان اقلیت بلبلا اٹھے۔ ان کی زندگی دہشت گردی جیسی نفرت انگیز گفتگو سے مزین کر کے اسے جہنم کا نمونہ بنا دیا۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے چاروں جانب سیاہ بادل منڈلا رہے ہیں۔ جو کسی بھی وقت ایک آفت کی صورت میں ان پر برس پڑیں گے۔ یعنی کہ چمک دار چہرے مرجھا گئے اور وہ حسرت اور دکھ بھری نظروں سے یہ سب ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

مختصر یہ کہ اقلیتوں کے لیے وہی ممالک اور افراد مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ جن کے دلوں میں ان کے لیے استحکام و بقا کے لیے خدمات سر انجام دینے کا جذبہ موجود ہو اور وہ انسان دوستی کی روح سے معمور ہوں۔ کیوں کہ اس میں بنیادی طور پر رضاکارانہ جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہمارا مقصد ہونا چاہیے کہ اچھا اور مفید شہری بن کر اپنے ملک میں آباد ہندو اور عیسائی اقلیت کی ترقی اور بہبود کے لیے خوش اسلوبی اور دیانت داری کے ساتھ حسب استطاعت خدمات انجام دیں۔ ان اقلیتوں کو بھی وطن عزیز پاکستان سے بے پناہ محبت و پیار ہے۔ گلاب کا پھول بکھرنے کے بعد بھی خوشبو دیتا رہتا ہے اور شاخ سے ٹوٹنے کے بعد بھی لوگوں کی خوشیوں

میں شریک انھیں مسرتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ یعنی گلاب کا پھول لوگوں میں خوشیاں بکھیرنے کے لیے اپنی خوشبو کے عمل کو جاری رکھتا ہے۔ ہمیں بھی پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت کے حوالے سے گلاب کے پھول سے قربانی کا درس لینا چاہیے۔ اور ان کے لیے نفرت انگیز گفتگو سے اجتناب کا جذبہ ہمیشہ موجود رہنا چاہیے۔ اس طرح سماج میں انتشار بھی نہیں پھیلے گا اور اقلیت بھی دکھی نہیں ہوں گے۔ لہذا کسی بھی فرد کو اجازت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اقلیتوں سے ایسی گفتگو کرے جس سے اشتعال پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی دل آزاری کا سبب پیدا ہو۔

مذہبی اجارہ دار طبقہ

علم ایک ایسا انمول خزانہ ہے جس کی قیمت مقرر نہیں کی جاسکتی۔ اس کو تو نہ دیمک چاٹ سکتی ہے اور نہ ہی پانی کی سرکش لہریں اپنے ساتھ بہا کر لے جاسکتی ہیں۔ اور نہ لوہے کو پگھلا دینے والی آگ اس کا کچھ بگاڑ سکتی ہے اور نہ کوئی چور اس کی کوئی چوری کر سکتا ہے۔ کیوں کہ علم کا تعلق روح سے ہوتا ہے جو جسم کو بھی اخلاقی بیماریوں سے نجات دلانے کی سعی کرتا ہے۔ جسم تو مٹی میں مٹی ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ جب کہ علم کی خوشبوئیں ذہنوں کو عرصہ تک معطر رکھتی ہیں۔ یہ علم ہی کا فیض ہے کہ جن لوگوں نے علم سے محبت کی ان کو علم نے حیات جاوداں سے ہم کنار کر دیا۔ اسی علم کی بدولت دنیا کے تمام مذاہب کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب ہو اس کو قائم و دائم رکھنے کے لیے لوگوں کا ایک خاص طبقہ ہوتا ہے جو دینی علم حاصل کرنے کے بعد اپنے آپ کو اس مذہب کا وارث خیال کرتا ہے۔ مثلاً مسلمانوں میں مولوی ،ہندوؤں میں برہمن اور عیسائیوں میں پادری وغیرہ۔ دینی علم حاصل کرنے والے مولوی صاحبان کی بھی کئی اقسام ہوتی ہیں۔ کچھ مطلب پرست، کچھ منافق اور کچھ مولویوں کے بھیس میں حاسد اور ملک دشمن۔ اور کچھ مولوی صاحب ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں مولوی صاحب کہنے پر فخر محسوس ہوتا ہے۔ جو دینی علم حاصل کرنے کے بعد خود بھی اور باقی لوگوں کو بھی راہ مستقیم پر چلاتے ہیں۔ لیکن جو ملک دشمن اور شر پسند ہوتے ہیں۔ وہ مذہب پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے بعض اوقات اپنے ذاتی مفادات کی خاطر دوسرے مذاہب کے لوگوں کا کوئی لحاظ اور خیال نہیں کرتے۔ یہی طبقہ اکثریت اور اقلیت کے درمیان فرقہ واریت کے عناصر کو جنم دیتا ہے۔

ناول" بھاگ بھری "میں" صفدر زیدی" نے ایک نام نہاد مولوی کے مکروہ چہرے سے نقاب اتارا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"عدالت کو معلوم ہوا ہے کہ ہمارے مجاہد ساتھی جناب خالد خراسانی ولد الزنا ہیں۔ شرعی عدالت کا یہ فرض ہے وہ غور کرے کہ کیوں نہ ان کی والدہ ماجدہ پر شرعی حد جاری کی جائے تاکہ فرض اسلامی سے سبک دوش ہو کر اللہ کی رضا حاصل کی جا سکے۔ ۔۔۔عدالت کی تعارفی کاروائی کے یہ الفاظ سن کر خالد کے رگ وپے میں غصے سے خون کھولنے لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ملا سواتی اپنی جنسی ہوس میں ناکامی کا بدلہ اتنے برسوں بعد اس طرح لے گا۔۔۔ آپ کا نام کیا ہے؟اس نے جواب میں کہا۔

بھاگ بھری۔

کیا فضول سا نام ہے۔۔ کفر کی بو آتی ہے اس نام سے!۔۔۔

مسماۃ بھاگ بھری آپ پر الزام ہے کہ آپ نے خالد کو زنا کے نتیجے میں پیدا کیا ہے؟

خالد شرم اور بے عزتی کے مارے سر نہیں اٹھا پا رہا تھا۔

ملا سواتی ایک تیر سے دو شکار کر رہا تھا۔ وہ خالد کو بھی بے عزت کر رہا تھا اور اس کی ماں کو بھی۔"[۲۳]

اس ناول کے ذریعے "صفدر زیدی" نے مولوی کے بد کردار اور غاصب کردار کو دکھایا ہے۔ جو ہندو اقلیت ساون (خالد خراسانی) سے بدلہ لینے کے لیے اس کی ماں بھاگ بھری اور اسے بھرے مجمعے میں بے عزت اور رسوا کرنے کے ساتھ ساتھ ساون کو سب کی نظروں میں گرانا چاہتا ہے۔ ملا سواتی کے گھناؤنے چہرے کو سب کے سامنے عیاں کیا ہے صفدر زیدی نے۔ مندرجہ بالا اقتباس مولوی کے زہریلے پن کو ظاہر کر رہا ہے۔ جو اسلام کی آڑ لے کر زہر اگل رہا ہے۔ یہ حال ہے اس نام نہاد مولوی کا جو استحصال کر رہا ہے سماج کا، ہندو اقلیت بھاگ بھری اور اس کے بیٹے ساون کا اور ساتھ مذہب کا۔ سارے سماجی مسائل انھی لوگوں کے پیدا کردہ ہیں۔ کیوں کہ دنیا کے نزدیک یہ لوگ دین کی حفاظت کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس لیے لوگ ان کی گھناؤنی سوچ سے بے خبر ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں ایمان کی درستی سمجھتے ہوئے۔ کیوں کہ دینی علم انسان کو

پختگی کردار عطا کرتا ہے۔ اسے اچھے اور برے کی تمیز سکھاتا ہے۔ اس کی بدولت ہی انسان اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اخلاقی، سماجی اور معاشرتی برائیوں کا سراغ لگا کر ان کے درپے ہو جاتا ہے۔ اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق اپنے اخلاق و سیرت اور کردار کو ڈھالے تاکہ کہیں وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق نہ ٹھہرے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ ساتھ کچھ اخلاقی قوانین و ضوابط بھی بنائے گئے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر انسان اپنی دنیا اور آخرت کو سنوار سکتا ہے۔ بھاگ بھری پر پہلے ہی مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے اور ساتھ ہی غلامی کی سیاہ رات کے اندھیروں میں قید تھی۔ اقوام متحدہ نے بھی اپنے تمام رکن ممالک کو اس بات کا پابند کیا ہے کہ وہ اقلیتوں پر کوئی جبر نہ کریں۔ اس کے لیے اقوام متحدہ نے ۱۸ دسمبر ۱۹۹۲ء میں ایک خصوصی منشور پاس کیا جسے قومی، علاقائی، مذہبی اور لسانی اقلیتوں کا نام دیا گیا۔ منشور نمبر ایک میں واضح لکھا ہے کہ ریاست اقلیتوں کے وجود کے تحفظ کو یقینی بنائے اور انھیں مذہبی تحفظ ہر حال میں مہیا کریں۔ اس مسئلے کے متعلق "سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں" میں یوں لکھا ہے:

> "اقلیتوں کے ساتھ برتے جانے والے رویوں کی اصلاح مذہب کی درست تفہیم کے بغیر ممکن نہیں۔ گروہی عصبیت پر مبنی رویہ، مسلمانوں کے لیے خیر کا باعث بن سکتا ہے نہ غیر مسلموں کے لیے۔ مذہب کو گروہی فخر کا سبب سمجھنے کے بجائے ہدایت کا ذریعہ سمجھنا چاہیے۔ مذہب کو فخر کا سبب سمجھنے کی نفسیات، دوسرے مذاہب کے بارے میں نفرت اور حقارت کا رویہ پیدا کرتی ہے۔ ہر موقع پر اپنی برتری کا احساس غالب رہتا ہے۔۔۔۔ آپ کے دل میں دوسرے مذاہب پر عمل پیرا ہم وطنوں کے لیے خیر خواہی اور محبت کا جذبہ بیدار ہو گا تو دوسری طرف ہم ایک با اخلاق قوم کے منصب پر فائز ہونے کے لائق ہوں گے۔ پاکستانی قوم کی نفسیات کو مذہبی فخر جیسے منفی احساس سے محبت آمیز خیر خواہی کے مذہبی احساس میں بدلے بغیر رویوں کی بہتری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔" (۲۴)

بھاگ بھری میں مولوی ہندو اقلیت کے حقوق کو پامال کرتا نظر آ رہا ہے۔ اور اس کا منفی کردار بالکل واضح دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے لباس اور ظاہری حلیے سے اس کی اصلیت کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ مولوی صرف اپنا مفاد دیکھتا ہے اور بھاگ بھری کو اسلام کے نام پر ڈراتا دھمکاتا ہے۔ اور وہ انسانیت کی تذلیل کرنے پر فخر محسوس کر رہا ہے۔ اس طرح کی قبیح حرکتوں سے اقلیتوں کی تمام امیدیں ماند پڑ جاتی ہیں اور ان کی

ہمت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔مایوسی اور بددلی کے اس نازک دور میں مولوی حضرات کا فرض بنتا ہے کہ وہ پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت کو تحفظ فراہم کرنے میں اپنے قول و فعل سے مدد گار بنیں نہ کہ خود ان کو مشکلات کے چنگل میں پھنسانے کے لیے اپنے آپ کو گنہگار کرتے پھریں۔ ان کی عزت و آبرو کو روندنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سماج پر کلنک کا ٹیکہ ہیں ایسے نام نہاد مولوی۔ ہندو اقلیت بھاگ بھری اور اس کی بیٹے کی عزت کا جنازہ نکالنے کے لیے اس مفاد پرست ملا سواتی نے مذہب کا سہارا لے کر انھیں سماج کی نظروں میں گرانے کی بھرپور کوشش کی۔ اور باقی تمام لوگ اس ظلم کو دیکھتے ہوئے یوں گونگے، بہرے بن گے اور ان کی زبانیں خاموش رہی تو اس لیے کہ ان کے نزدیک یہ لوگ دین کو زیادہ بہتر طریقے سے جانتے اور سمجھتے ہیں۔ ملا سواتی کی مذہبی اجارہ دری کا ایک اور اقتباس "ناول بھاگ بھری" سے دیکھیے:

> "تم کو اپنی بات صحیح ثابت کرنے کے لیے چار گواہوں کی ضرورت ہوگی ورنہ تمہاری بات سچ نہیں مانی جائے گی۔۔۔ تمہارے خیال میں عورت کو ہر وقت چار گواہ ساتھ رکھنے چاہیے تاکہ جہاں ضرورت ہو پیش کیے جا سکیں۔۔۔ میں بطور قاضی شرع حکم جاری کرتا ہوں کہ مسماۃ بھاگ بھری کو اس وقت تک سنگسار کیا جائے کہ جب تک اس کی جان نہ نکل جائے۔ سنگساری کے عمل سے پہلے ان کو سو کوڑے مذہب کا مذاق اُڑانے کے جرم میں مارے جائیں۔۔۔"(۲۵)

مولویوں کا ایک طبقہ مسلمانوں میں محض فتنہ برپا کرنے کے لیے بیٹھا ہوا ہے۔ یہ مولوی دین کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ بل کہ اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کی بصیرت اور معاملہ شناسی پر بھی سوال اٹھائے جانے چاہئیں جو سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی ایسے ملک دشمن مولویوں کے ہاتھوں یرغمال بن جاتے ہیں۔ مولوی حضرات کو نہایت خوش اخلاق، ملنسار، سادہ اور قناعت پسند ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ پاکستان کا سچا خیر خواہ ہونا چاہیے۔ ان کا اٹھنے والا ہر قدم پاکستان کی سلامتی، ترقی اور بہتری کے لیے ہو۔ ان میں پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت کیلیے ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہونی چاہیے۔ انھیں ملک دشمن عناصر کی باتوں میں آکر اپنے ذاتی مفاد کو حاصل کرنے کی خاطر ملک میں اس طرح کے کاموں سے بدامنی پھیلانے سے ہر ممکن صورت پرہیز کرنا چاہیے۔

اس حوالے سے احمد سلیم "پاکستان اور اقلیتیں" میں لکھتے ہیں:

"اقلیتوں کے حوالے سے جتنی بھی خلاف ورزیاں چاہے وہ حکومتی سطح پر ہوں یا غیر حکومتی، مذہبی انتہا پسند اداروں کی جانب سے وہ اقلیتوں کے حقوق سلب کرنے کی بنا پر ہوتی ہیں۔ اور اس میں باقاعدہ طور پر تشدد کا رویہ رکھا جاتا ہے۔"[۲۶]

مذہب کے نام پر بلیک میل کرنا بعض انتہا پسند مولوی حضرات کا سب سے مؤثر ہتھیار ہے۔ جس کے ذریعے اقلیتوں میں خوف و ہراس پھیلایا جاتا ہے۔ نفرت و بدگمانی کا احساس پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ امن و امان کے مسئلے کو سنگین بنا کر سماج میں بے اطمینانی پیدا کرنا اور ان غیر اخلاقی حربوں کے استعمال سے سماجی اقدار کو پامال کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے تخریب کار مولوی افرا تفری پھیلا کر من مانی کاروائیاں کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ اقلیتوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو۔ کسی سماج یا ملک میں جہاں مختلف فرقوں کے لوگ بستے ہوں ان میں اپنے اعتقاد سے جذباتی لگاؤ کے باعث دوسرے اعتقاد والوں کے خلاف نفرت تشدد کی حد تک موجود ہو تو فرقہ ورانہ تصادم ناگزیر ہے۔

جب نفرت کی شدت ہوش و حواس کو باختہ کر دے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کو تشدد سے اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے تو اس طرح کے مسائل جنم لیتے ہیں۔ ایسا سماج جہاں سماجی ناانصافی کو ختم کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو لوگ احتجاج پر اتر آتے ہیں۔ اور عام مشاہدے کی بات ہے کہ جس سماج سے اخلاقی یکسوئی اور انسانی اقدار کا پاس ختم ہو جائے تو وہاں لوگ بے بسی کے عالم میں شکست و ریخت پر اتر آتے ہیں۔ ناول "زینہ" میں بھی مولوی صاحب کا کردار بہت شر پسندانہ کردار ہے۔ پاکستانی سماج میں مولوی صاحب کو دین کا پاسبان مانا جاتا ہے۔ نیکی کی طرف راغب کرنا اور برے کاموں سے بچنے کا درس دینا ان کی بنیادی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں وہ مذہبی اجارہ دری کا باعث بن رہے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مولوی صاحبان کے بارے میں زیادہ تر لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ وہ بہت پاک باز، دین پر عمل کرنے والے ہیں۔ لوگ انھیں اپنے لیے نمونہ بنا لیتے ہیں۔ ناول "زینہ" سے مذہبی اجارہ دری کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے:

" تبھی ایک اور مہنگی گاڑی آئی جس میں سے ایک پادری نیچے اترا اور جھوٹے وقار کے ساتھ چلتا ہوا اسٹیج پر پہنچا۔۔۔ اور پھر ایک بزرگ مولوی نے جلسے کا مقصد بتایا کہ یہ

ایک بین المذاہب کھلی کچہری ہے جس میں اقلیتوں کے ساتھ ناانصافی کیے جانے کا الزام لگانے والوں کے خلاف فرد جرم عائد کی جائے گی۔۔۔ہمارے ملک میں کسی اقلیت کے ساتھ کبھی ناانصافی نہیں کی گئی۔۔۔ یہاں ایسے دو غیر اہم لوگ موجود ہیں جو سمجھتے ہیں کہ وہ اسلامی معاشرے میں تبدیلی لاسکتے ہیں۔ ہم آج انھیں یہ بتاتے ہیں کہ وہ مملکت خداداد پاکستان میں اکیلے ہیں، کوئی ان کے ساتھ نہیں کیوں کہ یہاں کہیں بھی امتیازی سلوک نہیں برتا جاتا۔ بزرگ مولوی نے مجمع کی طرف استفہامیہ نظر سے دیکھا۔۔۔ اب میں ہمارے قابل احترام مسیحی عالم جناب ایمانول مانی صاحب سے گفتگو کرنے کی گزارش کروں گا۔ میرے اندر نفرت کی ایک لہر اٹھی۔ پہلے مولوی نے ہمیں غلط ثابت کیا اور اب پادری کی باری تھی۔"(۲۷)

مندرجہ بالا اقتباس میں ایک بار پھر مولوی صاحب کی بڑی واضح تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہاں پر ناول نگار نے مولوی صاحب کا جو حلیہ دکھایا ہے وہ جیسے کوئی بہت بڑا نیک، بزرگ اور صوم وصلوۃ کا پابند اور نہایت دین دار انسان ہو۔ اور ہر وقت خدا تعالیٰ کے احکامات پر عمل پیرا ہو بل کہ یہاں تو انھوں نے لالچ دے کر عیسائی اقلیت کے مذہبی رہنما پادری کو بھی اپنے ہی مظلوم لوگوں کے خلاف بولنے پر رضامند کر لیا۔ مولوی اور پادری دونوں کے گٹھ جوڑ نے عیسائی اقلیت کے حق میں بولنے والوں کو جھوٹا قرار دے دیا۔ وہ دونوں اقلیت دشمن کا کردار بخوبی ادا کر رہے تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ دونوں مل کر اپنے اپنے دین کے احکامات کے مطابق عیسائی اقلیت کے وجود کو تحفظ فراہم کرتے اور اپنے ذرائع وسائل کو بطریق احسن بروئے کار لاتے۔ لیکن وہ دونوں مذہب کا لبادہ اوڑھ کر سازشی گروہ کے آلہ کار بن گئے۔ مولوی اور پادری اگر عیسائی اقلیت کا حق وسچ میں ساتھ دیتے، ان کا دفاع کرتے، تو ان کے اندر ایک نئی روح پھونکنے کا سبب بن جاتے۔ مگر وہ تو اپنے ناقابل معافی عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بظاہر نیک سیرت بننے کا ڈرامہ کر رہے تھے۔ "ڈاکٹر مبارک علی" کے مطابق:

"ہم دوسرے مذہبی فرقوں کے عقائد کا احترام نہیں کرتے ہیں، اور انہیں راہ سے بھٹکا ہوا سمجھ کر ان کے خلاف ہو جاتے ہیں، اس سلسلے میں علماء کی تقاریر، ان کی کتابیں، اور پمفلٹس لوگوں کے دلوں میں نفرت اور غصہ کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔"(۲۸)

اقلیتوں کو ذات پات کے گورکھ دھندے میں الجھا کر اس مذہبی اجارہ دار طبقے کی جانب سے انھیں اس قدر ستایا اور ذلیل و خوار کیا جاتا ہے کہ وہ مجبور ہو کر اپنے حق سے دستبردار ہو کر پیچھے ہٹنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کے جائز حقوق کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ پادری اور مولوی دونوں نے گٹھ جوڑ کر کے عیسائی اقلیت کو جائز حقوق سے محروم کرنے کی سازشی گروہ سے اچھی خاصی مالی امداد حاصل کی ہو گی۔ اس لیے اقلیتوں کو ان کے جائز حقوق سے بھی فائدہ اٹھانے نہیں دیا جاتا۔ عیسائی اقلیت اپنی زبوں حالی دیکھ کر اندر ہی اندر کڑتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنا نصب العین بنانا چاہیے اور اپنی تمام تر کوششوں کا رخ اس مقصد کی طرف پھیر دینا چاہیے کہ پاکستانی عیسائی اقلیتوں کی ناگفتہ بہ حالت کو سنوارا جائے۔ اگر پاکستانی اکثریت پاکستانی اقلیت کے ساتھ اتحاد اور یکجہتی کا اظہار کرے تو اقلیتیں بھی ان چند شر پسند مولوی اور پادری حضرات اور مذہب کے ٹھیکے داروں کے خلاف احتجاج کر سکتی ہیں تا کہ انھیں دوبارہ اس طرح کی جارحیت کی جرات نہ ہو۔ پاکستان کے آئین میں پاکستانی، عیسائی اقلیتوں کو آزادی، جمہوریت، مساوات، انصاف وغیرہ تمام حقوق حاصل ہیں۔ لہٰذا پاکستانی اقلیتوں کو اپنے مذہب کے مطابق چلنے، اس کی حفاظت کرنے اور اپنی روایات کو ترقی دینے کی بھرپور آزادی حاصل ہے اسی حوالے سے ناول "زینہ" سے اقتباس دیکھیے:

> "ٹی وی کے مطابق ابھی تک وہاں جنگ کی کیفیت تھی اور پولیس کا کردار خاموش تماشائی والا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مولوی اور پادری وہاں آئے ہی حالات بگاڑنے تھے اور اس کا تمام الزام میرے اور مارتھا کے سر دھرا جا رہا تھا۔"(۲۹)

مولوی صاحب پاکستان میں ایسے محترم رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں کہ لوگ ان کی دکھائی ہوئی راہ کو من و عن تسلیم کرتے ہیں۔ ناول "زینہ" کے مولوی اور پادری نے اپنی مذہبی اجارہ دری قائم کی ہوئی ہے اور وہ اکثریت کو اقلیت کے خلاف گمراہ کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ اور اپنے آپ کو جلوس کے سامنے مذہب کے پیامبر کے طور پر شایان شان طریقے سے پیش کرنے میں مصروف ہیں۔ عیسائی اقلیت کے حق میں آواز اٹھانے والوں کے خلاف جوش و خروش کے ساتھ تقریر کر رہے ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوئی بل کہ الزام تراشی کی جا رہی ہے۔ جو کہ انتہائی قابل صد افسوس امر ہے۔ کیوں کہ ان جیسے لوگوں کو ایسی سازش میں شریک کار بننا اخلاقاً زیب نہیں دیتا۔ اس طرح کے نام نہاد لوگ اپنے مفاد کی خاطر

کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ انھیں دوسروں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا اور ان کے جذبات سے کھیلنا ایک معمولی کھیل ہی لگتا ہے۔ اس معاملے پر "ڈاکٹر مبارک علی" کا کہنا ہے:

> "معاشرے میں اب بھی ان کا اثر و رسوخ ہے۔ جب بھی عام آدمی کو کوئی مذہبی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو وہ فتویٰ لینے کے لیے ان کی طرف رجوع کرتا ہے اور ان کے فیصلوں کو تسلیم کرتا ہے۔"(۳۰)

لوگوں کو لگتا ہے کہ انسان ایک باعمل اور باعلم عالم کے پاس چند لمحے گزار دے تو عالم کی بات اور اس کے علم کے فیضان سے قلب و نظر کو وسعت حاصل ہوتی ہے اور ذہن روشن ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی تمام بند گرہیں بھی کھل جاتی ہیں۔ ان کی خوابیدہ صلاحیتیں کام کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ اور ان کے دل سے کینہ، غرور، حسد، لالچ اور دوسروں کے حقوق سلب کرنے جیسی بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور حقیقت میں ایسا ہے بھی۔ اور ایسے مولوی صاحبان پاکستان کے لیے باعث فخر ہیں۔ مگر ان چند ملک دشمن اور شر پسند مولوی حضرات نے ان کا نام بھی خراب کیا ہوا ہے۔ "ڈاکٹر مبارک علی" مزید لکھتے ہیں: " اس وقت پاکستان میں صورتحال یہ ہے کہ روایتی اور راسخ العقیدہ علماء معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں۔"(۳۱)

مذہبی اجارہ دری بھی ذاتی مفادات کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ مذہب کی آڑ میں وقت کے ساتھ ذاتی مفادات کے حصول کے لیے مذہب کے اصول و ضوابط، خیالات، نظریات، نام نہاد مذہبی دعوے داروں کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ وہ مذہب کا نام لے کر موم کی ناک بنائے ہوئے ہیں۔ ہماری اس فانی دنیا میں فانی چیزوں کی قدر ان کے فوائد کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ جو چیز جس قدر فائدہ مند ہو گی اس کی افادیت کے پیش نظر اس کا استعمال اور قدر و منزلت بھی زیادہ ہو گی۔ بظاہر ان شاہ صاحب کے پر نور چہرے سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں مگر انھوں نے نوجوانوں کے ذریعے رمضان جیسے بابرکت اور مقدس مہینے میں ہندو اقلیت کے ساتھ ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ ان کا کروڑوں کا کاروباری مراکز تباہ و برباد کر دیا۔ اس طرح کے کاموں سے سماج میں مجموعی طور پر ناانصافی پھیلتی ہے۔ سماج میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ کئی لوگ شاہ صاحب جیسے بہادر لوگوں کو شیر اور چیتا کے لقب سے پکارتے ہیں۔ اور پھر وہ چیتا بن کر پاکستانی ہندو اقلیت کی زندگی بھر کے سرمائے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور پھر ہر چیز تہس نہس کر دیتے ہیں۔

ناول "راکھ" سے اس کے حوالے سے اقتباس ملاحظہ کیجئے:

"گروراجن نگر کے باہر ہندو اور سکھ دوکانداروں نے اپنی دکانوں کے چوبی دروازوں پر ٹین کی چادریں چڑھا کر انھیں آتش زنی سے مکمل محفوظ کر لیا تھا اور کس طرح رمضان کے مقدس مہینے میں کرفیو کے باوجود شاہ صاحب تھانیدار نے مسلمان نوجوانوں کے ایک گروہ کو ان دکانوں کے دروازے توڑ کر انھیں لوٹ لینے کی اجازت دی تھی۔ اور خود ہمہ وقت پہرہ دیتے رہے اور اس دوران کسی کافر کی گولی ان کے سینے کے آر پار ہو گئی اور جب جان کنی کے عالم میں لوٹ مار کرنے والے نوجوانوں نے ان کے حلق میں پانی کے چند قطرے ٹپکانے کی کوشش کی تو شاہ صاحب نے اشارے سے منع کر دیا اور نحیف آواز میں فرمایا، میرا روزہ ہے۔"(۳۲)

ہندو اقلیت پاکستان کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ انھیں بھی پاکستان سے بے حد توقعات وابستہ ہیں۔ لہٰذا تمام لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنے ملک کی ترقی اور ترویج میں اقلیتوں کو بھی شانہ بشانہ ساتھ لے کر چلیں۔ اور جہاں کہیں بھی ان پر ظلم وزیادتی ہو رہی ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرنے میں ان کا ساتھ دیں، اور انھیں تحفظ کا بھرپور احساس دلائیں۔ مذہبی اجارہ دار طبقے سے انھیں بچانے کی بھرپور کوشش کریں۔ اس کے لیے ہم پر یہ نہایت اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم رسمی طور پر نہیں بل کہ انسانیت کے جذبے اور احساس ذمہ داری سے انتہا پسند لوگوں سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ کیوں کہ اصل چیز احساس ذمہ داری ہوتی ہے۔ پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کے لیے حصول آزادی بے حد اہم ہے لیکن آزادی کا تحفظ اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ وطن عزیز میں آباد اقلیتوں کی حفاظت اور استحکام ہم سب کا مشترکہ نصب العین ہونا از حد ضروری ہے۔ ہمیں اقلیتوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھاتے ہوئے دو چار دعائیہ کلمات کہہ دینا کافی نہیں بل کہ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم اپنے ملک کی سلامتی وتحفظ اور اقلیتوں کی حفاظت اور بقا کے لئے جدوجہد ہر طریقے سے کریں گے۔ پاکستان عالم اسلام کا مضبوط قلعہ ہے۔ جو اب ایٹمی طاقت بن چکا ہے۔ مگر اصل ایٹمی طاقت تو وہ عوام ہے جو اس کے اندر سانس لے رہی ہے۔ اور آزادانہ زندگی بسر کر رہی ہے۔ لہٰذا اس عوام کو چاہیے کہ وہ خلوص نیت سے محبت ولگن سے پاکستان کی ترقی اور بقا کے ساتھ ساتھ پاکستانی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت اور ترقی کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہیں۔

مذہبی اقلیتوں کے حوالے سے "فقہا اور غیر مسلم اقلیتیں" میں یوں روشنی ڈالی گئی ہے:

"تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی معاشروں میں تنازعات فساد اور خون ریزی کے اسباب میں سے ایک بہت بڑا سبب انسانوں کے مابین پایا جانے والا مذہبی اختلاف رہا ہے۔ مذہب کا تعلق چوں کہ انسان کے ایمان اور عقیدہ سے ہوتا ہے اور مختلف مذہبی گروہ اپنے اختیار کردہ عقیدے کو حق اور دوسرے عقائد کو باطل تصور کرتے ہیں، اس لیے ان میں مذہبی جذبے کے تحت دوسرے عقائد اور مذہب کو مٹانے یا ان کے پیروکاروں پر جبر اور زبردستی کرنے کا رویہ پیدا ہوتا ہے۔"(۳۳)

خلوص اور محبت ایک ایسا خزانہ ہے جس کو جتنا خرچ کیا جائے یہ اتنا ہی بڑھتا ہے۔ اس لیے جذبات اور نفرت میں آکر سوچنے کے بجائے فلاح انسانیت کے بارے میں سوچیں۔ کیوں کہ یہی فلاح اور انسان دوستی ہمارے ملک کے اقلیتوں کو ایک روشن مستقبل دے سکتی ہے۔ اور وہ اپنے حقوق سے بلا خوف و خطر استفادہ کر سکتے ہیں۔ پاکستان ان کے لیے ایک ایسا چشمہ ہو جس سے وہ فیض یاب ہوں۔ جہاں وہ بلا امتیاز اپنا حق حاصل کر سکیں۔ اور جہالت ظلمت کو دور کر کے اپنے دلوں کو اطمینان کے نور سے منور کر سکیں" ول کیملیکا" بھی اس طرح کے مذہبی ٹھیکے داروں کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ مل جل کر رہنا ہی بہترین فیصلہ ہے۔ اور ان کے حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری حکومت وقت کی ذمہ داری بنتی ہے۔ مختصر یہ کہ مولوی حضرات کو اعلیٰ کردار کا مالک ہونا چاہیے۔ کردار کی مضبوطی اور نیک نیتی کی خوبیاں ہی ہیں جو انھیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ لوگوں کی نظروں میں بھی معتبر کر دیں گی۔

ان کو نہایت زیرک، معاملہ فہم اور دور اندیش ہونا چاہیے تاکہ ہر گھمبیر سے گھمبیر مسئلے کو آسانی سے حل کر لیں۔ کیوں کہ ان کی ذرا سی بے احتیاطی صورت حال کو مزید بگاڑ سکتی ہے۔ انھیں بے حد دانش مندی کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت ہے۔ انھیں کسی بھی ملک دشمن کے بہکاوے میں نہیں آنا چاہیے۔ ملک میں امن و امان قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ تاکہ ان کی ذات کی وجہ سے پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت کو کسی بھی قسم کا نقصان برداشت نہ کرنا پڑے۔ مذہبی احکامات کے مطابق چلتے ہوئے پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت کی ڈھارس بندھانی چاہیے اور اپنی انتھک محنت، فرض شناسی اور بلند ہمتی سے اکثریت اور اقلیت کو ایک مرکز پر یکجا اور متحد کرنا چاہیے۔ تاکہ پاکستانی اقلیتوں کی روح میں بھی سکون کی لہر دوڑ جائے۔ مولوی حضرات

کو خود بھی مندرجہ بالا باتوں پر عمل کرنا چاہیے اور باقی لوگوں کے ان پر عمل کرنے کی نصیحت کرنی چاہیے۔ مولوی صاحبان اقلیتوں کے جائز حقوق پر مذہب کے احکامات کے ذریعے ایک مضبوط اور مستحکم عمارت کھڑی کر سکتے ہیں۔ یہ اپنی پر اثر تقریر سے انتہائی ابتر حالات کو بھی تقریر کی صلاحیتوں کے بدولت درست سمت کی طرف لے جاسکتے ہیں۔ اقلیتوں کے لیے ان کا پر خلوص پیغام خضر راہ ثابت ہو گا۔

عبادت گاہوں پر حملے

پاکستان کثیر الآبادی والا ملک ہے۔ اس میں کئی اقلیتیں آباد ہیں اور ان اقلیتوں کو اپنی اپنی عبادت گاہوں میں جانے کی اور ان کی حفاظت کی مکمل آزادی حاصل ہے۔ پاکستان میں کثیر تعداد میں گرجاگھر اور مندر موجود ہیں۔ ہندو اقلیت کی بڑی تعداد سندھ میں موجود ہے اس لیے سندھ اور اس کے دیگر علاقوں کے علاوہ کراچی میں بھی بے شمار مندر موجود ہیں۔ آئین پاکستان کی روسے نہ صرف ہندو بل کہ پاکستان میں رہنے والی تمام اقلیتوں کی عبادت گاہوں کو تحفظ اور آزادی حاصل ہے۔ پاکستان میں ہندو ایک بڑی اقلیت ہونے کی وجہ سے جہاں انھیں وسائل حاصل ہیں تو وہاں کچھ مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ یعنی درپیش مذہبی مسائل میں سب سے سنگین مسئلہ مندروں کا گرایا جانا ہے۔ پاکستان میں مندروں کو مسمار کرنے کے کئی واقعات رونما ہوئے ہیں۔ پاکستانی کمیشن برائے انسانی حقوق اور قومی کمیشن برائے امن و انصاف پاکستان نے ۲۰۰۵ء اور ۲۰۰۶ء کے دوران اقلیتی عبادت گاہوں پر ہونے والے حملوں کے مذمت کی جس میں ہندو اقلیت کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچایا گیا۔ فادر عمانوئیل یوسف مانی" مذہبی اقلیتوں کی صورت حال پر سالانہ رپورٹ" میں لکھتے ہیں:

> " ۱۹اپریل ۲۰۰۵ء میں روزنامہ ڈان نے مندر کے گرانے کی خبر دی جس کا جائزہ انسانی حقوق کی ۲۰۰۶ء کی رپورٹ میں لیا گیا۔ محکمہ او قاف نے سی بلاک وہاڑی میں تقریباً۶۰ فیصد مندر گرا دیئے جو کہ ۱۹۴۰ء سے قائم تھے۔ مندر کے تین ٹاوروں میں سے دو کو مسمار کر دیا جو صرف اس لیے گرائے گئے کہ ان پر مارکیٹ بنائی جا سکے۔"(۳۴)

مولوی محمد ایوب اور ان کے مریدوں نے ملتان میں تاریخی مندر گرا کر وہاں مسجد تعمیر کر دی باوجود اس کے عدالت نے واضح حکم دیا تھا کہ مندر کو نہ گرایا جائے۔ بابری مسجد کی شہادت پر پاکستان میں موجود

ہندوؤں کو مسلمانوں کی جانب سے سخت تشدد کا نشانہ بنایا گیا وران کے کئی مندر مسمار کر دیے گئے۔ مستنصر حسین تارڑ ناول "راکھ" میں اس افسوس ناک حادثے کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"پر تشدد آنکھوں والے اور بہت دکھی لوگ چلتے تھے اور باتیں کرتے تھے، ہم کوئی بے غیرت ہیں جو ان کے مندروں کی حفاظت کرتے پھریں۔۔۔۔ اور وہ بابری مسجد کو شہید کر دیں۔۔۔۔۔ کدالیں بیلچے۔۔۔۔ جین مندر میں بچوں کا سکول تھا۔۔۔ لیکن مندر تھا۔۔۔۔"(۳۵)

بابری مسجد کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی طرف سے یہ رد عمل سامنے آیا اور پاکستان میں موجود مندروں کو نقصان پہنچایا گیا۔ سبی میں تین مندروں کو آگ لگادی گئی۔ کوئٹہ میں ہندوؤں کی جائیداد کو نقصان پہنچایا گیا۔خضدار میں ایک مندر کو آگ لگادی گئی۔ سکھر میں چار مندروں کو آگ لگائی گئی۔لاہور میں مندر کو جلانے کے ساتھ ساتھ متعدد املاک کو بھی نقصان پہنچایا۔لاڑکانہ میں دو مندروں کو جلایا گیا۔ حیدرآباد میں نو مندر نظر آتش کر دیے گئے۔ کراچی میں چار مندر جلانے کے ساتھ کئی گھروں کو بھی نقصان پہنچایا گیا۔بابری مسجد کی شہادت کے بعد کچھ رجعت پسند افراد کے اشتعال دلانے پر پاکستان میں ہندو اقلیت کو نشانہ بنایا گیا۔گھروں کو نظر آتش اور مندروں کو مسمار کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوافراد پر بھی حملے کیے گئے۔

مشاہد اور فاطمہ جب اپنی جان بچانے کے لیے ہجوم سے بچنے کے لیے بندو رام کی دکان والی گلی میں گھسے تو بندو رام کو بپھرے ہوئے ہجوم نے چھری کے وار کر کے ختم کر دیا تھا۔ پاکستان میں ہندو اقلیت کو درپیش مسائل کی روک تھام کے لیے نہایت ضروری ہے کہ حکومتی سطح پر ایسے قوانین بنائے جائیں جن سے اقلیتوں کو درپیش مسائل کی روک تھام کی جاسکے۔اور انھیں مکمل طور پر جانی ومالی تحفظ فراہم کیا جائے تاکہ ہندو اقلیت پاکستان میں بے خوف وخطر زندگی گزار سکیں۔ جنید قیصر اپنی کتاب "پاکستانی اقلیتوں کا نوحہ" میں لکھتے ہیں:

"سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں تقریباً ۲۰ لاکھ ہندو آباد ہیں۔ ہمارے نصاب میں ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں کو ہندو اور مسلمانوں کی جنگ قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ یہ جنگیں دو مذاہب کے بجائے دو ممالک کے درمیان تھیں۔ بھارت کی طرف سے ان جنگوں میں بہت سے مسلمان شامل تھے اور پاکستان میں اقلیتوں کی

بڑی تعداد، نے پاکستان کی طرف سے یہ جنگ لڑی، جب ایسی گمراہ کن معلومات طالب علموں کو دی جائیں گی، تو اس طرح صرف تعصب پیدا ہو گا۔ بل کہ اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں یہ احساس بھی پیدا ہو گا کہ یہ ملک ان کا نہیں ہے۔۔؟"(۳۶)

جب ہندوستان میں ہندوؤں نے مسلمان اقلیت اور ان کی مساجد کو نقصان پہنچایا تو اس کے بدلے میں پاکستانی ہندو اقلیت کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان واقعات کے بعد پاکستان میں رہنے والے ہندو اقلیت کو درپیش مسائل سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں چند شر پسند عناصر کی وجہ سے انھیں جو نقصان پہنچا اس کی وجہ سے پاکستان کے بارے میں بھی منفی اثرات مرتب ہوئے۔ عبادت گاہوں پر حملے کرنے سے امن و امان کے مسئلے کو سنگین بنا کر سماج میں بے اطمینانی پیدا کرنے سے سماجی اقدار پامال ہوتی ہیں۔ اس طرح کی حرکتوں سے اقلیتوں میں خوف و ہراس اور عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے اور ملک کی ساخت کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ ایسا سماج جہاں سماجی ناانصافی کو ختم کرنے کے لیے کوئی مثبت کوشش نہ کی جائے تو لوگ احتجاج پر اتر آتے ہیں۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ جس سماج سے اخلاقی یکسوئی اور انسانی اقدار کا پاس ختم ہو جائے وہاں لوگ بے بسی کے عالم میں شکست و ریخت پر اتر آتے ہیں۔ ہجوم کے شور سے الگ فاطمہ کے کانوں میں ایک مشینی گڑگڑاہٹ کی آواز آئی اور ساتھ جنونی نعروں کا شور بھی ،جب ان کی نظر سامنے پڑی تو۔ ناول "راکھ" سے اقتباس ملاحظہ کیجئے:

"لاہور کارپوریشن کے دو بلڈوزر شاہ عالمی چوک کے سنہری مندر کی بنیاد میں آہنی بلیڈ گھسائے اسے مسمار کر رہے تھے۔۔۔ درجنوں متاثرین کدالوں اور بیلچوں کی مدد سے ایک ناقابل گرفت جوش میں غرق مندر کی دیواروں کو ڈھانے کی کوشش کر رہے تھے۔۔ کچھ لوگ مندر کے سنہری کلس کی بلندی تک جا پہنچے اور اسے توڑنے میں مصروف تھے۔"(۳۷)

مندرجہ بالا اقتباس کے حوالے سے احمد سلیم اپنی کتاب "پاکستان اور اقلیتیں" میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں بابری مسجد کی شہادت کے بعد پاکستان بھر میں لاکھوں افراد پر مشتمل جلوسوں نے مختلف شہروں میں موجود ہندوؤں کی مذہبی عبادت گاہوں کو تباہ کرنے کے اجتماعی عمل میں شرکت کی۔ اس اقدام میں سرکاری مشینری بھی مظاہرین کی

مددگار بنی رہی۔ لاہور میں مشہور جین مندر جو ہندو مندر نہیں تھا، کو گرانے کے لیے بلدیہ کی گاڑیاں اور بلڈوزر استعمال کیے گئے۔ جب کہ فیصل آباد میں اس وقت کے ایک وفاقی وزیر اور حالیہ پنجاب حکومت کے صوبائی وزیر نے ایک غیر آباد مندر کو گرانے کے لیے شدید بارش میں ہزاروں افراد کے ساتھ جلوس کی قیادت کی۔ سندھ میں کئی مندروں اور ہندو آبادیوں پر حملے ہوئے۔ انتہا پسند حملہ آوروں نے کئی مندر اور آبادیاں جلا ڈالیں یا مسمار کر دیں۔ جس سے سینکڑوں ہندو بے گھر ہو گئے جب کہ کئی ہندوؤں کو قتل بھی کیا گیا۔ ۱۹۹۷ء میں تھرپارکر کے شہر وھوڑو اور ملتان کے قریب نواں شہر میں دو مندروں کو مسمار کیا گیا۔"[۳۸]

کسی سماج یا ملک میں جہاں مختلف اقلیتیں بستی ہوں اور ان سے اپنے اعتقاد سے جذباتی لگاؤ کے باعث دوسرے اعتقاد والوں کے خلاف نفرت تشدد کی حد تک موجود ہو تو فرقہ ورانہ تصادم ناگزیر ہے۔ لہذا اقلیتوں کی حفاظتی اقدامات کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد، ہر گھر، ہر گلی، ہر محلہ، ہر ادارہ، ہر شاہراہ وغیرہ کے معمولات میں اقلیتوں کے مال، جان اور عبادت گاہوں کی حفاظت شعور اور لاشعوری طور پر کار فرما رہنی چاہیے۔ ایک دوسرے کے حالات میں دل چسپی اور ہمدردی کا مظاہرہ کرنے سے اجتماعی تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ "مذہبی تنوع کا احترام" میں اس مسئلے کی عکاسی اس طرح کی گئی ہے:

"مشرق وسطیٰ، افریقہ، سپین، جنوب مشرقی ایشیا، وسطی ایشیا، برصغیر جہاں بھی مسلمانوں کو حکمرانی کا موقع ملا کسی کی مذہبی آزادی کو سلب نہیں کیا گیا۔ سرکاری سرپرستی میں مذہبی عبادت گاہیں تعمیر کی گئیں اور مذہبی تعلیم کے ادارے بنائے گئے۔"[۳۹]

مذہب کے نام پر دہشت گردی اور عبادت گاہوں پر حملوں کی وجہ سے ملک کے سنجیدہ اور محب وطن سماجی حلقے پریشان اور متفکر ہیں۔ کیوں کہ نوجوان بے روز گاری اور نامساعد سماجی حالات کے باعث جرائم پیشہ عناصر میں شامل ہو رہے ہیں اور پھر صورت حال آہستہ آہستہ خون ریز واقعات پیش آنے کے مقام تک آ پہنچتی ہے۔ عبادت گاہوں پر حملے کرنا چند شر پسند عناصر کا سب سے موثر ہتھیار ہے ۔ مذہب کے متشدد ٹھیکے دار ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں تاکہ امن و امان کی صورت حال کو خراب کیا جا سکے۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے ناول "راکھ" میں مندر مسمار کرنے پر یوں خامہ فرسائی کر رہے ہیں:

"ایک خوفزدہ بلیک بک کی آنکھیں شاہ عالمی چوک میں سنہری کلس والے مندر کے ڈھیتے ہوئے ملبے میں سے اٹھنے والی گرد کے اندر بولنے لگیں۔۔۔ مندر کی راکھ بے رنگ تھی۔۔۔ ہجوم جہاں تھا۔۔۔ مندر کے کنگروں پر چڑھتا ہوا۔۔۔ کلس کو توڑتا ہوا ۔۔۔ بنیادوں پر کدالیں چلاتا نعرے لگاتا۔۔۔ اور پھر زیر زمین جو شے سر کی اس کی گہری اور بھید بھری آواز سنائی دی جو ہجوم کے سکوت پر حاوی ہوئی اور شاہ عالمی چوک میں ایستادہ سنہری مندر سر کے بل گرد بھرے آسمان میں سے جھکتا نیچے آنے لگا۔"(۴۰)

اس طرح کے کام فقط سماج کی گرد کے مانند ہیں۔ اگر سماج مل کر اس گرد کی جھاڑ پونچھ کرتا ہے تو یہ گرد ہوا میں تحلیل ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ معاشی، سماجی اور مذہبی گروہوں میں بٹی ہوئی اقلیتوں کے لیے جس میں غربت اور استحصال بھی ہو؛ کے لیے مربوط حفاظتی انتظام ضروری ہے۔ جس ملک کے پڑوس میں دشمن ملک آباد ہو اور جہاں سے تخریب اور دہشت گرد مسلمان اقلیت اور ان کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچانے کے ساتھ ساتھ اس دشمن ملک کا ہر فرد چوبیس گھنٹے دہشت گردی اور تخریب کاری کے لیے تیار ہو تو ردعمل کے طور پر پاکستان میں آباد اقلیتوں کو نشانہ بنانے کے بجائے انھیں تحفظ فراہم کیا جائے اور ان سے خوش اسلوبی سے پیش آنا چاہیے۔ "جنید قیصر" کے مطابق:

"دنیا میں کوئی بھی ملک اور معاشرہ ایسا نہیں ہے جہاں ایک ہی عقیدے، نسل اور رنگ کے لوگ آباد ہوں۔ وطن عزیز میں بھی خوش قسمتی سے مختلف نظریات، عقیدے ، ثقافت اور زبان کے لوگ آباد ہیں جو کہ پاکستان کو ایک تنوع، خوبصورتی اور کثیر الجہتی بخش رہے ہیں۔ اکثریت اور اقلیت کا باہم رشتہ اور تعلق ہی ایسا پیمانہ یا معیار ہوتا ہے جس سے ہم کسی ملک میں انسانی آزادی اور بنیادی حقوق اور معاشرے کی شائستگی اور تہذیب کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔"(۴۱)

اگر سماج کا ہر فرد تقوی اختیار کرے، اپنا محاسبہ اور محاکمہ کرے تو پھر سماج از خود فلاح کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ چھینا جھپٹی ختم ہو جاتی ہے۔ انسانی عمل کے وہ تمام عوارض جو معاشی اور سماجی برائیوں کو جنم دیتے ہیں۔ فتنہ اور فساد کا باعث ہوتے ہیں۔ امن و سکون تباہ کر کے بے چینی اور بے اعتمادی کا باعث بنتے ہیں۔ وہ از خود ختم ہو جاتے ہیں۔ یوں ایک امن اور سکون کا ماحول میسر آ جاتا ہے۔ سماج کے لیے امن و سکون ایک

ایسی نعمت ہے جس کے لیے انسان ہمیشہ سے سر گرداں رہا ہے ۔فرقہ وارانہ مسائل کی ایک بنیادی وجہ مدرسوں کا نظام تعلیم بھی ہے۔دینی مدرسہ کے طلبہ جدید تعلیم اور رجحانات سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ دینی مدرسوں میں زیادہ تر غریب طبقہ سے تعلق رکھنے والے طلبہ شامل ہوتے ہیں ۔ غریب والدین اس بات پر مطمئن ہوتے ہیں کہ ان کی اولاد تعلیم حاصل کر رہی ہے چاہے وہ تنگ نظری اور تعصب کی بنیاد پر ہی کیوں نہ ہو۔ان بچوں کو کم سے کم رہائشی اور دیگر سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ان کی تربیت خاص اصولوں پر ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں ان کی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں وہ صرف اپنے مسلک کے نظریات کو صحیح ترین سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ وقت آنے پر جان کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور اپنے مسالک کی بالادستی کے لیے دوسرے مسالک کے کارکنوں، رہنماؤں کی عبادت گاہوں پر حملہ کرنے اور ان کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ شاہ عالمی چوک میں جب مندر گرایا جارہا تھا تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ مندر نے کس زاویے اور کس طرف زمین بوس ہونا ہے۔شاہ عالمی چوک میں جمع ہجوم کی آنکھوں میں پہلے خوشی اور پھر خوف اتر آیا اور وہاں بھگدڑ مچ گئی اور اب ایک طرح کی قیامت برپا تھی۔لوگ جان بچانے کے لیے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے جب کہ دوسری طرف کچھ ایسے بھی تھے جن کے دل خوف خدا سے قطعاً عاری ہو چکے تھے۔اس حوالے سے مندرجہ ذیل اقتباس ناول "راکھ" سے ملاحظہ کیجئے:

> "جب زیر زمین کوئی شے سرکی تو مندر پر چڑھے ہوئے لوگوں نے اپنے بچاؤ کے لیے چھلانگیں لگا دیں لیکن ایک نوجوان کو شائد موقع نہ ملا۔۔شائد یہ اس کی اپنی پسند تھی۔وہ مندر کی چوٹی پر تلوار سونتے ہوئے ایک سپاہی کی طرح ڈٹا کھڑا رہا اور اب اس کے ملبے کے ساتھ نیچے آرہا تھا۔۔ آخری لمحوں میں زرد ہوتے چہرے کے ساتھ اس کے منصوبوں میں مندر ڈھانا تھا اس کے ساتھ خود ڈھے جانا نہیں تھا۔گرد کا ایک بہت بڑا مشروم ایٹم طرز کا شاہ عالمی چوک میں سے اٹھ کر آسمان پر پھیلنے لگا۔۔بہت سے لوگ ملبے کے نیچے دب گئے تھے۔"(۴۲)

بے روزگاری اور غربت بھی فرقہ وارانہ مسائل میں اضافے کا باعث ہے۔ غریب اور بے روزگار نوجوان بھاری رقم وصول کرتے ہیں اور بے گناہ شہریوں اور اقلیتوں کی عبادت گاہوں پر حملے کرنے میں ملوث ہوتے ہیں۔ سماجی ناانصافی، علاقائیت پرستی اور پاکستان کے معاملات میں بیرونی مداخلت بھی ان مسائل میں اضافے کا باعث ہے۔ان تمام وجوہات کا خاتمہ ضروری ہے۔ان مسائل کے خاتمے کے لیے خواندگی کی شرح

ضروری ہے۔ شعبہ ابلاغ اور سب سے بڑھ کر عوام کو ان مسائل کے حل کے لیے بھرپور حصہ لینا ضروری ہے۔ ہر مذہبی گروپ اپنے نظریات کو صحیح سمجھتے ہوئے ان کی بالادستی کے لیے ہر حربہ آزمانہ ایمان کے مطابق سمجھتا ہے۔ ہر گروپ کی اپنے کارکنوں پر مشتمل فوج ہے۔ جو سماج میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا بیج بونے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ ہمارے سیاسی لیڈر بھی بعض اوقات کسی نہ کسی مذہبی گروپ سے منسلک ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ بھی کسی نہ کسی مصلحت کے تحت خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔ اس مذہبی تعصب نے ایک نازک صورت حال پیدا کر دی ہے۔ حقوق العباد کا خیال رکھنا چاہیے اور اقلیتوں کے حقوق کو مد نظر رکھنا ہمارے فرائض میں شامل ہونا چاہیے۔ جبر، قتل و غارت اور عبادت گاہوں پر حملے انھیں مسمار کرنا اور غیر انسانی سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ صرف اخوت اور محبت کی زبان بولنی چاہیے۔ یہ ایک ایسی زبان ہے جو تمام لوگ سمجھ سکتے ہیں حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو سماعت سے محروم ہیں۔ "مذہبی تنوع کا احترام" میں اس حوالے سے یوں لکھا ہے:

> "اس کی سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ مسلمان ممالک اور سماج لوگوں کے سامنے اپنی مثال پیش کریں۔ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ کیسے مسلم اکثریتی ملک میں غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ ان کی عبادت گاہیں محفوظ ہیں اور وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنے مذہب پر عمل کر رہے ہیں۔ پاکستان عالم اسلام کا رہنما ہے۔ پاکستان کے مسلمان معاشرے کو بطور خاص اپنی مثال پیش کرنی چاہیے۔"(۴۳)

اگر قوم کے بچے بچے کا یہ نصب العین ہو جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت بھی پاکستان میں آباد اقلیتوں کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتی۔ پاکستان آج بھی اس کی اہلیت رکھتا ہے کہ اقلیتوں کو اخلاقی اعتبار سے ایک صحت مند، معاشی اعتبار سے عادلانہ، اور عمرانی اعتبار سے پائیدار تہذیب عطا کر کے انھیں باقی رکھ سکے کیوں کہ عصر حاضر کی روح کا یہ تقاضا بھی ہے اور اب ایسا ہو بھی رہا ہے۔ مثلاً پوری دنیا میں آفات سے بچاؤ کے لیے ارلی وارننگ سسٹم (پیشگی انتباہ) کے نظام کو عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اور پاکستان میں بھی موسمیاتی تبدیلیوں، مون سون بارشوں، سیلاب کی تباہ کاریوں اور زلزلہ سے قبل اور بعد میں بھی ارلی وارننگ سسٹم کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً زلزلے کے بعد آفٹر شاکس سے عوام کو آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ عوام اور حکومت اپنے طور پہ حفاظتی تدابیر اختیار کر کے جانی و مالی نقصان سے بچنے کی کوشش کریں۔ مگر اب پاکستان میں ایک

خوش آئند بات ہے کہ ان مقاصد کے استعمال کے ساتھ ساتھ پہلی بار اس اصطلاح کو اب پاکستانی اقلیتوں کے تحفظ کے لیے ارلی وارننگ سسٹم (پیشگی انتباہ) استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اداروں سمیت سول سوسائٹی کے ایک نیٹ ورک نے ایک ہیلپ لائن کا آغاز کیا ہے۔ اس ہیلپ لائن کے نمبر کی تشہیر ذرائع ابلاغ سمیت جگہ جگہ چسپاں کیے جانے والے پوسٹرز میں کی گئی ہے۔ جس میں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ اگر کوئی پاکستانی اقلیت کہیں بھی ایسا مسئلہ دیکھیں جو اکثریت کی جانب سے ان کے ساتھ پیش آ رہا ہے اور اشتعال اور تنازع کا سبب بن سکتا ہے تو فوری طور پر اس ہیلپ لائن پر اطلاع کریں۔ پاکستانی اقلیتوں کو تحفظ دینے والا نیٹ ورک پاکستان کے مختلف اضلاع میں کام کر رہا ہے مثلاً فیصل آباد وغیرہ۔ ارلی وارننگ سسٹم کے تحت مذہبی شخصیات، سول سوسائٹی، میڈیا اور سماج ایک ساتھ مل کر معاملے کو حل کرواتے ہیں۔ تاکہ کوئی بڑا فساد کھڑا نہ ہو سکے۔ اور متاثر ہونے والی اقلیتوں کو تحفظ فراہم کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں "شمائلہ خان "یوں خامہ فرسائی کرتی ہیں:

> " خیال رہے کہ پاکستان میں اقلیتوں کے خلاف مذہبی نوعیت کے معاملات میں عموماً قانون نافذ کرنے والے ادارے بے بس نظر آتے ہیں۔۔۔ ایسے میں مقامی سطح پر شروع کی جانے والی ہیلپ لائن جیسی چھوٹی سی کوشش اقلیتوں کے تحفظ میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن پاکستان میں اس طرح کے اقدامات بچاؤ کے لیے بہت مناسب ہیں۔ لیکن ان کے تدارک کے لیے ریاستی اداروں کی سنجیدگی وقت کی اہم ضرورت ہے۔"(۴۴)

اس ہیلپ لائن کے رضاکار اپنے اپنے علاقوں کے مسائل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ جو آگے چل کر تنازعات یا کسی حادثے کا باعث بن سکتے ہیں۔ اور پھر ان مسائل کو اس فورم پر حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور اگر معاملہ زیادہ گمبھیر ہو اور حل نہ ہو سکے تو اس صورت میں کہیں بڑی سطح کے فورم پر بھیج دیا جاتا ہے۔ سماجی برائیوں کا خاتمہ اور اقلیتوں کی ترقی اور خوش حالی اور ان کے جانی و مالی تحفظ کی خاطر ایسا کام کرنا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

جبری تبدیلی مذہب

اللہ رب العزت نے انسان کو بہترین جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ اشرف المخلوقات بنا کر زمین پر خلافت بخشی۔ پھر اس کے لیے موجودات عالم کو مسخر کیا۔ اس کی روزی کے لیے زمین سے غلے اور میوہ جات اگائے۔ بارش کا انتظام کیا، فصلوں کو روشنی اور حرارت بخشنے کے لیے سورج پیدا کیا۔ اسی طرح تمام کائنات کو یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات سے لے کر آفتاب اور ستاروں تک کو انسان کی خدمت میں سر گرم عمل اور مصروف بنا دیا ہے۔ اور پھر اللہ رب العزت نے انسان پر دو طرح کے حقوق لاگو کیے ہیں۔ ایک حقوق اللہ اور دوسرا حقوق العباد۔ حقوق اللہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ پاک اپنی رحمت اور کرم کے باعث معاف فرمانے پہ قادر ہیں لیکن جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے اس کو معاف کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہی تفویض فرما دیا ہے کہ وہ چاہے تو معاف کرے اور اگر نہ چاہے تو معاف نہ کرے۔ حقوق العباد میں ہر انسان کے حق کی توضیح کی گئی ہے۔ حقوق العباد سے یہاں مراد پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت کے مذہبی حقوق ہیں۔ کیوں کہ پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت کے مسائل میں سے ایک مسئلہ جبری تبدیلی مذہب کا ہے۔ جبری تبدیلی مذہب دراصل ایسی دیمک ہے جو انسان کی شخصیت اور صلاحیتوں کو اندر ہی اندر چاٹ جاتی ہے۔ اور ایک لمحہ وہ آتا ہے جب اس انسان کے پاس صرف کھوکھلا پن رہ جاتا ہے اور اس کی شخصیت کی تعمیری پہلو مفقود ہو جاتے ہیں۔ جبری تبدیلی مذہب کی وجہ سے ان کی صلاحیتوں کو جہاں زنگ لگتا ہے وہاں ان کی شخصیت بھی مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ پاکستانی سماج ایک امن پسند سماج ہے لیکن اس کے باوجود چند شر پسند عناصر ہندو اور عیسائی اقلیتوں کو جبراً مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ناول "بھاگ بھری" سے جبراً تبدیلی مذہب کا اقتباس دیکھیے:

> " تم مذہب کے نام پر مجھے بہن کہنے کی کوشش نہ کرو، تمہاری زبان غلیظ اور تمہاری آنکھیں ہوس ناک ہیں، میں تمہارا مذہب تم کو واپس کرتی ہوں، میں اپنے دھرم میں بھلی ہوں، تمہارا اسلام تم کو مبارک ہو۔۔۔ بھاگ بھری تم ارتداد کی مرتکب ہو رہی ہو۔ ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ۔ اسلام میں آنے کا راستہ ہے لیکن جانے کا نہیں۔ تم مرتد ہو چکی ہو۔ اگر تم نے تین دن کے اندر اندر اپنا فیصلہ نہ بدلا تو تم کو موت کی سزا دے دی جائے گی۔

بھاگ بھری نے غصے میں کہا۔ مولبی صاحب! آپ کے پاس موت کی دھمکیوں کے سوا بھی کچھ ہے یا نہیں؟۔۔۔لے جاؤ! اس بدنصیب کو۔ اسے تین دن تک ایک کمرے میں قید رکھو۔ اگر یہ اپنا فیصلہ نہ بدلے تو سزائے موت پر عمل درآمد کیا جائے۔"(۴۵)

جبری طور پر مذہب تبدیل کرانا انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیا جاتا ہے۔ دور جدید میں اقلیتی معاشرہ اس وجہ سے بھی مسائل اور الجھنوں سے دوچار ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ ذاتی دشمنی کی بناپر بھی انھیں مذہب تبدیل کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس جبر کی پاکستانی قانون بھی اجازت نہیں دیتا۔ ایسے شر پسند عناصر کے متعلق اقدامات کیے جائیں اور اس زیادتی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ کسی بھی پاکستانی ہندو اقلیت کو ایسے کام کے لیے مجبور کرنا جس کو وہ ناپسند کرتا ہو تو یہ ایک انتہائی تکلیف دہ عمل ہے۔ رضامندی کے بغیر کوئی بھی کام کرنا کسی بھی انسان کے لیے ناقابل برداشت عمل ہے اور جہاں تک مذہب کا معاملہ ہے تو دنیا کے ہر فرد کو اپنے مذہب سے جذباتی لگاؤ اور محبت ہوتی ہے۔ چاہے وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ مندرجہ بالا اقتباس کے حوالے سے نامور حنفی فقیہ "امام سرخسی" اقلیتوں کو جبراً دائرہ اسلام میں داخل کرنے کی ممانعت اور حرمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اگر کوئی ایسا شخص جسے اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا جائز نہیں جیسا کہ ذمی اور مستامن، اگر اسے جبراً مسلمان بنایا جائے اور وہ اسلام قبول کرلے تو وہ قانونی طور پر مسلمان شمار نہیں ہوگا، جب تک اس کی طرف سے اپنی رضامندی سے اسلام قبول کرنے کی کوئی دلیل موجود نہ ہو۔ مثلاً یہ کہ جب اس پر جبر ختم ہو جائے تو وہ اس کے بعد بھی مسلمان رہنا چاہے۔ اس سے پہلے وہ مر جائے تو وہ غیر مسلم ہی شمار ہوگا اور اگر دوبارہ اپنے دین کی طرف لوٹ جائے تو نہ اسے قتل کرنا جائز ہوگا اور نہ اسلام قبول کرنے پر مجبور۔"(۴۶)

پاکستانی اقلیتوں کو پوری اور مکمل اجازت ہے کہ وہ اپنے مذہب پر بلاخوف و خطر قائم رہیں۔ اگر انھیں اپنی مذہبی رسومات ادا کرنے میں کسی بھی قسم کی مشکلات کا سامنا ہے تو فوری طور پر اس معاملے کے حوالے سے آواز اٹھائیں تاکہ ان دشمن نما لوگوں کی سرکوبی کا بندوبست کیا جاسکے۔ ان لوگوں کو ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے پہلے ہی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور اوپر سے انھیں زبردستی مذہب تبدیل کرنے

پر مجبور کر کے مزید مشکل میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ جو کہ ایک نا قابل معافی جرم ہے۔ پاکستان میں بسنے والی تمام اقلیتوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے۔ کہ وہ اپنے مذہب اور عقیدے کے لحاظ سے آزادانہ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ جبری تبدیلی مذہب کے حوالے سے صفدر زیدی کے "ناول بھاگ بھری" سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "جناب کمانڈر صاحب! (یہ کہتے ہوئے ان کی لہجے میں طنز نمایاں تھا) شری عدالت نے فقہ اسلامی کے مطابق آپ کی والدہ گرامی کو تین دن کی مہلت دی تھی کہ وہ دین حق کی جانب پلٹ آئیں لیکن افسوس صد افسوس، ان کے حواس اور ان کی روح پر شیطان ملعون غلبہ پا چکا ہے، اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ قانون اسلامی کا نفاذ کر کے ان پر غالب شیطان کو شکست سے ہم کنار کر دیا جائے۔"(۴۷)

تمام پاکستانی عوام کو اس مکروہ فعل کی کھلم کھلا مخالفت کرنی چاہیے تا کہ اس طرح کی حرکتوں کی گنجائش باقی نہ رہے۔ تا کہ ہندو اور عیسائی اقلیتوں کی انا اور عزت نفس مجروح نہ ہو۔ اس طرح کی حرکتوں سے انسانی حقوق پامال ہوتے ہیں۔ جبری طور پر مذہب تبدیل کرانا پاکستانی سماج میں تقریباً عام ہو گیا ہے۔ بغیر رضا مندی کے ہندو اور عیسائی اقلیت کو ان کا مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات انھیں مذہب سے ہٹنے کے لیے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور بعض دفعہ اغوا بھی کر لیا جاتا ہے۔ ڈرا دھمکا کر زبردستی مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ناول "بھاگ بھری" میں پاکستانی اقلیتی دشمن قاضی نے اپنی خود ساختہ عدالت لگا کر بھاگ بھری کو مذہب تبدیل نہ کرنے پر موت کی سزا سنا دی۔" فقہا اور غیر مسلم اقلیتیں" میں اس کے متعلق لکھا ہے:

> " مذہب کے اعتقاد کا معاملہ ہر انسان کے اپنے ذاتی فیصلے اور اختیار پر مبنی ہے۔ اور اس معاملے میں زور زبردستی کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ دنیا اللہ نے انسانوں کے علم و عقل اور عمل کی آزمائش کے لیے بنائی ہے۔ جس کے لیے انسانوں کو عقیدہ و عمل کا حامل ہونا لازم ہے۔ اس وجہ سے دنیا میں مذہبی اختلافات رہیں گے اور اس اختلاف کو ختم کرنے کے لیے کسی گروہ کو دوسرے گروہ پر مذہبی جبر کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔"(۴۸)

پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت کو اس ملک میں رہتے ہوئے اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا مکمل حق حاصل ہے۔ کوئی بھی انسان سماج میں حد سے تجاوز کرے، ظلم وزیادتی کرے، اقلیتوں کو خوف زدہ کرے تو اس کے خلاف ہر صورت کاروائی عمل میں لائی جائے۔ ہندو اقلیت بھاگ بھری کو جس طرح بے رحم قاضی نے اپنے خود ساختہ عدالت میں تین دن کی مہلت دی لیکن بھاگ بھری موت کے خوف کے بجائے ڈٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اور اپنا مذہب تبدیل کرنے کے بجائے موت کو گلے لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ قاضی کی بے رحمی دیکھیے اسی کے بیٹے کو کہا کہ ماں پر گولی چلاؤ تمہارا نشانہ پکا ہے۔ بھاگ بھری کے بیٹے ساون کو بھی اچھا کھانا اور اچھی رہائش دے کر مسلمان بنالیا تھا مگر بھاگ بھری ان کے چنگل میں نہیں آئی تو فوراً اسلام کا نام استعمال کر کے اپنی ظالمانہ سوچ کی تکمیل کرنا شروع کر دی۔ اور اپنے گھناونے مقصد کے حصول کے لیے ہر حد پھلانگ دی۔ اس برائی کا سد باب اور فساد کا قلع قمع کرنا از حد ضروری ہے۔ ناول "بھاگ بھری" سے ایک اور اقتباس دیکھیے:

> "کچھ ہی دیر بعد آپ کی مادر گرامی کو ارتداد کے جرم میں موت کی سزادی جانی ہے۔ آپ اپنے ہاتھوں سے اس مرتدہ ماں پر گولی چلا کر دیگر مجاہدین کو دکھا دیں کہ اس مرحلے پر آپ کا ہاتھ نہیں کانپے گا۔ آپ دنیا کو دکھادیں کہ دین حق کے سامنے دنیاوی رشتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔۔۔
>
> یہ لو اس میں صرف ایک گولی ہے۔ مجاہدوں سے سنا ہے کہ تمہارا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا! اس گولی کو اس مرتدہ کی پیشانی پر مارنا۔"(۴۹)

ہندو اقلیت وطن عزیز کا حصہ ہیں۔ ان کی جان و مال مذہبی آزادی اور انھیں مذہبی تحفظ فراہم کرنا ہر پاکستانی کی بحیثیت ہم وطن ہونے کی ذمہ داری بنتی ہے۔ تاکہ وہ ہر قسم کے خوف سے بے نیاز ہو کر اس ملک میں رہیں۔ ان کو جان سے مارنا اور خوفزدہ کرنا انتہائی ناانصافی ہے۔ ہر فرد کے اندر محبت و خلوص کا مادہ پایا جاتا ہے۔ پاکستانی اقلیتیں بھی اپنے اندر یہ تمام جذبات رکھتی ہیں۔ اس لیے ان کی زندگی کو کٹھن بنانے کے بجائے محبت اور خلوص سے پیش آئیں تو وہ بھی پورے اعتماد کے ساتھ زندگی کی حقیقی خوشیوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اپنے مذہب کے ساتھ محبت کا تعلق ایک سماجی حقیقت ہے اور اس کو کسی بھی مجبوری، خوف یا جبر کی وجہ سے چھوڑنا بہت مشکل ترین کام ہے۔ پاکستان کے آرٹیکل ۲۰ کے تحت کوئی بھی شخص کسی دوسرے کی مذہبی

آزادی کو نہیں چھین سکتا۔ آئین پاکستان کے تحت پاکستان میں موجود ہر شہری کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ یہاں ہر شہری سے مراد صرف مسلمان نہیں بل کہ تمام اقلیتیں مثلاً ہندو اور عیسائی بھی شامل ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس کو مد نظر رکھتے ہوئے "جنید قیصر" یوں رقم طراز ہیں:

> "جبراً تبدیلی مذہب کے واقعات سے ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی رپورٹیں بھری پڑی ہیں۔ گزشتہ پانچ سالوں میں اس نوعیت کے ۵۰ واقعات رپورٹ ہوئے ہیں۔ خواتین اور مذہبی اقلیتوں کے بنیادی حقوق اور انسانی آزادیوں کے استحصال کی بنا پر پاکستان کی بیرونی امیج ہمیشہ خراب رہی ہے۔ بین الاقوامی اداروں اور میڈیا رپورٹس نے ان واقعات کو خاص طور نشانہ بنایا ہے۔ پاکستان میں حکومتیں انسانی حقوق کے تحفظ اور ان کے فروغ میں عملاً ناکام رہی ہیں۔ حکومتیں مذہبی اقلیتوں کے مذہبی حقوق اور جذبات کے تحفظ میں بھی ناکام رہی ہیں۔"(۵۰)

انسانی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جہاں مسلمان حکمران ہوں وہاں اقلیتوں کو نہ صرف مذہبی آزادی میسر رہی بل کہ ان کے بنیادی حقوق مسلمان شہریوں سے کم نہ تھے۔ اقلیتوں کے لیے نہ صرف یہ کہ اپنے مذہب پر قائم رہنے کا حق ملا بل کہ ان کے ساتھ کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا کہ وہ اقلیت ہیں۔ میثاق مدینہ کے معاہدے میں بھی اقلیتوں کے اس حق کو تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ رہیں گے۔ گویا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے انھیں یہ یقین دہانی کرائی کہ ان کے مذہب کو زبردستی تبدیل نہیں کیا جائے گا۔ مسلمان اور یہودیوں کے درمیان اشتراک عمل ہو گا۔ اور اس میں مذہب کا کوئی دخل نہیں ہو گا۔ اقلیتوں کے حقوق بھی اہم اور مقدم ہیں۔ اگر انھیں عملی طور پر تمام حقوق حاصل ہو جائیں تو وہ اعتماد کی قوت سے اپنے ساتھ پیش آنے والے تمام مسائل سے نکل سکتے ہیں۔ ناول "کہر" سے جبری تبدیلی مذہب کا اقتباس پڑھیے:

> "وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ جنگل میں چھپی ہوئی تھی۔ حضرت گل نے عورت اور مرد کو قتل کیا تو بچی خود ہی بے ہوش ہو گئی۔ اسے بوری میں ڈالا اور ایک رسی کی مدد سے دریا پار کر کے گھر آ گیا۔ بملا کا نام حلیمہ رکھا اور اس سے شادی کر لی۔ وہ ہر وقت روتی

رہتی تھی۔۔۔وہ چیخ چیخ کر روتی تو اسے دوزخ کے عذاب سے ڈراتا۔ کہتا تم مسلمان ہونے پر شکر نہیں کرتی۔"(۵۱)

جبراً مذہب تبدیل ہونے سے زندگی کا سکون چھن جاتا ہے۔ راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ کسی پل سکون نہیں ملتا دل کرتا ہے وہ اپنے اندر کا غم و غصہ چیخ چیخ کر نکالیں۔ بملا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سین تھا لیکن اس کے رونے پر پابندی تھی۔ اس کے شوہر کے نزدیک اسے تو اللہ پاک کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا کہ وہ مسلمان ہو گئی ہے۔ اس کا ظالم اور بوڑھا شوہر اسے اللہ کے عذاب سے ڈراتا رہتا تھا۔ ایسے میں ضروری ہے کہ ہندو اقلیت اصولوں اور قانون سے آگاہ ہوں جو حکومت نے ان کے لیے بنائے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اپنا اور مذہب دونوں کا دفاع کر سکیں۔ سندھ حکومت نے ایک بل پاس کیا ہے جو اقلیتوں کی جبری تبدیلی مذہب پر جرمانے اور قید کی صورت میں بھگتنا پڑے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک میں موجود ہندو اور عیسائی اقلیت کو مذہبی تحفظ فراہم کرنے کے ساتھ ان کی مذہبی و سماجی آزادی کو یقینی بنانے کی یقین دہانی بھی کرائی ہے۔ "سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں" میں اس معاملے پر یوں روشنی ڈالی ہے:

"سال ۲۰۰۵ء کے دوران ایک ہزار سے زائد اقلیتی خواتین کو زبردستی مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کرنے کی کوششیں بھی دیکھنے میں آئیں۔۔۔ پاکستان کے قومی اسمبلی کے ایک رکن اور پاکستان ہندو کونسل کے سرپرست اعلیٰ ڈاکٹر رمیش کمار کے مطابق ہندو کمیونٹی کو مذہب کی جبری تبدیلی، اغوا برائے تاوان، اور تشدد جیسے مسائل کا سامنا ہے۔"(۵۲)

جبری تبدیلی مذہب سے نہ تو یہ خواتین صحیح طریقے سے مسلمان بنتی ہیں۔ اور نہ اسلام سیکھنے میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ کیوں کہ ظاہر سی بات ہے ان کا رجحان اسلام کی طرف ہوتا ہی نہیں جس کی وجہ سے مزید مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ہمیں پاکستانی اقلیتی گروہوں کی جان و مال، عزت و آبرو اور مذہبی آزادی کے تحفظ کے لیے اپنے قول و عمل سے دنیا کے سامنے ایک اعلیٰ مثال پیش کرنی چاہیے۔ کیوں کہ مذہب اور عقیدے کی بنا پر دوسرے فرقوں کے ساتھ زبردستی کا طریقہ اختیار کرنا ہرگز قابل قبول نہیں۔ انھیں یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنے مذہب کے تقاضوں کو بغیر کسی رکاوٹ اور ڈر کے پورا کریں۔

انسانیت کے ناطے ہر فرد اور اس کے مذہب کا احترام لازم ہے۔ بملا کا مذہب تبدیل کروا تو دیا لیکن وہ اس کے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے آخر اس فانی دنیا سے کوچ کر گئی۔ ایک اور اقتباس ناول "کہر" سے دیکھیے: "پھر وہ بیمار رہنے لگی اور اس سے ٹی بی ہو گئی۔ دس ماہ بعد اس نے دو بچوں کو جنم دیا۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لیکن خود مر گئی۔ تب اس کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔"(۵۳)

زبردستی اپنے مذہب سے ہٹنے کا غم بملا برداشت نہ کر سکی۔ جو اس کے لیے لقمہ اجل ثابت ہوا۔ محض پندرہ برس کی عمر میں دنیا چھوڑ گئی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں اس نے ساری قباحتیں دیکھ لیں۔ ابھی تو اس نے زندگی کی چند ہی بہاریں دیکھی تھیں۔ ان میں سے آدھی وہ بھی انتہائی تکلیف دہ۔ سماج میں رہنے والے ہر فرد کی ایک حقیقت ہوتی ہے اور وہ اپنی ذاتی زندگی میں امن اور سکون چاہتا ہے۔ اس کی بھی خواہش ہوتی ہے تمام لوگوں کی طرح وہ اپنی مرضی سے جیئے۔ لوگ اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں۔ سلیم احمد "پاکستان اور اقلیتیں" میں اس سے متعلق لکھتے ہیں: "ہندو اور مسیحی لڑکیوں کو اغوا کر کے زبردستی مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے. سندھ میں ۹۰ فیصد لڑکیوں کو اغوا کر کے مسلمان کیا جاتا ہے۔"(۵۴)

پاکستان میں اقلیتوں کے مذہبی تحفظ کے لیے تمام قانون موجود ہیں۔ اور قانون کا صحیح استعمال کرانا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس طرح کے فعل کو روکنے کے لیے ضروری ہے کہ اگر تمام شواہد سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ ملزم نے جرم کیا ہے تو پھر بغیر کسی خوف کے اسے کڑی سے کڑی سزا دی جائے تاکہ باقی لوگوں کے لیے اس مجرم کو عبرت کا نشانہ بنایا جا سکے تو اس طرح کے واقعات میں بہت حد تک کمی واقع ہو جائے گی۔ بل کہ اس طرح کے واقعات ہونا ہی بند ہو جائیں گے۔ کیوں کہ جبراً کسی کو بھی مسلمان کیا جا سکتا ہے مگر اس کے دل سے اس کے اپنے مذہب کی چاہت نہیں نکالی جا سکتی۔ بملا کماری کے بیٹے بلال کو جب اپنی ماں کی زندگی کی حقیقت اور ناگہانی موت کی حقیقت معلوم ہوئی تو اس کا رد عمل ناول "کہر" کے اس اقتباس میں ملاحظہ کریں "میری رگوں میں جو خون ہے وہ زبردستی دوڑایا گیا ہے۔ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی رگ کاٹ کر اسے زمین پر بہا دوں۔"(۵۵)

پاکستان میں جبری تبدیلی مذہب دفاع کی تنظیم کو قومی بنیادوں پر قائم کرنا اور اسے حالات کے مطابق تحفظ فراہم کرنا اور اسی ترقی دیتے رہنا عوام اور حکومت دونوں کا فرض ہے۔ ضروری ہے کہ ہم تحمل مزاجی سے فیصلہ کریں کہ جبری تبدیلی مذہب کی روک تھام کے لیے کسی نہ کسی حیثیت سے ضرور حصہ لیں گے۔ اگر

ہر شخص اپنے اندر یہ جذبہ پیدا کرے تو چند ہی دنوں میں تربیت یافتہ لوگوں کی ایک مضبوط جماعت تیار ہو سکتی ہے۔ جو اس طرح کے مسائل کو بھرپور طریقے سے حل کرائے ارلی وارننگ سسٹم ہیلپ لائن کی طرح۔ تاکہ پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت پورے احترام کے ساتھ اپنے مذہب پر قائم رہیں۔۔ "مذہبی تنوع کا احترام" میں بھی اس مسئلے پر یوں لکھا ہے: "بدقسمتی سے آج مسلمانوں میں بعض ایسے گروہ پیدا ہو گئے ہیں جو مذہب کے معاملے میں جبر کے قائل ہیں۔"[۵۶]

اللہ پاک نے مذہب کے انتخاب میں جبر کو روا نہیں رکھا تو اس لیے کہ وہ انسانوں کو انتخاب کا حق دینا چاہتے ہیں۔ اب اس حق کو کسی نے انصاف اور دیانت کے ساتھ استعمال کیا اور کسی نے اسے مذہبی تعصب یا کسی مفاد کے تابع رکھا۔ اس کا فیصلہ اللہ پاک نے واضح کر دیا ہے کہ وہ قیامت کے روز خود کریں گے۔ اس میں دوسرے انسانوں کا کوئی اختیار نہیں کہ وہ دوسروں کے مذہب تبدیل کراتے پھریں۔ اس لیے کسی کو بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اقلیتوں کو اپنے مذہب کا بالجبر پابند بنائے۔ لیکن سماجی رویوں سے عوام بعض اوقات اس کا ادراک نہیں کر پاتی اور ان کے ساتھ امتیازی سلوک کر جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہندو اور عیسائی اقلیت اپنے آپ کو غیر محفوظ خیال کرتے ہیں۔ "ول کیملیکا" کی تھیوری بھی اس بات کی پر زور حمایت کرتی ہے کہ اقلیتوں کے مذہبی حقوق کے معاملے کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو دور کیا جائے۔۔ ایسے میں ہمارا فرض ہے کہ زیادہ سے زیادہ وہ طریقے اپنائیں جن کو بروئے کار لا کر ہم بھی ان کی سماجی انسانیت کے طور پر خاطر خواہ حفاظت کر سکیں۔ سندھ اسمبلی نے ایک نہایت احسن قدم اس معاملے پر اٹھایا ہے وہ یہ کہ پاکستان نے ہندو اور عیسائی اقلیتوں کے حق میں ایک بل پاس کیا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پاکستان میں آباد ہندو اور عیسائی اقلیت کی جبری تبدیلی مذہب کی روک تھام کے لیے نومبر ۲۰۱۶ء میں سندھ اسمبلی نے جبری تبدیلی مذہب کے خلاف اتفاق رائے سے بل منظور کیا جو کہ اس سے پہلے ۲۰۱۵ء میں سندھ اسمبلی میں پیش کیا گیا تھا۔ لیکن اس بل کی شدید مخالفت کی گئی۔ پھر ۲۲ مارچ ۲۰۱۹ء میں گھوٹکی میں دو نابالغ ہندو اقلیت لڑکیوں کو مبینہ طور پر اغوا کرنے کے بعد جبراً اسلام قبول کروایا گیا۔ اس حادثے کے بعد ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان نے سندھ اسمبلی سے پر زور مطالبہ کیا کہ وہ جبری تبدیلی مذہب کو روکنے کے لیے موثر اقدامات کریں۔ اور اس بل کو منظور کریں۔ چنانچہ پاکستان سندھ اسمبلی میں ۲۰۱۹ء میں جبری تبدیلی مذہب ترمیمی بل پیش کیا گیا۔ جو کہ مسلم لیگ فنکشنل کے اقلیتی رکن

آنند کمار گوکلانی کی جانب سے پیش کیا گیا اور ڈاکٹر کھٹومل جیون نے اس بل کو سندھ اسمبلی میں متعارف کروایا۔ اور وہ اتفاق رائے سے منظور ہو گیا۔ اس بل کے تحت پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت کو جبراً مذہب تبدیل کروانے والے کو پانچ سال قید اور جرمانے کی سزا سنائی جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ شق بھی رکھی گئی کہ اپنی مرضی اور دلی خوشی سے مذہب تبدیل کرنے کی عمر کی حد کم از کم ۱۸ سال ہونا از حد ضروری ہے۔ اس سے کم عمر افراد نے اگر مذہب تبدیل کیا تو اس کو مذہب تبدیل کرنا تصور نہیں کیا جائے گا۔ اقلیتوں کے مذہبی تحفظ کے لیے بنائے گئے قانون کی تفصیل مفہوم کی صورت میں مندرجہ ذیل ہے:

حکومت کا کردار

اس قانون کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے قانون نافذ کرنے والے تمام متعلقہ اداروں کو ہر صورت اس پر عمل درآمد کروانا پڑے گا۔ اور جبری تبدیلی مذہب کے واقعات کی روک تھام کے لیے اس بل کو الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے توسط سے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں متعارف کرایا جائے گا۔ تاکہ ہر عام و خاص پاکستانی اور اقلیتی عوام اس بل کے تمام مندرجات سے واقف ہو سکیں۔ اور ان کے دل میں یہ ڈر اور خوف پیدا ہو کہ اگر انھوں نے ایسا کوئی بھی فعل کیا تو وہ اس بل کے قانون کے تحت قانون کی گرفت سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکیں گے۔ اور جبراً مذہب تبدیل کیے جانے والے ہندو اور عیسائی اقلیت کے لیے خصوصی پناہ گاہیں بھی مہیا کی جائیں گی۔ اور اس دوران کوئی بھی شخص اس متاثرہ فرد کی مدد کرتا ہے تو اس کے لیے بھی وہ تمام سہولیات میسر ہوں گی جو اس متاثرہ شخص کے لیے ہیں۔ مثلاً پناہ دینا، قانونی طور پر مدد کرنا، طبی سہولیات وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی صحت کے مسائل، تعلیم کے مسائل، عورتوں کی معاشرتی فلاح، اور اقلیتی مزدور کے مسائل بھی حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ نیز عدالتوں کو بھی پابند کیا گیا ہے کہ جب تک نوٹیفکیشن جاری نہیں کیے جاتے تو مجاز دائرہ اختیار کی عدالتیں اس ایکٹ کے تحت آنے والے تمام مقدمات کی سماعت کریں گی۔ اور اس تمام عمل کے دوران جو بھی عملہ اس حوالے سے کام کرئے گا اسے اضافی بجٹ، وسائل اور عملہ مہیا کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری ہو گی۔

اس بل میں اقلیتوں کو جبری تبدیلی مذہب کا تحفظ دینے کے ساتھ ساتھ مذہب تبدیل کرنے کے لیے عمر کی حد بھی مختص کی گئی ہے جس کے تحت:

مذہب تبدیلی کی عمر

مندرجہ بالا آرٹیکل میں یہ بات بالکل واضح کی گئی ہے کہ پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت کا کوئی بھی نابالغ بچہ اپنا مذہب تبدیل نہیں کرے گا جب تک وہ جوانی کی عمر کو نہیں پہنچتا۔ یہ قانون اس لیے بنایا گیا ہے کہ کم عمری میں سمجھ بوجھ کچھ خاص نہیں ہوتی اور بعض اوقات مذہب کے بارے میں زیادہ معلومات بھی نہیں ہوتیں۔ اور پھر یہ خدشہ بھی ہے کہ کہیں بچے کو اچھا کھانا کھلا کر، یا کسی بھی چیز کا لالچ دے کر، یا تحفے تحائف دے کر، یا بہلا پھسلا کر، ورغلانہ لیا جائے کیوں کہ بعض دفعہ مالی حالات اچھے نہ ہونے کی وجہ سے بچے چیزوں کی لالچ میں آکر سوچے سمجھے بغیر کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ اگر اقلیتی بچہ اپنا مذہب تبدیل کرتا ہے تو اس کا مذہب تبدیل تصور نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اپنی مرضی سے مذہب تبدیل کرتا ہے تو اس صورت میں اس بچے کے سرپرست کو یہ اختیار حاصل ہو گا کہ وہ اس کے بارے میں مذہب تبدیل کرنے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ اور وہ فیصلہ قابل قبول ہو گا۔ اس کے ساتھ اس آرٹیکل کے تحت اگر کوئی شخص کسی اقلیتی فرد کو زبردستی مذہب تبدیل کرواتا ہے تو اس کے خلاف قانونی کاروائی کی جائے گی اس آرٹیکل کی رو سے:

جبری مذہب تبدیل کروانے کی سزا

اس آرٹیکل کے تحت کوئی بھی فرد جو کسی بھی اقلیتی شخص کو زبردستی مذہب تبدیل کروائے گا اسے پانچ سال قید اور ساتھ میں جرمانہ بھی ہو گا۔ یعنی کسی دوسرے شخص کو جبراً مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے قید کی سزا اور جرمانے کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ جو کہ اس پورے آرٹیکل کا انتہائی اہم نکتہ ہے۔ کیوں کہ آئے دن مذہب تبدیل کرانے کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ اگر صحیح معنوں میں اس آرٹیکل پر حکومت عمل درآمد کرائے تو پاکستانی اقلیتوں کے مذہبی مسائل پر آسانی سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس قانون کے بعد اقلیتی طبقے کو اطمینان کا احساس تو ضرور ہونا چاہیے۔ کیوں کہ یہ خصوصی طور پر پاکستانی اقلیتوں کے مذہبی تحفظ کے لیے بنایا گیا ہے۔ جو کہ ایک انتہائی خوش آئند اقدام ہے۔ اور اس بل کو پاس کرنے کا مقصد اقلیتوں کو مذہبی آزادی فراہم کرنا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد الیاس، کہر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۳

۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور معاشرہ، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۵۰

۳۔ صفدر زیدی، بھاگ بھری، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۴۰۴

۴۔ روبینہ سہگل، عورت اور مزاحمت (محنت کش عورتوں سے مکالمہ)، مشعل، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۲۵۹

۵۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۴۵۴

۶۔ روبینہ سہگل، عورت اور مزاحمت (محنت کش عورتوں سے مکالمہ)، ص ۲۵۸

۷۔ سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں، ادارہ تعلیم و تحقیق، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۴۵

۸۔ ایضاً، ص ۴۵

۹۔ صفدر زیدی، بھاگ بھری، ص ۲۸

۱۰۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور معاشر، ص ۵۱

۱۱۔ خالد فتح محمد، زینہ، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۲۹۲

۱۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور معاشرہ، ص ۵۱

۱۳۔ نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۲۰۹

۱۴۔ محمد متین خالد، آزادی اظہار کے نام پر (ترتیب و تحقیق)، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۹۰

۱۵۔ نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، ص ۲۱۹

۱۶۔ محمد متین خالد، آزادی اظہار کے نام (ترتیب و تحقیق)، ص ۹۰

۱۷۔ محمد الیاس، کہر، ص ۳۷

۱۸۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور معاشرہ، ص ۵۶

۱۹۔ نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، ص ۲۰۵

۲۰۔ محمد متین خالد، آزادی اظہار کے نام پر (ترتیب و تحقیق)، ص ۱۱۹

۲۱۔ نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، ص ۲۰۷

۲۲۔ آغا امیر حسین، بھارت اور امریکہ پاکستان کے دوست یا دشمن، کلاسیک دی مال، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۱۷

۲۳۔ صفدر زیدی، بھاگ بھری، ص ۲۲۶، ۲۲۷

۲۴۔ ادارہ تعلیم و تحقیق، سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں، ص ۲۲۸

۲۵۔ صفدر زیدی، بھاگ بھری، ص ۲۲۸

۲۶۔ احمد سلیم، پاکستان اور اقلیتیں، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۳۹۱

۲۷۔ خالد فتح محمد، زینہ، ص ۳۶۹

۲۸۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور معاشرہ، ص ۵۸

۲۹۔ خالد فتح محمد، زینہ، ص ۳۶۹

۳۰۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور معاشرہ، ص ۳۵

۳۱۔ ایضاً، ص ۳۸

۳۲۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، ص ۴۷

۳۳۔ ادارہ تعلیم و تحقیق، فقہا اور غیر مسلم اقلیتیں، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۵

۳۴۔ فادر عمانوئیل یوسف، جائزہ انسانی حقوق، مذہبی اقلیتوں کی صورتحال پر سالانہ رپورٹ، قومی کمیشن برائے امن وانصاف، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۴

۳۵۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، ص ۵۶۴

۳۶۔ جنید قیصر، پاکستانی اقلیتوں کا نوحہ، ص ۱۴

۳۷۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، ص ۵۶۸

۳۸۔ احمد سلیم، پاکستان اور اقلیتیں، ص ۳۹۰

۳۹۔ مذہبی تنوع کا احترام، ادارہ تعلیم و تحقیق، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۱۴

۴۰۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، ص ۵۶

۴۱۔ جنید قیصر، پاکستانی اقلیتوں کا نوحہ، ص ۳۲

۴۲۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، ص ۵۶۹

۴۳۔ مذہبی تنوع کا احترام، ادارہ تعلیم و تحقیق، ص ۱۵

۴۴۔ شمائلہ خان، اقلیتوں کے تحفظ کے لیے ارلی وارننگ سسٹم، بی بی سی نیوز، اردو، ۲۰۱۴ء

۴۵۔ صفدر زیدی، بھاگ بھری، ص ۲۲۹، ۲۳۰

۴۶۔ محمد بن الحسن الشیبانی، السیر الکبیر، املاو شرح، محمد بن احمد سرخسی، تحقیق، صلاح الدین المنجد، عبد العزیز احمد، جامعہ معتۃ الدول العربیہ، القاہرہ، ۱۹۷۷ء، ص ۱۰۳

۴۷۔ صفدر زیدی، بھاگ بھری، ص ۲۳۵

۴۸۔ فقہاء اور غیر مسلم اقلیتیں، ادارہ تعلیم و تحقیق، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۶

۴۹۔ صفدر زیدی، بھاگ بھری، ص ۲۳۶، ۲۳۷

۵۰۔ جنید قیصر، پاکستانی اقلیتوں کا نوحہ، ص ۴۹

۵۱۔ محمد الیاس، کہر، ص ۳۰

۵۲۔ سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں، ادارہ تعلیم و تحقیق، ص ۱۲

۵۳۔ محمد الیاس، کہر، ص ۳۰

۵۴۔ سلیم احمد، پاکستان اور اقلیتیں، ص ۳۹۱

۵۵۔ محمد الیاس، کہر، ص ۳۰۱

۵۶۔ مذہبی تنوع کا احترام، ادارہ تعلیم و تحقیق، ص ۱۴

باب پنجم

ماحصل

"شوکت صدیقی"، "مستنصر حسین تارڑ"، "علی اکبر ناطق"، "محمد الیاس"، "نیلم احمد بشیر"، "صفدر زیدی"، اور "خالد فتح محمد" کا شمار پاکستان کے ان نمائندہ ناول نگاروں میں ہوتا ہے. جنھوں نے اقلیتی طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں اور ان کے مسائل کو اپنے ناولوں میں جگہ دی ہے۔انھوں نے اقلیتوں کے مسائل کے موضوعات پر قلم اٹھایا اور انھیں خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ ان ناول نگاروں نے اقلیتوں کی روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل اور واقعات میں اپنے سحر کار قلم سے اتنی شدت اور جاذبیت بھر دی ہے کہ قاری ان کے اسلوب کا قائل ہو جاتا ہے۔ ان کے ناولوں کی بنیاد جیتے جاگتے اقلیتوں پر ہے۔ جو اپنی شناخت اپنے ملک سے مربوط کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں اقلیتوں کا بھی ہر کردار بڑی عمدگی اور سلیقے سے اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ انھوں نے اقلیتوں کے مسائل اور کرب کو ناولوں کی شکل دے کر قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان ناولوں میں ہمیں زمانے کی تلخیوں اور ناکامیوں کے دل گداز مرقعے ملتے ہیں۔ یہ ناول نگار ارد گرد کی زندگی اور اس کے مناظر سے کوئی ایسی بات منتخب کرتے ہیں جو بہ ظاہر عام اور کئی بار کی دیکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور کوئی اسے اہم نہیں سمجھتا مگر یہ ناول نگار اس کے ایسے ایسے گوشے سامنے لاتے ہیں اور ناول کو اقلیتوں کے مسائل سے اس طرح ہم آہنگ کر دیتے ہیں کہ وہی عام اور معمولی مسئلہ غیر معمولی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے ناولوں کی زبان سادہ، سلیس اور رواں دواں ہے۔ کہ ناول پڑھتے ہوئے کہیں بھی قاری کو اکتاہٹ اور ذہنی الجھن کا احساس نہیں ہوتا۔ اقلیتوں کے مسائل کی عکاسی کرنے والا "شوکت صدیقی" کا ناول "جانگلوس" تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس ناول کی جلد سوم میں دوسرے بھٹہ مزدوروں کے ساتھ عیسائی بھٹہ مزدوروں کے بھی قابل رحم اور دردناک حالات بیان کیے گئے ہیں۔ کہ بھٹہ مالکان کس طرح عیسائی اقلیتوں کا استحصال کرتے ہیں۔ انھیں پیشگی کے نام پر قرضے کے جال میں اس طرح جکڑتے اور قید کرتے ہیں کہ وہ پر تک نہیں مار سکتے۔ "شوکت صدیقی "نے عیسائیوں کے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم کی عکاسی اس کرب ناک انداز سے کی ہے کہ پڑھنے کے بعد قاری کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔" شوکت صدیقی" نے زمانے کی بے رحم حقیقتوں کو بیان کیا ہے۔ ان کے ناول میں معاشی بدحالی کا شکار عیسائی اقلیت فاقہ

کشی کرنے پر مجبور ہیں۔ انھوں نے اس مظلوم طبقے کی زندگی کا ایسا حقیقی نقشہ کھینچا ہے کہ پڑھنے کے بعد انسان ایک کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اقلیتوں کے مسائل کے حوالے سے دوسرا اہم ناول " مستنصر حسین " تارڑ کا " راکھ " ہے۔ " راکھ " بنیادی طور پر تقسیم ہند کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ ناول میں کہانی واقعات کے بجائے کرداروں کے توسط سے آگے بڑھتی ہے۔ ناول کے کرداروں کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں میں گھرے ہوئے ہیں جو بے حس ہیں۔ ناول میں عیسائی اور ہندو اقلیتوں کے ساتھ ہونے والے مسائل اور تذلیل کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ناول میں بے حس، انسانیت کی تذلیل، جلاؤ گھراؤ، قتل و غارت وغیرہ کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ راکھ ایک المیہ ہے۔ ایک ایسا المیہ جس نے ہنستے بستے شہر کو تباہ کر دیا۔ تقسیم کے المیے نے لاہور کے چہرے پر ایسے وار کیے کہ لاہور کا خوب صورت چہرہ راکھ سے اٹ گیا۔ وہ انسانیت کی راکھ تھی۔ جلتے ہوئے ہندو عبادت گاہوں کی راکھ تھی۔ اقلیتوں کے مسائل کے حوالے سے ایک اور ناول "نو لکھی کوٹھی " ہے۔ جو " علی اکبر ناطق " کی قلم کا شاہکار ہے۔ یہ ایک تاریخی ناول ہے۔ جو متحدہ ہندوستان کے وسطی پنجاب میں ۱۹۳۰ء کی دہائی سے ۱۹۹۰ء کی دہائی تک کی نصف صدی پر محیط ہے۔ یہ ناول ایک ریٹائرڈ انگریز افسر ولیم کے گرد گھومتا ہے۔ تقسیم کے بعد جب پاکستان وجود میں آتا ہے تو ولیم نو لکھی کوٹھی کو چھوڑ کر جانے کے لیے کسی بھی صورت تیار نہیں ہوتا یہاں تک کہ اس مٹی کی محبت میں اس نے اپنی شریک حیات اور بچوں کو بھی ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا۔ اور بدلے میں اسے صرف پریشانیوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اس کا آخری ٹھکانہ بھی چھین لیا جاتا ہے ۔اس کے ساتھ ساتھ " علی اکبر ناطق " نے چھوٹے کاشت کاروں اور مزدوروں کے مسائل کو بھی زیر بحث لایا ہے۔ ناول کا ہر جملہ اتنا جامع اور مکمل ہے کہ قاری کا تجسس برقرار رہتا ہے۔ اور قاری پورے انہماک کے ساتھ ناول پڑھتا چلا جاتا ہے۔ " علی اکبر ناطق " نے انتہائی فطری اور بے ساختہ انداز میں اقلیتوں کے مسائل کو اس ناول میں پیش کیا ہے یہ ناول اقلیتوں کے مسائل کا آئینہ دار ہے۔ اقلیتوں کے مسائل کے حوالے سے ایک اور اہم ناول " محمد الیاس " کا " کہر " ہے۔ اس ناول کی کہانی ذوالقرنین اور عیسائی اقلیت مارگریٹ کے گرد گھومتی ہے۔ ناول میں اقلیتوں کے حوالے سے مختلف توہمات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ " محمد الیاس " نے تقسیم ہند سے لے کر اسی (۸۰) کی دہائی تک کے پاکستان کے حالات کو اس ناول کا موضوع بنایا ہے۔ محمد الیاس نے اس ناول میں عیسائی اقلیتوں کے معاشی، سماجی اور مذہبی حقائق کی عکاسی اور ترجمانی فنی چابک دستی سے کی

ہے۔ غم جاناں ہو یا غم دوراں بنیادی سہولتوں سے محروم اقلیتوں کی بے بسی اور استحصالی طبقے کی سنگ دلی کا ذکر حقیقت پسندی سے کیا گیا ہے۔ کہ قاری بھی اپنے دل میں وہی درد و کرب کا جذبہ لہریں لیتے ہوئے محسوس کرتا ہے جو "محمد الیاس" اپنے دل میں لے رہے ہوتے ہیں۔

امریکی مسلمان اقلیت کے مسائل کے حوالے سے "نیلم احمد بشیر" کا ناول "طاؤس فقط رنگ" بہت اہمیت کا حامل ہے۔ " نیلم احمد بشیر " نے ناول کا نام علامہ اقبال کے شعر سے مستعار لیا ہے۔ " نیلم احمد بشیر " نے بہت جان دار اصطلاح استعمال کی ہے۔ جیسے مور کے پروں کی خوب صورتی اور رنگینی بے مثال ہے۔ اسی طرح امریکہ میں روشنی، مغربی تہذیب کی رنگینی اور خوب صورتی وغیرہ اور زندگی کی تمام سہولیات میسر ہیں۔ لیکن رشتوں میں دوریاں، بے حسی اور لاپرواہی عروج پر ہے۔ اس ناول کا موضوع نائن الیون کا حادثہ ہے۔ اس حادثے کے بعد انتقام، حملے، نفرتیں، تعصب دہشتگردی کے الزام کا امریکہ کی طرف سے امریکی مسلمان اقلیت کے لیے آغاز ہوا۔ اس واقعہ کی ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی گئی۔ اور مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دیا جانے لگا۔ یہ ناول پیدائشی امریکی اور غیر ملکی افراد کی کہانی ہے۔ یہ ناول سماجی، معاشی، دہشت گردی، نسل پرستی وغیرہ جیسے موضوعات کا حامل ہے۔ اس ناول میں " نیلم احمد بشیر " نے امریکی سماج کی گمراہیوں، تلخ رویوں، امریکی مسلمان نوجوانوں کے ناجائز تعلقات اور نفسیاتی الجھنوں کو موضوع بنایا ہے۔ ناول میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سنہرے مستقبل کی خاطر امریکہ جانے والوں کو کن کن صبر آزما مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اقلیتوں کے مسائل کے حوالے سے "صفدر زیدی" کا ناول "بھاگ بھری" بھی اہم ہے۔ ناول "بھاگ بھری" مجموعی طور پر تین حصوں پر مشتمل ہے۔ "بھاگ بھری" کی کہانی ۱۹۸۵ء میں ہندوستان کے اس حصے سے شروع ہوتی ہے جس کا نام اس وقت پاکستان تھا۔ ساری کہانی ہندو اچھوت بھاگ بھری اور اس کے ناجائز بیٹے ساون کے گرد گھومتی ہے۔ ساون وڈیرے کے ظلم و ستم سے تنگ آکر وہاں سے راہ فرار اختیار کرتا ہے لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہ جہاد کے نام پر ایک دہشت گرد تنظیم کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ اور وہ جہاد کے نام پر اس کی ایسی تربیت کرتے ہیں کہ اسے قتل کرنے اور کسی کا خون بہانے کے بعد ہی سکون ملتا ہے۔ "صفدر زیدی " اپنے ناول "بھاگ بھری" میں استحصالی اور طبقاتی نظام کی ناانصافیوں کی وجہ سے غربت اور افلاس کے مارے ہوئے اچھوت ہندو اقلیتوں کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتے ہیں۔ ان کا ناول ایک دردمند، حساس، ذہن و دل کا عکاس ہے۔ وہ ایسے حادثات پر بھی تڑپتے ہیں جنھیں کوئی حادثات سمجھنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ان کا دل ایسے

المیوں پہ بھی خون کے آنسو روتا ہے جنھیں لوگ المیہ تسلیم ہی نہیں کرتے۔"صفدر زیدی" کے ناول میں سماجی کرب اور جبر کا گہرا شعور پایا جاتا ہے۔اور اس کرب اور جبر کو وہ اپنے ناول کا موضوع بناتے ہوئے خود بھی تڑپتے ہیں قاری کو بھی تڑپاتے ہیں۔وہ بھاگ بھری اور اس کے بیٹے ساون کے کرب اور جبر کے الفاظ کو ایسے سانچے میں ڈھالتے ہیں کہ پڑھ کر قاری تڑپ جاتا ہے۔

"خالد فتح محمد" کا ناول "زینہ" بھی عیسائی اقلیتوں کے مسائل کی نشان دہی کرتا ہے۔اس ناول میں عیسائی اقلیتوں کے مسائل اور ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔یہ ایک موضوعی ناول ہے۔جسے "خالد فتح محمد" نے بیانیہ انداز میں صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے۔"خالد فتح محمد" نے سماجی اور تعصبی خرابیوں پر کھل کر تنقید کی ہے۔ان سماجی خرابیوں میں وہ خرابیاں بھی موجود ہیں جو ملک کے زوال شدہ سماج میں پہلے سے موجود تھیں اور وہ خرابیاں بھی ہیں جو سماج میں راہ پا رہی ہیں۔"خالد فتح محمد" نے مذہب سے بیگانگی،اقدار کی زوال پذیری،معاشی بدحالی،رویوں کے تضادات،احساس محرومی اور نفرت انگیز انسانی رویوں کو اپنے ناول کے ذریعے پیش کیا ہے۔انھوں نے ایک سچے فنکار کی طرح اپنے ذاتی علم، ذاتی بصیرت، ذاتی مشاہدے کے ستونوں پر اپنے ناول کی عمارت استوار کی ہے۔سماجی مسائل کا سامنا دنیا کے تمام معاشروں کو ہوتا ہے۔پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت بھی بہت سے سماجی، معاشی اور مذہبی مسائل نے گھیرے ہوئے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان مسائل کو کتنی توجہ دی جاتی ہے اور ان کے حل کے لیے کیا اقدامات اٹھائے جاتے ہیں۔جب ان تمام مسائل کو بروقت توجہ نہیں دی جاتی اور ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہی مسائل سماج کے لیے ایک سنگین صورت حال اختیار کر لیتے ہیں اور سماج پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔سماج بے روزگاری، عدم تحفظ، معاشی ابتری جیسے مسائل کا شکار ہو جاتا ہے۔پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے اور ان تمام سماجی مسائل کا سامنا کر رہا ہے۔جو دیگر ترقی پذیر ممالک کو بھی درپیش ہیں۔ تاہم عدم استحکام کی وجہ سے اس کے سماجی مسائل اور بھی خطرناک صورتیں اختیار کر چکے ہیں۔دنیا کا کوئی بھی سماج ایسا نہیں ہے جو مکمل طور پر سماجی مسائل سے مبرا ہو کیوں کہ جب ایک سے زیادہ گروہ یا لوگ اکٹھے رہتے ہیں تو مختلف مسائل پیدا ہونا لازمی امر ہے۔سماجی مسائل کے کسی بھی سماج پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں جس میں سے اہم اثر سماج کے امن و استحکام اور لوگوں کی زندگیوں پر پڑتا ہے۔جس سے سماج میں جارحیت اور عداوت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔جو سماج میں عمومی مایوسی اور سماجی بے اطمینانی میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ مجموعی

طور پر سماجی مسائل کسی مسئلے کا حل پیش نہیں کرتے بل کہ مسائل کی شدت میں اضافہ کرتے ہیں اور لوگوں کے لیے نقصان کا باعث بنتے ہیں۔ پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت اور امریکی مسلمان اقلیت بری طرح سماجی، معاشی اور مذہبی مسائل سے متاثر ہو رہے ہیں۔ جو ان کی روز مرہ زندگی کو تلخ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ ان سماجی مسائل کو انفرادی طور پر حل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ جب سماجی مسائل کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو وقت کے ساتھ ساتھ یہ سماج کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جاتے ہیں اور سماج پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ سماجی مسائل تب جنم لیتے ہیں جب سماج کے رائج کردہ قوانین سے انحراف کیا جاتا ہے۔ ہم میں ایسی عادات و اطوار ہوں جن کی روشنی میں پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کے حقوق اور ان کی رائے کا احترام کریں۔ انھیں آزادانہ طور پر اپنی رائے دینے کا حق ہو۔ ہم اپنے اندر ان کے لیے احترام اور قوت برداشت پیدا کریں۔ جو قانون ان کے لیے بھی ہیں ان کا بھی احترام کرنا چاہیے۔ ایسا صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب تمام لوگ گروہی، علاقائی اور مذہبی تعصب سے بالا ہوں اور پاکستانی عیسائی اور ہندو اقلیتوں کے حقوق و فرائض کا پوری طرح سے علم رکھتے ہوں۔ پاکستانی عیسائی اور ہندو اقلیت محرومی اور پسماندگی کے اندھیروں سے نکل کر ترقی اور فراوانی کی روشنی میں آنے کے لیے جدوجہد کا آغاز کریں۔ انفرادیت کی سطح سے بلند ہو کر اجتماعیت کا رویہ اپنائیں۔ تا کہ زندگی کو خوش حالی کا گہوارہ بنا سکیں۔

انسان کا مصمم ارادہ اس کے کام کی تکمیل کی بنیاد بنتا ہے۔ اور اسے ترقی کے زینے بتدریج طے کرواتا چلا جاتا ہے۔ انسان کا عزم صمیم اس کی راہ میں رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتا اور یہی اس کی طاقت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستانی عیسائی اور ہندو اقلیتوں کو ترقی کرنے اور مسائل سے چھٹکارا پانے کے لیے خلوص نیت کا بھی سہارا لینا پڑے گا۔ جب تک وہ اپنے مقصد کے حصول میں خلوص نیت سے کام نہیں لیں گے اپنی منزل تک وہ نہیں پہنچ سکتے کیوں کہ نیت کا اخلاص عمل کی قوت کو بڑھاتا ہے۔ اور صحیح سمت گامزن کرتا ہے۔

اقلیتوں کے بنیادی حقوق کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ اور ملکی سطح پر ایسے اقدامات کی طرف توجہ دی جائے جو غربت، جبری مشقت، تعصب، زبردستی مذہب کی تبدیلی، عبادت گاہوں پر حملے اور اقلیتوں کے حوالے سے توہم پرستی وغیرہ جیسے مسائل کے خاتمے کا سبب بنیں۔ پاکستانی ہندو اور عیسائی نوجوانوں کو ہنر مند بنایا جائے اور نئے روزگار کے وسائل تلاش کیے جائیں تا کہ اقلیتی نوجوان روزگار حاصل کر سکیں اور ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔ امتیازی سلوک کا خاتمہ کرنے کے لیے میڈیا کو استعمال کرتے ہوئے اقلیتوں سے حسن

سلوک اور تعصبات کو دور کرنے کے متعلق آگاہی پیدا کی جائے۔ افرادی قوت کا صحیح استعمال بھی غربت ختم کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ جیسے کہ پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کو ہنر سکھائے جائیں اور ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے۔ تاکہ وہ بھی ایک خوش حال اور مطمئن زندگی گزارنے کے قابل ہو جائیں۔

تعلیم کے بغیر بھی سماجی اور معاشی مسائل کا خاتمہ ممکن نہیں۔ لہذا پاکستانی اقلیتوں کی حالت بدلنے کے لیے ان کو اور ان کے بچوں کو جہاں تک ممکن ہو سکے تعلیم دینے کا بندوبست کرنا چاہیے۔ ان لوگوں کو ترقی کرنے کے لیے تعلیم کے ذریعے منزل دکھائی ہو گی اور کسی بھی منصوبے کے آغاز کے لیے ان لوگوں میں محنت و عظمت کا جذبہ ابھارنا ہو گا۔۔ ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو دریافت کر کے استعمال میں لایا جائے۔ اور ان کی صلاحیتوں پر اعتماد کیا جائے۔ تفریح اور کھیل کود کے مواقع میسر آنے سے تھکان ختم ہو جاتی ہے۔ صحت اور قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ذہن تازگی محسوس کرتا ہے۔ اور انسان میں بہتر کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اقلیتوں کے لیے بھی کھیل کے میدان اور ایسے ذرائع ہونے چاہئیں جس سے وہ صاف ستھری تفریح حاصل کر سکیں۔ وطن عزیز پاکستان ہماری پاک سرزمین اور ہمارا پیارا خوب صورت وطن ہے۔ تمام پاکستانیوں خواہ وہ اقلیت ہوں یا اکثریت، کو تحفظ کا احساس دلاتا ہے۔ پاکستانی کہلوانے کے بجائے آج ہم پنجابی، پٹھان، ہندو، عیسائی وغیرہ کہلوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور یہیں سے مسائل کا آغاز ہوتا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم سب پاکستانی بن جائیں اور اس وطن عزیز کو صحیح معنوں میں پاکستان بنائیں۔ اور اقوام عالم کو دکھادیں کہ پاکستان حقیقت میں ایک عظیم سرزمین ہے جہاں اکثریت کی طرح اقلیتوں کو بھی تمام حقوق میسر ہیں اور وہ خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ کیوں کہ پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیت کے اپنے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں کو دیکھتے ہوئے مایوس اور نا امید ہیں۔ انھیں لگتا ہے کہ ان کے مسائل بنیادی حقوق پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہمیں یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ یہ کس صوبے، کس علاقے، اور کس مذہب کا ماننے والا ہے بل کہ اتحاد و یگانگت کے ساتھ مفاہمت اور مصالحت کے ساتھ رہنا چاہیے۔ ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ گردش زمانہ اور حالات و واقعات سے ہم سبق نہیں سیکھ رہے۔

ہمیں تعصبات کے بجائے مساوات کا خیال رکھنا چاہیے۔ اقلیت اور اکثریت کے درمیان پیدا کردہ تضادات کو ختم کر دیا جائے تو یہ اتحاد و اتفاق کی بحالی کے لیے بہت ہی خوش گوار اقدام ہو گا۔ اقلیتوں کی مذہبی آزادی اور خود مختاری کا احترام کیا جائے۔ تمام تضادات کو ختم کر کے اقلیتوں کو بھی یکساں معیار زندگی عطا کیا

جائے۔ پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کو ان کے تمام حقوق دیے جائیں ان کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھا جائے۔ اور اگر کسی بھی مصیبت میں اقلیت پھنس جائیں تو اکثریت ان کی ہر ممکن مدد کرنا اپنا فرض سمجھے انسانیت کے ناطے ۔ اقوام متحدہ بھی صرف کاغذات کی حد تک سمٹ کر رہ گئی ہے۔ اقلیتوں کے حق میں اس کے قوانین موجود ہیں مگر وہ بھی صرف کاغذی حد تک۔ اقوام متحدہ بھی انھیں لاگو کروانے میں ابھی تک ناکام ہے۔ ایسی صورت میں آئین و قانون کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ جمہوریت کا راگ الاپنے والا امریکہ بھی پاکستانی مسلمان اقلیتوں کو ذہنی اذیت دینے میں حد سے بڑھ چکا ہے۔ یہ کہاں کی جمہوریت ہے۔ مگر ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم خاموشی سے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ آج میڈیا کا دور ہے اور ہمیں مسلمان اقلیت کے لیے میڈیا کے ذریعے آواز بلند کرنی چاہیے تاکہ پوری دنیا کو امریکہ کی جارحیت اور تعصب کا پتہ چل سکے۔

پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کی مشکلات اور مسائل کے حل اور ضروریات کے حصول کے لیے انفرادی اور گروہی منصوبے بنائے جائیں اور ان پر عمل درآمد کے لیے جہاں تک ممکن ہو وسائل سے استفادہ حاصل کیا جائے۔ لوگوں کی کوششوں کو حکومت کی کوششوں کے ساتھ مربوط کر کے پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کی معاشی اور سماجی حالت کو اس طرح بہتر بنایا جائے کہ وہ قومی زندگی کا حصہ بن جائیں اور اس کی تعمیر و ترقی میں بھرپور کردار ادا کرنے کے اہل ہوں۔ اقلیتوں کے مسائل حل کرنے کے لیے اقلیتوں کے بھی دست و بازو کو کام میں لایا جانا ضروری ہے۔ ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو جلا دے کر ان کے حل پر آمادہ کرنا چاہیے۔ جب انھیں خود انحصاری کی اہمیت سے آگاہی ہو جائے گی تو وہ خود بخود کوشش کریں گے۔ کسی بھی سماج کو مضبوط اور مستحکم بنیادوں پہ استوار کرنے کے لیے ہر فرد کا ترقی کے ثمرات سے بہرہ ور ہونا لازمی ہے۔

مندرجہ بالا ان تمام اصولوں پر عمل کیا جائے اور پاکستانی ہندو اور عیسائی اقلیتوں کی ترقی پر خاص توجہ دی جائے تو پورا سماج کارآمد ہو گا اور بے روزگاری کم ہو جائے گی۔ وسائل کے صحیح استعمال سے ان کی مایوسی ختم ہو جائے گی۔ اور ان کا معیار زندگی بلند ہو گا اور یوں اقلیتیں خوش حالی کی جانب گامزن ہوں گی اور کوئی مسئلہ بھی پیدا نہیں ہو گا۔ اور ان میں خود اعتمادی پیدا ہو گی۔

نتائج

۱۔شوکت صدیقی نے "جانگلوس"(جلد سوم)، علی اکبر ناطق نے "نو لکھی کوٹھی"، خالد فتح محمد نے "زینہ" میں عیسائی طبقے کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔جب کہ مستنصر حسین تارڑ نے "راکھ" میں اور محمد الیاس نے "کہر" میں ہندو اور عیسائی دونوں طبقوں کے مسائل کو پیش کیا ہے۔صفدر زیدی نے "بھاگ بھری" میں ہندو طبقے کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔ نیلم احمد بشیر نے "طاؤس فقط رنگ" میں امریکہ میں رہائش پذیر مسلمان اقلیت کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور مذہبی تعصب کو صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے۔

۲۔"شوکت صدیقی" نے عیسائی اور "صفدر زیدی" نے ہندو اقلیت کو انتہائی کم سہولیات اور معمولی سی اجرت کے عوض سخت محنت و مشقت کرتے اور ظلم سہتے دکھایا ہے۔"شوکت صدیقی" اور "صفدر زیدی" نے ان بھٹہ مالکان اور وڈیروں کے غنڈوں کے کرداروں کو بھی سامنے لایا ہے جو ان کی آنکھ کے ذرا سے اشارے پر اقلیتوں کی کھال تک ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں۔"صفدر زیدی" نے "بھاگ بھری" میں اس کے علاوہ غربت کی انتہا، بے بسی، جبری تبدیلی مذہب، شناخت کے مسائل، جبری مشقت، اور اقلیتی عورت کا جنسی استحصال وغیرہ جیسے مسائل کو بھی پیش کیا ہے۔اور "شوکت صدیقی" نے اپنے ناول "جانگلوس"(جلد سوم) میں غربت کی انتہا، بھٹہ مالکان کے ظلم، مفلسی و بے بسی، جبری مشقت اور منفی رویوں کی عکاسی کی ہے۔

۳۔"نیلم احمد بشیر" نے ناول "طاؤس فقط رنگ" میں امریکی مسلمان اقلیت کے ساتھ نائن الیون کے واقعہ کے بعد ہونے والے بدترین سلوک کی عکاسی کی ہے۔اور ساتھ یہ بھی دکھایا ہے کہ امریکہ جا کر سنہرے مستقبل کے خواب دیکھنے والے امریکہ کی ثقافت میں رنگ کر کس طرح خشک پتوں کی طرح انجانی راہوں میں بکھر جاتے ہیں ۔ اور اس کے ساتھ مذہبی تعصب، طاقت وروں کے ظلم و ستم، سماجی جبر کے خلاف باغیانہ رویے، بے بسی اور حب الوطنی کی سزا وغیرہ جیسے مسائل کی عکاسی کی ہے۔

۴۔"مستنصر حسین تارڑ" نے ناول "راکھ" کے ذریعے ہندوؤں کے مذہبی مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ کہ کس طرح بابری مسجد کی شہادت کے بعد پاکستان میں ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ عیسائی اقلیت کی غربت و مفلسی پر سے بھی پردہ اٹھایا ہے اور ہندووں کی حب الوطنی، املاک پر قبضہ، اور سماج کے خوف کو بھی موضوع بنایا ہے۔"محمد الیاس" نے بھی ناول "کہر" میں ہندو اور عیسائی دونوں طبقوں کے ساتھ ہونے والی

ناانصافیوں اور زیادتیوں کو جزئیات نگاری کے ساتھ سامنے لایا ہے۔ جن میں جبری تبدیلی مذہب، املاک پر قبضہ، توہم پرستی، نفرت انگیز گفتگو وغیرہ شامل ہیں۔

۵۔ "علی اکبر ناطق" نے اپنے ناول "نولکھی کوٹھی" میں عیسائی طبقے کے مسائل کو موضوع بنایا ہے اور ان کی حب الوطنی کے نتیجے میں ان کو انھی کی جائیداد سے جبراً بے دخل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ روا رکھے جانے والے تعصب، ناروا سلوک، مفلسی و بے بسی اور سیاسی اجارہ دار طبقے وغیرہ کو اجاگر کیا ہے۔

۶۔ "خالد فتح محمد" کا ناول" زینہ "عیسائی طبقے کے مسائل کے ارد گرد گھومتا ہے۔ جس میں مذہبی اجارہ دار طبقے کی ناانصافیاں، اقلیتی خواتین کا جنسی استحصال، شناخت کا مسئلہ، سماجی منفی رویے، سماج کا خوف وغیرہ کو موضوع بنایا ہے۔

۷۔ اقلیتوں کے ساتھ معاشی، سماجی اور مذہبی سطح پر امتیازی سلوک ہو رہا ہے کیوں کہ ذات پات کے نظام کو آج بھی اہمیت حاصل ہے۔ اکثر علاقوں میں اقلیتوں کے بڑی تعداد جاگیر داروں، وڈیروں اور بھٹہ مالکان کے رحم و کرم پر ہے۔ اور ان سے غیر انسانی سلوک کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اقلیتوں کے مسائل کی وجہ مذہبی ہی نہیں بل کہ معاشی اور سماجی بھی ہے۔ عموماً یہ لوگ غربت اور استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ اقلیتی شہریوں کو سماجی امتیاز اور تعصب کے سبب ترقی کے مواقع نہیں ملتے۔ تعلیم یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کی اکثریت بہت ہی قلیل معاوضے کے بدلے انتہائی مشکل کام کرتی ہے۔ اس کے خاتمے کے لیے سماجی سطح پر آگاہی کی مہم چلائی جائے تا کہ اقلیتوں سے حسن سلوک سے پیش آنے کا شعور بڑھے اور جو منفی شعور اقلیتوں کے حوالے سے اکثریت کے ذہنوں میں ہے وہ باہمی رابطوں کے ذریعے ختم ہو سکے۔

۸۔ دنیا میں شاید کوئی سماج ایسا ہو جہاں اقلیتوں کے حقوق شکنی کی شکایت نہ ہو۔ پاکستان میں یہ معاملہ ہمہ جہتی ہے۔ پاکستان آئینی طور پر اسلامی ملک ہوتے ہوئے اقلیتوں کو جانی اور مالی تحفظ دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلسل ایسے واقعات ہوتے آئے ہیں اور ہو رہے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں اقلیتیں مندرجہ بالا مسائل کا شکار ہیں۔ آئین میں اقلیتوں کو حقوق کی ضمانت دی گئی ہے لیکن یہ حقوق صرف آئین کی حد تک ہیں۔ اگر آئین میں اقلیتوں کو دیے گے حقوق عملی طور پر بھی دیے جائیں تو اقلیتوں کے مسائل نہ ہونے کے برابر رہ جائیں گے۔

۹۔اس وقت امریکہ آزادی کی علامت ہے۔اس کو انسانی حقوق کے تحفظ کا ضامن گردانا جاتا ہے لیکن مسلمان اقلیت پر جھوٹے مقدمات بنا کر انھیں تنگ کیا جاتا ہے۔امریکہ میں مسلمان اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے طرح طرح کے مسائل جھیل رہے ہیں۔امریکہ اپنے آپ کو اعلی اقدار کا حامل سمجھتا ہے لیکن جس ریاست میں اقلیتیں خود کو غیر محفوظ سمجھیں وہ سماج یقیناً اعلیٰ اقدار کا حامل نہیں ہو سکتا۔

۱۰۔اقلیتوں کے لیے اس کرہ ارض کو امن کا گہوارہ بنانے کے لیے "ول کیملیکا" کے نظریات سے استفادہ کرنا چاہیے۔

سفارشات

ا۔اقلیتی خواتین وڈیروں ، بھٹہ مالکان اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں استحصال کا شکار ہو رہی ہیں۔ان کے استحصال کے کئی پہلو ہیں۔اس ضمن میں اقلیتی خواتین کے مسائل پر الگ سے تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔

۲۔نائن الیون کا واقعہ اور مسلم اقلیت کے لیے نفرت انگیز واقعات اور دو رخا پن یہ پہلو بھی الگ سے تحقیق کا تقاضا کرتا ہے۔

۳۔ پاکستانی اردو ناولوں میں اقلیتی بچوں سے جبری مشقت اور ناروا سلوک کے حوالے سے بھی تحقیق وقت کی اہم ضرورت ہے۔

بنیادی ماخذ (WORKING BIBLIOGRAPHY)

شوکت صدیقی، جانگلوس (جلد سوم)، رکتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۸ء

مستنصر حسین تارڑ، راکھ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء

محمد الیاس، کہر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء

صفدر زیدی، بھاگ بھری، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء

خالد فتح محمد، زینہ، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء

ثانوی ماخذ (SECONDRY SOURCES)

ابو للیث صدیقی، ڈاکٹر، آج کا اردو ادب، فیروز سنز، کراچی، ۱۹۷۰ء

ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ، بخاری الصحیح، بیروت، دارالقلم، ۱۹۸۱ء

احتشام حسین، افکار و مسائل، فروغ اردو، لکھنو، ۱۹۶۳ء

احمد سلیم، پاکستان اور اقلیتیں، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۰ء

اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، ادب اور انقلاب، نیشنل ہاوس، بمبئی، س ن

اشفاق احمد خان، ناول کے اوصاف، علم و عرفان پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء

اکبر رحمانی، اقلیتوں کے تعلیمی حقوق اور مسائل، ایجو کیشنل اکادمی پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء

امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی، سنن ابو داؤد شریف، (مترجم) مولانا خورشید حسن قاسمی، مکتبہ العلم، لاہور، ۲۰۱۸ء

انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، س ن

انسانی حقوق اور اسلامی نقطہ نظر، ایفا پبلی کیشنز، ۲۰۱۱
اے۔بی۔اشرف، ادب اور سماجی مسائل، کاروان ادب، لاہور، ۱۹۸۰ء
آغا امیر حسین، بھارت اور امریکہ پاکستان کے دوست یا دشمن کلاسیک دی مال، لاہور، ۲۰۰۶ء
جنید قیصر، پاکستانی اقلیتوں کا نوحہ، لاہور فکشن ہاؤس، ۲۰۰۷ء
خاور جمیل، ادب کلچر اور مسائل (مرتبہ)، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۶ء
خالد علوی، ڈاکٹر، اسلام اور اقلیتیں، دعوت اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی، یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء
روبینہ سہگل، عورت اور مزاحمت (محنت کش عورتوں سے مکالمہ)، مشعل، لاہور، ۱۹۹۹ء
رئیس احمد جعفری، مولانا، اسلام اور رواداری، ادارہ ثقافت اسلامی، لاہور، ۱۹۵۵ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور کلچر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء
سماج، ریاست اور مذہبی اقلیتیں، ادارہ تعلیم و تحقیق، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء
سید حسین جعفری، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ اور ادب، پاکستان اسٹڈی سنٹر، کراچی، ۱۹۸۷ء
سید عبد اللہ، ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء
سید شمیم حسین قادری، اسلامی ریاست قرآن و سنت کی روشنی میں، علماء اکیڈمی محکمہ اوقاف پنجاب، لاہور، ۱۹۸۴ء
شمائلہ خان، اقلیتوں کے تحفظ کے لیے ارلی وارننگ سسٹم، بی بی سی نیوز، اردو،
صفدر حسین، ڈاکٹر، آئین پاکستان ۱۹۷۳ء، جہانگیر سنز، لاہور، ۲۰۱۸ء
عبد السلام، ڈاکٹر، اردو ناول منزل بہ منزل، قمر کتاب گھر، کراچی، ۱۹۸۵ء
عبد الرافع رسول، مسلمانوں کے خلاف مغرب کی تہذیبی اور فکری جارحیت، محاذ کشمیر پبلی کیشنز، لاہور، س ن
عبادت بریلوی، ڈاکٹر، تنقیدی زاویے، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۵۱ء
عطاللہ قاضی، منظوم اردو مفہوم القرآن، (جلد اول) ادبی سبھا پسرور، سیالکوٹ، ۲۰۰۴ء
علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۴ء

فادر عمانوئیل یوسف، جائزہ انسانی حقوق، مذہبی اقلیتوں کی صورتحال پر سالانہ رپورٹ، قومی کمیشن برائے امن و انصاف، لاہور، ۲۰۰۶ء

فاخرہ تحریم، عورت کا المیہ، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۹ء

فاروق عثمان، ڈاکٹر، اردو ناول میں مسلم ثقافت، بیکن بکس، گلگشت ملتان، ۲۰۰۲ء۱۹۶۷ء

فقہا اور غیر مسلم اقلیتیں، ادارہ تعلیم و تحقیق، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء

مبارک علی، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ، عوامی پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۲ء

مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور معاشرہ، فکشن ہاوس، لاہور، ۱۹۹۹ء

محمد امین انصاری، ڈاکٹر، اردو ناولوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، نصرت پبلشرز، لکھنو، ۱۹۸۸ء

محمد ثانی، ڈاکٹر، رسول پاک صلی للہ علیہ اسلم اور رواداری، فضلی سنز، کراچی، ۱۹۹۸ء

محمد عارف، ڈاکٹر، اردو ناول اور آزادی کے تصورات، پاکستان رائٹرز کواپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۱۱ء

محمد متین خالد، آزادی اظہار کے نام پر (ترتیب و تحقیق)، علم و عرفان سنز، لاہور، ۲۰۱۳ء

محمد ریاض، اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، قومی اسمبلی پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

محمد بن الحسن الشیبانی، السیر الکبیر، املاو شرح، محمد بن احمد سرخسی، تحقیق صلاح الدین المنجد، عبد العزیز احمد، جامعہ الدول العربیہ، القائرہ، ۱۹۷۷ء

مذہبی تنوع کا احترام، ادارہ تعلیم و تحقیق، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء

مرتضیٰ انجم، عظیم انقلابی رہنما، یو پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۶ء

مریم جنسا، اسلام، مغرب اور پاکستان، دار لکتب السلفیہ، لاہور، ۲۰۱۷ء

مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، س ن

نیلسن منڈیلا، آزدی کا طویل سفر (ترجمہ) خالد محمود خان، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۰ء

لغات

اردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۶ء

اردو لغت (تاریخی اصولوں پر)، اردو ڈکشنری بورڈ، کراچی، ۱۹۸۳ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۷۸ء

شان الحق حقی، (مرتبہ) فرہنگ تلفظ، ادارہ فروغ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۷ء

فیروز الدین، مولوی الحاج، (مرتب) فیروز اللغات اردو جامع، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۲۰۱۰ء

کفایت اردو لغت، کفایت اکیڈمی اردو بازار، کراچی، ۱۹۸۹ء

محمد عبداللہ خان خویشگی، (مرتبہ) فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، طبع دوم، ۲۰۰۷ء

محمد امین بھٹی، الحاج، (مرتبہ) اظہر اللغات، اظہر پبلشرز، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۴ء

نور الحسن نیر، مولوی، نور اللغات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء

وارث سرہندی، علمی اردو لغت (جامع) نظر ثانی محمد حسن خان، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۲۰۰۳ء

English books

- Arlonde Rose and Carline B.Rose, Minority problems,Harper and Row publisher, New Yourk.
- Francesco Capotori, Study on the Rights of Persons Belonging to Ethnic, Religious and Linguistic Minorities, Newyourk , USA,1991
- William Kymlicka ,Multicultural Citizenship A liberal Theory of Minority Rights, Clarendon Press.oxford , 2003
- Encyclopedia Britannica,Encyclopedia Britannica Ltd, Great Britain1950
- Encyolopedia Americana, Americana Corporation, New Yourk 1961

- James,j.Morris,The World Book Encyclopedia, Field Enterprises Educational Corporation, Chicago,USA, 1958
- Badger GerogePercy,an English Arabic Lexicon, libraire,Libanan,Beurit,1967An English Arabic Lexicon, Librair
- JonanthCrownth ,Oxford Advance Learner Dictionary ,Oxford University Press, England
- Karen Armstrong, Muhammad a biography of the prophet, Harper Collins publishers, New York, 1992
- W .Montgomey watt, Islamic political thought, Edinburg university press, Britana,1999
- https://www.un.org/documents/ga/res/47/a47r135.htm/United Nations General Assembly, Resolution NoA/RES/47/135, Agenda item No 97b, Press release No.A/47/PV,18 December,1992
- Minority rights group International. World directory of minorities and indigenous peoples Pakistan Hindus June 2018.http//www reworld.org/docid/49749cd23hum [laccess ed 11.06.2019]

ضمیمہ

نام ادیب	ناول	تاریخ پیدائش	تاریخ وفات
شوکت صدیقی	خدا کی بستی (۱۹۵۷ء) جانگلوس (جلد اول)(۱۹۷۸ء) جانگلوس (جلد دوم)(۱۹۸۹ء) جانگلوس (جلد سوم)(۱۹۸۸ء) چار دیواری (۱۹۹۱)	۲۰مارچ ۱۹۲۳ء لکھنؤ	۱۸دسمبر ۲۰۰۶ء
مستنصر حسین تارڑ	پیار کا پہلا شہر (۱۹۷۴ء) فاختہ (۱۹۸۱ء) جپسی (۱۹۸۷ء) بہاؤ (۱۹۹۳ء) پرندے (۱۹۹۴ء) راکھ (۱۹۹۷ء) قربت مرگ میں محبت (۲۰۰۱ء) قلعہ جنگی (۲۰۰۲ء) ڈاکیا اور جولاہا (۲۰۰۲ء) خس و خاشاک زمانے (۲۰۱۰ء) اے غزال شب (۲۰۱۰ء) منطق الطیر جدید (۲۰۱۸ء)	یکم مارچ ۱۹۳۹ء لاہور	
محمد الیاس	کہر (۲۰۱۰ء) برف (۲۰۱۰ء)	۲۲دسمبر ۱۹۴۴ء جلالپور جٹاں	

	بارش (۲۰۱۲ء) پروا (۲۰۱۳ء) دھوپ (۲۰۱۴ء) حبس (۲۰۱۸ء)	ضلع گجرات	
علی اکبر ناطق	نو لکھی کوٹھی (۲۰۱۴ء) کماری والا (۲۰۲۰ء)	۱۵اگست۱۹۷۶ء اوکاڑا	
نیلم احمد بشیر	طاؤس فقط رنگ (۲۰۱۷ء)	۱۷جنوری۱۹۵۰ء ملتان	
ریاض صفدر زیدی قلمی نام: صفدر زیدی	چینی جو میٹھی نہ تھی (۲۰۱۶ء) بھاگ بھری (۲۰۱۸ء) بنت داہر (۲۰۲۲ء)	۲۵جون۱۹۶۸ء کراچی	
خالد فتح محمد	پری (۲۰۰۶ء) خلیج (۲۰۰۸ء) ٹبا (۲۰۱۱ء) سانپ سے زیادہ سراب (۲۰۱۴ء) شہر مدفون (۲۰۱۵ء) اے عشق بلاخیز (۲۰۱۷ء) کوہ گراں (۲۰۱۷ء)	۱۹اپریل۱۹۴۶ء ابراہیم وال ریاست کپورتھلہ	

		زینہ(۲۰۱۹ء)	